

## ہندوستان کے پس منظر میں انشورنس کا مسئلہ

[اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے چوتھے سمینار مورخہ ۹ تا ۱۲ اگست ۱۹۹۱ء  
منعقدہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد میں پیش کئے جانے والے علمی و تحقیقی  
مقالات، مباحثات اور مناقشات کا مجموعہ]

ترتیب

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی<sup>رحمۃ اللہ علیہ</sup>

**ایفا پبلی کیشنز - نئی دہلی**

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	ہندوستان کے پس منظر میں انشورنس کا مسئلہ
ترتیب	:	حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ
صفحات	:	۴۴۷
قیمت	:	
سن طباعت	:	فروری ۲۰۱۴ء

ناشر

**ایفا پبلیکیشنز**

۱۶۱-ایف، بیسمنٹ، جوگابائی، پوسٹ باکس نمبر: ۹۷۰۸

جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

ای میل: ifapublication@gmail.com

فون: 011 - 26981327

## مجلس اولیٰ

- ۱- مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی
- ۲- مولانا محمد برہان الدین سنہجلی
- ۳- مولانا بدر الحسن قاسمی
- ۴- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
- ۵- مولانا عتیق احمد بستوی
- ۶- مولانا محمد عبید اللہ سعدی



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ



## فہرست مضامین

پیش لفظ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
	پہلا باب: تمہیدی امور
افتتاحیہ	مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی
خطبہ استقبالیہ	مولانا محمد رضوان القاسمی
افتتاحی کلمات	مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی
عرض داعی	مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی
خطاب	شیخ عبدالرحمن بن عبداللہ بن عقیل
تجویز و تعزیریت	مولانا محمد رضوان القاسمی
خطبہٴ صدارت	جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی
پیغامات	

## دوسرا باب: مسئلہ انشورنس

### اکیڈمی کا فیصلہ

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

سوالنامہ

### تفصیلی مقالات:

انشورنس کا مسئلہ	مولانا ٹمٹس پیرزادہ
انشورنس	مفتی محمد ظفر الدین مفتاحی
کیا موجودہ حالات میں بیمہ کرانے کی اجازت ہے	مولانا حبیب الرحمن خیر آبادی
انشورنس کی حقیقت اور اس کا شرعی حکم	مولانا محمد بہان الدین سنہلی
انشورنس، اسلامی نقطہ نظر سے	مفتی عزیز الرحمن بجنوری

مفتی مسرور احمد	بیمہ شریعت کی نگاہ میں
مولانا معاذ الاسلام	انشورنس
مفتی منظور احمد مظاہری	انشورنس کے مسائل
مولانا شفیق احمد مظاہری	انشورنس
قاضی عبدالخلیل قاسمی	انشورنس
مولانا شبیر احمد قاسمی	انشورنس کا شرعی حکم
مولانا سید مصطفیٰ رفائی ندوی	موجودہ سنگین حالات میں انشورنس
مولانا اختر امام عادل	انشورنس، ایک تحقیقی جائزہ
مولانا محفوظ الرحمن مفتاحی	انشورنس
مفتی محمد نظام الدین رضوی	بیمہ پالیسی
مولانا محمد شعیب اللہ مفتاحی	انشورنس، اسلام کی نظر میں
مولانا محمد امین مبارک پوری	انشورنس، ملک کی موجودہ صورت حال میں
مولانا حمزید مظاہری ندوی	موجودہ حالات میں بیمہ کی شرعی حیثیت
مولانا رفیق المنان قاسمی	بینک انشورنس
مولانا ابوالکلام شفیق القاسمی	انشورنس کا مسئلہ

### سوالات کے جوابات:

مولانا محمد صدر الحسن ندوی	انشورنس کا حکم
مولانا تملیق احمد قاسمی	ہندوستان کے موجودہ حالات میں انشورنس کا مسئلہ
مولانا عبید اللہ سعدی	ہندوستان کے موجودہ مخصوص حالات میں بیمہ
مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	موجودہ حالات میں انشورنس کی شرعی حیثیت
مولانا زبیر احمد قاسمی	ہندوستان کے موجودہ پس منظر میں انشورنس کا مسئلہ
مفتی عزیز الرحمن فتحپوری	انشورنس کے شرعی احکام
مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری	موجودہ حالات میں انشورنس
مفتی جنید عالم قاسمی	مجبوری کی حالت میں انشورنس کی اجازت
مولانا انیس الرحمن قاسمی	جان و مال کی حفاظت کے پیش نظر انشورنس
مفتی نسیم احمد قاسمی	انشورنس کی شرعی حیثیت
مفتی احمد خانپوری	ہندوستانی حالات میں بیمہ کی حیثیت
مولانا مفتی اسماعیل بھوکوردوی	سرکاری وغیر سرکاری رائج بیمہ کا حکم



جناب امین الحسن رضویؒ	فرقہ وارانہ فسادات کے پیش نظر جان و مال کا بیمہ
مولانا محمد آدم پالنپوری	انشورنس کسی بھی حال میں جائز نہیں
مفتی جمیل احمد ندیری	موجودہ حالات کی وجہ سے بیمہ کرانا
مولانا سید صالح الدین بڑودوی	بیمہ کی شرعی حیثیت
مولانا ابوالحسن علی قاسمی	جان و مال کا بیمہ
مولانا محمد عزیز القاسمی	بیمہ کی شرعی حیثیت
ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی	حاجت شدیدہ کے پیش نظر انشورنس کی اجازت
مولانا تائر ربانی	انشورنس کا حکم
مفتی شمس الدین دہلویؒ	بیمہ پالیسی میں شرکت
مولانا مفتی اشفاق احمد الہ اعظمی	انشورنس کا حکم

## تحریری آراء:

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحبؒ

مولانا مفتی محمد یحییٰ قاسمی

مفتی حبیب اللہ قاسمی

مولانا مفتی محمد حنیف قاسمیؒ

حضرت مولانا مفتی عبدالجلیم صاحبؒ

مولانا مفتی عبدالوہاب ویلوری

مولانا مفتی خلیل الرحمن اعظمی العمری

مولانا مفتی زید ابوالحسن فاروقیؒ

مولانا مفتی عبدالرحمن قاسمی

مولانا مفتی عبید الرحمن اعظمی

مولانا مفتی محمد علی

مولانا مفتی رحمت اللہ قاسمی

مولانا مفتی محمد نسیمؒ

مولانا مبارک حسین ندوی

مولانا عبدالواحد مظاہری

مولانا محمد افضل حسینؒ  
مولانا محمد عطاء الرحمن  
مولانا محمد جعفر علی رحمانی  
مولانا محمد عبداللہ طارق  
مولانا محمد عبدالرحیم قاسمی  
مولانا محمد ایوب ندوی  
مولانا محمد علاء الدین ندویؒ

تیسرا باب: اختتامی امور

مناقشہ:

تجاویز:

فہرست شرکاء سمینار:



## پیش لفظ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انشورنس فی نفسہ قمار اور بعض صورتوں میں ربا کو بھی شامل ہے، لیکن ہندوستان جیسے ممالک، جہاں منصوبہ بند طور پر فرقہ پرست حضرات مسلمانوں کی جان و مال پر یلغار کرتے ہیں اور حکومت نہ صرف یہ کہ امن و امان قائم رکھنے اور شریکوں کو روکنے کے کام میں کوتاہی اور پہلو تہی سے کام لیتی ہے، بلکہ بعض اوقات خود پولیس کے جوان اس ظلم و بربریت میں شریک ہو جاتے ہیں، کیا ان حالات میں مسلمانوں کے لئے جان و مال کا انشورنس کرانا جائز ہے؟ اکیڈمی کے چوتھے سیمینار میں اس مسئلہ پر بحث کی گئی تھی۔

اس موضوع سے متعلق مقالات اور علماء کے مناقشات زیر نظر مجموعہ میں شامل ہیں، اور اس مسئلہ میں اکیڈمی کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان کے خصوصی حالات میں جان و مال کا انشورنس کرانا جائز ہے، اگر خدا نخواستہ فسادات میں جان و مال کا نقصان ہوا، تو اس کو حاصل ہونے والی پوری رقم حلال ہوگی اور اگر طبعی موت واقع ہوئی یا کسی اور حادثہ کی وجہ سے جانی و مالی نقصان پہنچا تو اس کی اپنی جمع کی ہوئی رقم حلال ہوگی اور باقی کو صدقہ کر دینا واجب ہوگا۔ یہ رائے نہ صرف اکیڈمی کی ہے، بلکہ اس سے پہلے ۱۹۶۶ء میں مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ نے بھی یہی تجویز پاس کی تھی، جس پر اس وقت کے اکابر علماء کے دستخط ہیں، ہندوستان کے اکابر ارباب افتاء حضرت مولانا نظام الدین صاحب اعظمی، سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب لاچپوری اور بہت سے اہل علم نے ہندوستان کے خصوصی حالات

کے پس منظر میں یہ اجازت دی ہے۔

اس مجموعہ کی پروف ریڈنگ اور ایڈیٹنگ عزیز مفتی احمد نادر القاسمی رفیق شعبہ علمی نے کی ہے، فخر اہ اللہ خیر الجزاء۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے مجلہ کے مرتب اول اور بانی اکیڈمی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ کے لئے ذخیرہ آخرت فرمائے اور فکر و نظر کے اس کارواں کو اپنی منزل کی طرف رواں دواں رکھے۔ وباللہ التوفیق وہوالمستعان۔

(خالد سیف اللہ رحمانی)

جزل سکرٹری

۸ محرم الحرام ۱۴۳۵ھ

۱۳ نومبر ۲۰۱۳ء

جدید فقہی تحقیقات

پہلا باب

تمہیدی امور



## افتتاحیہ

یہ دور تغیرات اور تبدیلیوں کا دور ہے، زندگی کا کوئی گوشہ نہیں جو اس رو سے خالی ہو، لیکن موجودہ حالات نے سب سے زیادہ جن مسائل کو جنم دیا ہے اور جس شعبہ میں نہایت تیز رفتار اور بنیادی تبدیلیاں آئی ہیں اور جن تبدیلیوں کا تعلق صرف چند جزوی مسائل اور صورتوں ہی سے نہیں، بلکہ جن سے ایک مکمل نیا نظام اور نیا طریق کار وجود میں آیا ہے، ”وہ شعبہ معاشیات“ ہے۔ اور ایسا ہونا فطری ہے، صنعتی انقلاب، مختلف ملکوں کا باہمی ربط، تجارت کا بین الاقوامی نظام، تجارت کے متعلق قدیم عرف و رواج میں تغیر وغیرہ ایسے اسباب ہیں کہ ان کا اثر انداز ہونا عین مطابق فطرت ہے۔

یہ تبدیلیاں ایک ضرورت ہیں اور ایسی تبدیلیاں پیش آتی رہیں گی، بجز اللہ شریعت اسلامی میں اس بات کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہر دور اور ہر معاشرہ کی ضرورت پوری کرے، معاملات کے سلسلہ میں شریعت اسلامی کا مزاج یہ ہے کہ اس نے کچھ حدود مقرر کر دی ہیں اور اصولی ہدایات دیدی ہیں۔ ان کی حیثیت دین کے ”حدود اربعہ“ کی ہے جن سے تجاوز کسی طور جائز نہیں، جزوی تفصیلات پر زیادہ خاموشی اختیار کی گئی ہے، تاکہ ہر زمانہ کے عرف و حالات کو سامنے رکھ کر شریعت کے اصول و کلیات کی روشنی میں پیش آمدہ مسائل حل کئے جائیں۔

مگر افسوس کہ فی زمانہ ”نظام معیشت“ کی باگ ڈور جن ہاتھوں میں ہے اور جن لوگوں

نے اس کی تشکیل اور عملی صورت گری کی ہے، وہ یہود ہیں، اور نہ صرف قرآن و حدیث، بلکہ خود بائبل کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سود اس قوم کی ضمیر اور ان کے مزاج میں داخل ہے اور حدود اللہ سے بے اعتنائی اور حرام کو حلال کرنے کے لئے حیلہ جوئی ان کی فطرت میں رہی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے جب ہجرت کے بعد مدینہ میں مسلمانوں، مشرکوں اور یہود کے درمیان مدینہ کی حفاظت اور بقاء باہم کے اصول پر کاربند رہنے کا معاہدہ طے فرمایا تو یہود کے اسی مزاج کی وجہ سے استثناء پر مجبور ہوئے کہ سبھوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہوگی، مگر سود خواری کی نہیں۔ ”الامن أربی“۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سود اور معیشت پر اپنی گرفت قائم رکھنے کی کوشش ابتدائی دور سے آج تک اس قوم کا قومی مزاج رہا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں جو معاشی نظام رائج ہوا، اس میں سود و قمار وغیرہ کی اس طرح آمیزش کی گئی کہ اس نے موجودہ نظام معیشت کے ایک لازمی عنصر کی حیثیت اختیار کر لی، ”الی اللہ الممشکتی“۔

موجودہ معاشی نظام نے جن اداروں (بینک، انشورنس کمپنی وغیرہ) کو وجود بخشا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے اعتبار سے شریعت اسلامی کے مزاج کے مغاثر نہیں ہیں، لیکن اصل بگاڑ طریق کار میں ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ طریق کار کی اصلاح کی جائے اور اسے مسلمان بنایا جائے، اس سلسلہ میں اکیڈمی ایک سال سے زیادہ عرصہ سے علماء اور ماہرین کی مدد سے ”اسلامی بینک کاری“ کے ایسے نظام کی تشکیل کے لئے کوشاں ہے جو صرف فکری اور نظریاتی مباحث پر مبنی نہ ہو، بلکہ اس مقصد کے لئے ایک واضح اور عملی صورت کی رہنمائی کرے، اس کام کو جس بات نے مشکل کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ شریعت اسلامی اور بینکنگ قوانین دونوں کی راہیں بالکل دو مختلف سمتوں میں جاتی ہیں، شریعت تجارت کو حلال اور سود کو حرام کہتی ہے، اور بینکنگ قانون کی نگاہ میں سود ضروری اور تجارت اور براہ راست سرمایہ کاری ممنوع ہے۔ ان حالات میں سرمایہ کاری کی دوسری قانونی صورتوں سے استفادہ کرتے ہوئے اسلامی خطوط پر



ایسے ادارے کس طرح قائم کئے جائیں؟ اس پر تیسرے فقہی سمینار (بنگلور) میں بحث کا آغاز ہوا تھا، چوتھے سمینار (حیدرآباد) میں اس مسئلہ پر خاصی پیش رفت ہوئی، مگر ابھی بھی یہ کام نا تمام ہے، اور پانچویں سمینار (اعظم گڑھ) میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث رہے گا۔ اسی لئے چوتھے فقہی سمینار میں اس موضوع پر جو رپورٹ تیار ہوئی، اور حل طلب مسائل پر علماء کی آراء آئیں، ان کو اس ”مجلد“ میں شریک اشاعت نہیں کیا جا رہا ہے، خدا کرے جلد ہم اس اہم اور دور رس اثر کے حامل موضوع پر کوئی فیصلہ کر پائیں، تو انشاء اللہ ایک ساتھ یہ تمام تحریریں طبع ہو جائیں گی۔

قارئین اس ”مجلد“ میں دو اہم مباحث پر علماء کی آراء سے استفادہ کر سکیں گے، ایک مسئلہ دو ملکوں کے درمیان کرنسیوں کے تبادلہ کا ہے، جس میں بہ ظاہر ایک طرف سے نقد اور دوسری طرف سے ادھار کی صورت محسوس ہوتی ہے، اس لئے اہل علم کے درمیان قانونی نقطہ نظر سے شرعاً اس کے جواز و عدم جواز میں اختلاف رائے پایا جاتا تھا، سمینار میں اس پر تفصیلی بحثیں ہوئیں اور دونوں نقاط نظر کے حاملین نے پوری فراخ دلی اور سیرچشمی کے ساتھ ایک دوسرے کی بات سنی، پھر ایک رائے پر متفق ہوئے، اس طرح مقالات اور آراء کے ذیل میں آپ جو کچھ پڑھیں گے، وہ علماء کی اپنی شخصی رائے ہے، اکیڈمی کی اجتماعی رائے وہی ہے جو ”تجاویز“ کے ذیل میں آئی ہیں۔

دوسرا مسئلہ ”انشورنس“ کا ہے، علماء ہندو پاک کا بالعموم اس امر پر اتفاق ہے کہ انشورنس کی موجودہ صورت شرعاً جائز نہیں اور اس میں ربوا اور قمار دونوں ہی پایا جاتا ہے، اکیڈمی کا عمومی نقطہ نظر بھی یہی تھا، لیکن بحث صرف اس پہلو پر تھی کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں جب کہ مسلمانوں کو اور خصوصیت سے ان کے املاک کو نشانہ بنایا جاتا ہے، اور خاص کر ان علاقوں میں منصوبہ بندی کے ساتھ فسادات کرائے جاتے ہیں جہاں تجارت اور کاروبار میں ان کو کسی قدر بہتر پوزیشن حاصل ہوگئی ہے، کیا انشورنس نے مسلمانوں کے لئے ”اجتماعی حاجت“ کی صورت اختیار کر لی ہے، اور اس خصوصی پس منظر میں ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے؟

ابھی یہ مسئلہ زیر بحث ہی تھا کہ بعض قانون دانوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ فسادات کی ہلاکتوں اور بربادیوں کو انشورنس کمپنی ان حادثات کے زمرہ میں نہیں رکھتی ہے جن میں کمپنی معاہدہ کے مطابق پوری رقم ادا کرنے کی ضامن ہوتی ہے، ظاہر ہے اس صورت حال نے اس اساس ہی کو ختم کر دیا، جس کو سامنے رکھ کر مسئلہ پر غور کیا جاتا تھا۔ لہذا اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی بنادی گئی، جو انشورنس کے قانون کے گہرے مطالعہ کے بعد اس کے حکم شرعی سے متعلق اپنی رائے اکیڈمی کو پیش کرے، اور پھر کسی سیمینار میں مزید غور و فکر کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے، اس لئے قارئین کو یہ بات ضرور ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ اس موضوع سے متعلق جو تحریریں اس مجلہ میں شامل ہیں، ان کی حیثیت محض شخصی آراء کی ہے، وہ اکیڈمی کے نقطہ نظر کی ترجمان نہیں ہیں، اس بارے میں ملک کے مستند اصحاب فتاویٰ سے دریافت کر کے ان کے فتاویٰ پر عمل کرنا چاہیے۔

یہ واقعہ ہمیں اس طرف بھی متوجہ کرتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے مذہبی تشخص اور قومی وجود کے لئے کس درجہ چوکسی کی ضرورت ہے، اور کس کس طرح براہ راست اور بالواسطہ ہمارے مفادات پر ضرب لگانے کی کوشش کی جاتی ہے؟ مسئلہ صرف مسجدوں اور عبادت گاہوں کے تحفظ اور مذہبی تشخص اور شناخت کی حفاظت ہی کا نہیں ہے کہ یہ توفرقہ پرست طاقتوں کا اولین ہدف ہیں ہی، مسئلہ امت کی تعلیم اور معیشت کا بھی ہے، تعلیم اور معیشت یہ دو ایسے میدان ہیں کہ ان میں اجتماعی پس ماندگی قوموں میں مایوسی پیدا کرتی ہے۔ جرأت اور خودداری کے اوصاف چھین لیتی ہے، احساس کمتری کو جنم دیتی ہے، اور فکر و حوصلہ کو بھی متاثر کرتی ہے، پھر بہ تدریج یہی احساس کمتری اور کم حوصلگی عقیدہ و ضمیر کے دروازوں پر دستک دینے لگتی ہیں، اور ان میں دین کے بارے میں تشکیک ذہنی پیدا ہوتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان حالات میں امت کے ان مسائل سے بھی اعتناء کریں اور ان سازشوں سے بھی چوکنار ہیں، جو مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہیں۔

اکیڈمی نے اس مختصر مدت میں ملک کے اکابر علماء، ارباب افتاء، نوجوان، تازہ دم اور حوصلہ مند فضلاء، نیز جدید ماہرین کا جو تعاون حاصل کیا ہے، نئے مسائل پر سوچ اور فکر کا جو رجحان

پیدا ہوا ہے اور نوجوان علماء میں فقہیات پر لکھنے کا ایک نیا ذوق پیدا ہوا ہے، وہ محض اللہ کے فضل، ہمارے بزرگوں کی دعاؤں اور دوستوں اور عزیزوں کے تعاون کا ثمرہ ہے، یہ ”مجلہ“ بھی انہیں مساعی کا ایک حصہ ہے، خدا کرے کہ ہماری یہ کوششیں عند اللہ مقبول ہوں اور اس کی رضاء و خوشنودی کا باعث بنیں۔ ”ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم“۔

مجاہد الاسلام قاسمی

(سکرٹری جنرل اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا)

۴ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ



## خطبہ استقبالیہ

مولانا محمد رضوان القاسمی ☆

الحمد لله رب العلمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى اله  
وأصحابه أجمعين .

آج کا دن ”دارالعلوم سبیل السلام“ اور ”شہر حیدرآباد“ کے لئے ایک تاریخی اور یادگار دن ہے، ایک ایسا دن جس کو اس شہر اور اس درسگاہ کی تاریخ میں فراموش نہ کیا جاسکے گا، جب اہل تحقیق علماء، خدا ترس صلحاء، عمیق النظر فقہاء اور اخلاص کے ساتھ مسائل امت کے حل کے لئے بے چین اور دردمند دانشور اور علوم جدیدہ کے ماہرین سر جوڑ کر فکر مندی کے ساتھ یہاں جمع ہوئے ہیں، دُور دراز علاقوں سے اپنے مشاغل اور مصروفیات کو چھوڑ کر ان کی آمد محض خدا کے دین کے لئے ہے کہ وقت کے پیش آمدہ مسائل میں امت محمد ﷺ کی صحیح رہنمائی کی جاسکے۔ اللہ تعالیٰ اس کاروانِ علم کو جزاء خیر عطا فرمائے اور ان کو صواب و سداد پر قائم رکھے۔

ایک نہایت خوش آئندہ علامت ہے جب کسی قوم کے اصحاب علم، فکر و نظر کے اختلاف، سیاسی اختلاف اور تنظیمی، جماعتی اور درسگاہی اختلاف سے اوپر اٹھ کر امت کے مسائل کے حل کے لئے جمع ہو جائیں، کشادہ قلبی کے ساتھ تبادلہ خیال کریں، اور سیرِ چشمی کے ساتھ اپنی آراء سے رجوع و اعتراف کرنے میں ہتک کا احساس نہ کریں، تو سمجھنا چاہیے کہ ابھی امت کا ضمیر زندہ اور اس کا دل بیدار ہے، کتنے بزرگوں نے اس خوشگوار وقت کی تمنا میں جان، جان

آفریں کے حوالہ کیں، اور کتنے ہی اصحابِ دل نے اس کے لئے خواب دیکھے اور سمجھا کہ یہ خواب پریشاں ہے، ایسا خواب جو شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا، مگر اللہ کا شکر ہے کہ یہ خواب آج حقیقت ہے اور تمنا واقعہ ہے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کا قیام اس دور کا ایک اہم کارنامہ ہے، آنے والی نسل علماء ہند کی اس سعی کو ضرور یاد رکھے گی اور ان کے درمیان مفاہمت کی ایک فضا پیدا ہوگی، باہمی فاصلے دور ہوں گے، اختلاف رائے برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی، اور فقہ کا موضوع اس ملک میں پروان چڑھتا اور ترقی کرتا رہے گا۔

مہمان گرامی!

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج آپ کا یہ تاریخی اجتماع ایک تاریخی شہر میں منعقد ہو رہا ہے محمد قلی قطب جو اپنے زمانے کا عابد و زاہد اور علم پرور حکمراں تھا، نے ۱۵۹۰ھ میں اس شہر کی بنیاد رکھی اور دکنی زبان میں خدا سے دُعا کی: ”میرا شہر لوگاں سے معمور کر!“۔ بادشاہ کی یہ دعا ایسی قبول ہوئی اور اس کی زندگی ہی میں شہر ایسا شاد و آباد ہوا کہ اس نے اپنے حُسن انتخاب پر خود داد دی اور کہا:

لطیف و دلکش آب و ہوائے

مبارک منز لے، فرخندہ جائے

پھر اس شہر نے ہمیشہ شاعروں، ادیبوں، عالموں اور صوفیوں سے خراجِ تحسین وصول کیا، امیر مینائی بے ساختہ کہا اٹھے:

اللہ اللہ رے بہار چمنستانِ دکن

خُور پر ہے یہ جو بن نہ پری پر یہ پھبن

شاہ نصیر نے جب دہلی سے حیدرآباد کے لئے رحمتِ سفر باندھا تو اپنے شاگرد عزیز ذوق سے کہا کہ وہ بہشت ہے، بہشت، میں جاتا ہوں، چلو تم بھی چلو۔

مولانا حالی اور داغ نے اس شہر پر اپنے جذباتِ عقیدت نثار کئے اور میرا حسن نے اس شہر کے لئے خدا سے دعا کی:

سر سبز یہ شہر حیدر آباد رہے

یارب، آباد و حیدر آباد رہے

یہ شہر صوفیوں کا شہر ہے، جہاں حضرت شاہ معین الدین چشتی معروف بہ شاہ خاموش نے اقامت اختیار کی، جس کو شیخ مخدوم علاء الدین انصاری کے قیام کا شرف حاصل ہوا اور کتنے ہی صوفیاء و مشائخ ہیں جو آج اس کی آغوش میں مچھوٹے ہیں۔

یہ علماء اور محققین کا شہر ہے، علم خیز بھی اور علم پرور بھی، تاریخ کے ہر دور میں اور بالخصوص ماضی قریب میں اصحاب تحقیق علماء کے قیام و ورود کا جو شرف اس شہر کو حاصل ہے اس کی مثال کم ملے گی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالقادر بدایونی، مولانا حافظ محمد احمد دیوبندی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالماجد ریابادی اور کیسے کیسے علماء ہیں جن کے فیضانِ علمی نے اس شہر کے علمی رونق میں اضافہ کیا اور خود اس خطہ سے محدثِ دکن حضرت عبداللہ شاہ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جیسے اصحابِ علم و فضل پیدا ہوئے۔

یہ ادیبوں اور شاعروں کا شہر ہے جہاں اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ”محمد قلی قطب شاہ“ پیدا ہوئے اور جو اردو زبان کی معلوم تاریخ کے پہلے معروف شاعر ”ولی دکنی“ کا مسکن ہے، جہاں قطب شاہی دور میں اردو پیدا ہوئی اور عہد آصفیہ میں شباب و جوانی کو پہنچی اور اس شان و بان سے پہنچی کہ اردو کی پہلی یونیورسٹی یہیں قائم ہوئی، جس نے امجد حیدر آبادی جیسے مصلح اور مذہبی، صفی جیسے قادر الکلام، مخدوم محی الدین جیسے باغی اور انقلابی اور شاذ تمکنت جیسے جدید لب و لہجہ کے ترجمان شعرا کو وجود بخشا۔

علم و ادب اور اردو زبان میں اس شہر کی خدمت کو کبھی فراموش نہ کیا جاسکے گا، یہیں ”دارالترجمہ“ قائم ہوا اور ۱۹۱۷ء سے ۱۹۵۰ء تک اس نے سائنس، فلسفہ، تاریخ وغیرہ کے

معیاری لٹریچر کو اردو میں منتقل کرنے کا جو کارنامہ انجام دیا وہ اپنی مثال آپ ہے، اسی ”دارالترجمہ“ نے اردو زبان میں وضع اصطلاحات کا کام کیا اور اس کے لئے پورے ملک سے منتخب علماء و ادباء: مولوی ظفر علی خان، مولوی عبدالحلیم شرر اور مولانا عبداللہ عمادی وغیرہ سے مدد لی گئی۔

یہیں ”دائرة المعارف العثمانیہ“ کی بنیاد پڑی جس نے علوم اسلامی کے سیکڑوں مخطوطات کو زندگی عطا کی اور ان کو طبع کرایا، کنز العمال، بیہقی، مشکلات الآثار، انساب، امام محمد کی ”کتاب الاصل“ اور فقہ وحدیث، تفسیر وکلام، طب وادب، سیرت ورجال اور لغت و قواعد، نیز فلسفہ وتاریخ کی کئی کتابیں ہیں جو اپنی طباعت و اشاعت اور تصحیح و تعلیق میں ”دائرة“ کی رہن منت ہیں، مگر افسوس کہ ”دارالترجمہ“ کے بعد اب ”دائرة“ حکومت کی بے پرواہی اور ملک کے ایک عظیم اور قیمتی ورثہ سے محرومی کا شکار ہے۔

اس شہر نے اپنی قیمتی، معیاری اور وسیع کتب خانوں کے ذریعہ بھی علم وادب کی خدمت کی ہے، مفتی محمد سعید خاں کا کتب خانہ ”سعیدیہ“ اپنے علمی جواہر پاروں کے لئے شہرت رکھتا ہے۔ کتب خانہ ”آصفیہ“ ملک کے چند معروف کتب خانوں میں ایک ہے۔ اردو کتابوں کے بھی متعدد اہم کتب خانے شہر میں موجود ہیں، علوم اسلامی کے مخطوطات کی حفاظت میں بھی غالباً پٹنہ اور کلکتہ کے بعد یہ شہر سب سے آگے ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ اس شہر کی رونق شاہی نوازشات اور سرکار کے زیر سایہ علمی وادبی خدمات سے تھی۔ ۱۹۴۸ء کے بعد گورنر و شادمانی کا یہ سامان باقی نہ رہا، لیکن غیرت ایمانی اور اسلام کے لئے درد مندی، نیز ادب پروری اور علم دوستی کا جو سبق یہاں کے اسلاف نے اپنے اخلاف کو دیا تھا اس کی چنگاریاں اب بھی موجود تھیں، اس کا اثر یہ ہوا کہ یہاں از سر نو ادبی انجمنیں اور ادارے قائم ہوئے، تنظیمیں اور جمعیتیں قائم ہوئیں، اور جو پہلے سے قائم تھیں ان میں سرگرمی اور حرارت پیدا ہوئی، اور دینی مدارس و مکاتب قائم کئے گئے جن کی ضرورت بہ مقابلہ دوسرے علاقوں کے یہاں زیادہ تھی۔

”دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد“ جس کو اس وقت آپ نے اپنی تشریف آوری کا شرف بخشا ہے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس کا ۱۳۹۳ھ میں قیام عمل میں آیا اور قیام کے سولہویں سال ۱۴۰۸ھ میں دورہ حدیث شریف کا افتتاح ہوا، فقہ کے میدان میں مردان کار کی تیاری شروع سے جامعہ ہذا کے ذمہ داران و اساتذہ کا مطمح نظر ہے، اسی مقصد کے لئے ۱۴۰۹ھ میں ”تخصّص فی الفقہ“ کے دو سالہ نصاب کا افتتاح عمل میں آیا، فرق باطلہ اور قدیم و جدید مذاہب و نظام کے مطالعہ اور مخالف اسلام تحریکات سے آگہی، نیز اسلام کے اصول دعوت سے واقفیت کے لئے ۱۴۱۰ھ میں ”تخصّص فی الدعوة“ کا شعبہ قائم ہوا، سال حال ائمہ مساجد کی تربیت و تدریس کے لئے ”تدریس الائمہ“ کا ایک سالہ نصاب شروع کیا گیا ہے۔

محمد اللہ یہاں متعدد ایسے اساتذہ و مدرسین موجود ہیں کہ فقہ ان کا خاص موضوع ہے اور وہ اپنی فتنی خدمات و تالیفات اور متوازن، نیز مطالعہ و تحقیق پر مبنی آراء کی وجہ سے ملک، بلکہ بیرون بھی پہچانے اور وقعت کی نظر سے دیکھے گئے۔

شہر حیدرآباد پر گوزبان و ادب اور دوسرے علوم اسلامی کی چھاپ غالب رہی ہے، لیکن فقہاء ہند میں شیخ شجاع الدین حیدرآباد صاحب شرح مناسک، مجموع الفتاویٰ، کشف الخلفاء اور جواہر النظام، نیز مولانا ابوالوفاء افغانی کے نام ممتاز و نمایاں ہیں، اسی شہر کی معروف اور تاریخی درسگاہ ”جامعہ نظامیہ“ کا دارالافتاء ملک کے قدیم فقہ و فتاویٰ کے مراکز میں ہے، اس لئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ”دارالعلوم سبیل السلام“ اور شہر حیدرآباد میں آپ کی تشریف آوری خود اپنے گھر اور اپنی بستی میں آپ کی آمد ہے، اور یقین ہے کہ یہاں کے انتظام و انصرام کی خامیوں اور آپ کے حق ضیافت اور حق اکرام میں کوتاہیوں کو آپ اسی نگاہ سے دیکھیں گے۔

جدید پیش آمدہ احکام و مسائل پر غور کرتے ہوئے ضروری ہے کہ ہم راہ اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہ دیں، نہ ایسا جمود ہو کہ کتاب و سنت کی نصوص اور فقہاء و مجتہدین کی نصوص کو ایک ہی درجہ دے دیا جائے، نہ ایسا تجدد ہو کہ ہر نئی بات کو قبول کر لیا جائے، علامہ سید سلیمان ندوی نے



ایک موقعہ پر لکھا تھا کہ ”میرے نزدیک اقوام کی زندگی میں ”قدیم“ ایک ایسا ہی عنصر ہے، جیسا کہ جدید، بلکہ میرا ذاتی میلان قدیم کی طرف ہے۔“ (اقبال نامہ / ۱۶۸) ہمیں ان دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا ہوگا، ہمیں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی ہوگی کہ ہم ایک ایسے ملک میں ہیں جو سیکولر ہے، جس کا بنیادی ڈھانچہ مذہب پر مبنی نہیں ہے اور جو ایک محدود زندگی ہی میں مذہب پر چلنے کی اجازت دیتا ہے۔ معاملات، کاروبار اور تمام مسائل زندگی میں ہم اس ملک کے غیر مسلموں سے مربوط ہیں۔

اس وقت جو مسائل زیر بحث ہیں، علماء و ماہرین کے تبادلہ خیال کے بعد اس کے نتائج و ثمرات کے لئے مسلمانان ہند سراپا انتظار ہیں اور ان کی چشم انتظار بے چین ہے، امید ہے کہ یہ مؤقر و موقع اجتماع ضرور ان مسائل میں اُمت کی صحیح رہنمائی اور رہبری کا فریضہ انجام دے گا۔ اس مسعود موقعہ پر میں اپنے تمام فقہاء کی جانب سے فقہ اکیڈمی کے ذمہ داران، بالخصوص اس کے مؤسس اور جنرل سکریٹری بالغ نظر فقیہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس سیمینار کے لئے ہمیں میزبانی کا شرف بخشا، میں اپنے رفیق گرامی صدر مجلس انتظامی دارالعلوم سبیل السلام و صدر مجلس استقبالیہ الحاج سید ضیاء الرحمن صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے انتظامی امور اور بالخصوص تعمیری کاموں کی انجام دہی میں اپنے ضعف اور پیرانہ سالی کے باوجود انتھک کوشش کی اور اپنے رفیق عزیز مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صدر مدرس دارالعلوم و جوائنٹ کنونیر مجلس استقبالیہ کا بھی کہ انہوں نے سیمینار کی علمی اور معنوی کامیابی کے لئے پوری پوری کاوش کی ہے، مجلس استقبالیہ کے ذمہ داران: جناب سید جمیل الدین صاحب، جناب محمد جعفر صاحب اور نائب صدور اور تمام ارکان، نیز دارالعلوم سبیل السلام کے تمام اساتذہ، عملہ، کارکنان اور طلبہ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان تمام حضرات نے بڑی تندہی اور جذبہ اخلاص کے ساتھ سعی فرمائی ہے، اسی طرح روز نامہ سیاست، رہنمائے دکن، منصف اور دیگر رسائل و اخبارات، بلدیہ حیدرآباد و جملہ معاونین کا شکر گزار ہوں کہ ان سب کے

تعاون سے سیمینار کے انعقاد میں بڑی مدد ملی ہے، اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو بہترین اجر عطا فرمائیں۔ آمین۔

مجھے احساس ہے اور یہ محض رسمی نہیں، بلکہ واقعی ہے کہ عمارت کی کما حقہ عدم تکمیل، موسم کی ناخوشگواری اور دوسرے اسباب کے تحت آپ مہمانانِ کرام کے لئے جیسا کہ سامانِ راحت کیا جانا چاہیے تھا، نہ کیا جاسکا، مجھے اُمید ہے کہ آپ حضرات اسی احساس کے ساتھ اس کو گوارا کریں گے کہ آپ اپنے ہی گھر آئے ہیں۔ اخیر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ علم و فقہ کی اس انجمن کو شاد کام و بامرام رکھے اور اس کا سفر ارتقاء جاری رہے۔

”ایں دعاء از من و از جملہ جہاں آمین باد“



## افتتاحی کلمات

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی ☆

میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے ہم سب کو ایک بڑے مقصد کے لئے چوتھی بار جمع ہونے کی توفیق عطا فرمائی، بلاشبہ یہ خشک موضوعات، نامانوس اصطلاحات اور دور دراز کا سفر، نیز چار دنوں تک ہمہ وقت مشغولیت، یہ سب آپ کی زحمت کا سبب بنتی ہیں، مگر میں ایک عجیب بات دیکھتا ہوں کہ ایسی ساری باتیں جو ہمت شکن ہو کرتی ہیں، یہاں دور دور تک نظر نہیں آتیں، جب میں نے اس کام کا آغاز کیا تھا، تو بہت سے لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ محض وقتی تماشہ ہے، آگے چلنے والی چیز نہیں ہے، کون اس میں شریک ہوگا؟، کون مدرسہ چھوڑے گا؟، کون اپنی خانقاہ چھوڑے گا؟، کون اپنے مشاغل چھوڑے گا؟، اور کون محنت کرے گا؟، لیکن میں اس کو اللہ کی خاص نصرت اور غیبی مدد سمجھتا ہوں، یا پھر اسے ان لوگوں کے مطالعہ کی کمی سمجھتا ہوں، جنہوں نے ہمارے علماء اور ارباب دانش کے اندر کے جوہر کو نہیں پہچانا، ہمارا مزاج ہے اول بدگمان ہونے کا، حالانکہ اصول یہ ہے کہ ہر شخص کے بارے میں اچھا گمان رکھا جائے اور ہر کام کے بارے میں اچھی امید کی جائے، الا یہ کہ حالات اس کے برعکس ثبوت مہیا کر دیں، لیکن ہمارا مزاج یہ ہے کہ ہم اول ہی میں بدگمان ہو جاتے ہیں، کہیں اتفاق سے وہ کام صحیح ہو جائے تو ہم خوش ہو جاتے ہیں۔

تجربہ یہ ہے کہ ہمارے نئے فضلاء، قدیم علماء اور بزرگ، ہماری یونیورسٹیوں کے دیگر

علوم و فنون کے ماہرین و متخصصین ہوں، یا ارباب علم و دانش ہوں، مجھے احساس ہوتا ہے کہ کام کا جذبہ ان سبھوں میں موجود ہے، صرف ان کو آواز دینے اور جمع کرنے کی ضرورت ہے۔ دیکھئے کتنی زبردست محنت ہمارے لوگوں نے کی ہے، پہلا، دوسرا، تیسرا اور چوتھا سمینار!!! بہت دور دراز دیہاتوں میں رہنے والے ہمارے علماء جن کے پاس کتابوں کا بھی فقدان ہے اور علمی صحبت کا بھی، انہوں نے بھی اپنے طور پر اپنی بساط سے کہیں زیادہ محنت کر کے علم و تحقیق کا فریضہ انجام دیا ہے، وہ لوگ جو بہت بدگمان تھے، ہماری یونیورسٹیز کے فضلاء کے بارے میں، ہمارے دانشوروں اور متخصصین کے بارے میں، ایک طبقہ ایسا تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ دین ہمارے پاس ہے، لیکن ہم نے یہ محسوس کیا کہ بینکنگ پر جو کام ہوا ہے اور بڑے بڑے ماہرین کا ہمیں جو تعاون ملا ہے، میں سچ کہتا ہوں کہ میں دل کی گہرائیوں سے ان لوگوں کے لئے دعا کرتا ہوں، ہمارے پاس ان کے لئے کچھ نہیں ہے سوائے اس کے کہ میں اللہ سے کہوں کہ اے اللہ تو ان کے اس کام کو قبول فرما۔

میں اس موقع پر اپنی خوشی کا اظہار کیسے نہ کروں، پچھلے چند برسوں کی مسلسل محنت کے بعد کامیابی کا جو پودا آہستہ آہستہ اوپر ابھرتا ہوا نظر آتا ہے، وہ ان حضرات کی جانفشانی کا ثمرہ ہے جو اس کارواں کے شریک رہے ہیں، ان کے لئے بے حد خوشی کا موقع ہے کہ جب پودا لگا یا گیا تھا تو لوگ کہتے تھے کہ مرجھا جائے گا، لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ پودا مرجھا نہیں رہا ہے، یہ حقیقت بھی ذہن میں رہے کہ ایسا نہیں ہوتا کہ صبح کو پودا لگا یا گیا اور شام کو پھل آ گیا، جو لوگ ایسا سوچتے ہیں وہ خود اپنے مستقبل کو ختم کرتے ہیں، پودا لگتا ہے، اندر اپنی جڑیں مضبوط کرتا ہے، اور پھر وہ تناور درخت بنتا ہے، پھول دیتا ہے، کلیاں نکلتی ہیں، اس کے بعد اس میں پھل آتے ہیں، ایک وقت گزرتا ہے۔ میرے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ یہاں ناریل کا ایک ایسا درخت ہے جو اٹھارہ مہینے میں پھل لاتا ہے، میں بہت خوش ہوا کہ کہاں دس برس اور کہاں اٹھارہ مہینے، مگر یہ معلوم ہوا کہ جو بعد میں پھل لاتا ہے وہ سو سو سال زندہ رہتا ہے، مگر جو اٹھارہ مہینے میں پھل دیتا ہے وہ

اٹھارہ سے بیس سال تک زندہ رہتا ہے، یعنی تیاری میں جتنا وقت لگتا ہے اتنا ہی وقت اس کی زندگی کے طول کو بتاتا ہے۔

ٹھوس کاموں کی بنیاد اور گہری ہوتی ہے ان کا نتیجہ دیر میں سامنے آتا ہے: ”كَشَّجَوْرَةَ طَبِيبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرَعُهَا فِي السَّمَاءِ“ (سورہ ابراہیم ۲۴)، ان شاخوں کا آسمانوں کو چھو دینا اس وقت ہوگا جب کہ جڑیں پوری طرح زمین میں راسخ ہوں، اگر جڑوں کو زمین میں رسوخ نہیں ہے تو سایوں کا پھیلاؤ بھی اور شاخوں کی بلندی بھی کچھ نہیں ہو سکے گی، بہر حال میں اس خوشی کے موقع پر آپ سب کا ممنون ہوں۔

عجیب اتفاق ہے کہ اس وقت ہمارے بہت ہی عزیز دوست شیخ عبدالرحمن بن عبداللہ بن عقیل ریاض سے اور قابل احترام اور دنیا کے چند مشہور فضلاء میں سے ڈاکٹر انس زرقاء جو اسلامی معاشیات کے ماہر استاذ ہیں، تشریف فرما ہیں۔ شیخ علی جمعہ بھی تشریف لے آئے ہیں، بنگلہ دیش سے مفتی عبدالرحمن صاحب بھی تشریف لائے ہوئے ہیں، ہم سب کی نہایت ہی سعادت ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب جن کا علم اور جن کا فضل پورے عالم میں معروف ہے، اور علم و تفقہ کی دنیا میں اور خاص کر جدید حالات میں شریعت کی تطبیق کے میدان میں اور پاکستان کے لئے ان کی ذات تو مغتنم ہے ہی، ساتھ ہی ساتھ پوری دنیا میں جو مسائل ہیں، ان کے حل اور شرعی احکام کی تطبیق کے میدان میں بھی غنیمت ہیں۔ مولانا کا یہ مزاج نہیں ہے کہ وہ صرف اتنا کہہ کر نکل جائیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، بلکہ مولانا کا مزاج یہ ہے کہ اگر معاشرہ مشکل میں مبتلا ہے تو جو حرام ہے اسے حرام کہیں گے اور جو حلال ہے اسے حلال کہیں گے، ساتھ ہی معاشرہ کی مشکلات کو دور کرنے کے لئے جو متبادل حل ہو سکتا ہے اسے بھی شریعت کی روشنی میں پیش کریں گے، اس لئے کہ شریعت بانجھ نہیں ہے۔ اس میں وقت کے حالات و مسائل کو حل کرنے اور اس کی مشکلات کو دور کرنے کی صلاحیت ہے۔

الحمد للہ کہ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تشریف فرما ہیں اور افتتاحی اجلاس کی

صدارت فرما رہے ہیں، پاکستان میں شریعہ اپیلٹ کورٹ کے چیف جسٹس بھی ہیں، ہمارے لئے مولانا بہت بڑے ہیں، لفظ جسٹس سے ہم اتنا مرعوب نہیں ہیں جتنا مولانا کی اس حیثیت سے ہیں کہ وہ ہمارے مولانا ہیں، اس میں جو عظمت ہے وہ لفظ جسٹس میں نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ جو ہندوستان کے عظیم الشان فقیہ تھے، ان کی وراثت بھی ان کو عطا فرمائی ہے، ملک کے مختلف حصوں سے علماء کرام تشریف فرما ہیں، ہمارے ایک عزیز دوست ساؤتھ افریقہ سے بھی ہماری دعوت پر آئے ہوئے ہیں جو عالم بھی ہیں اور وہاں کے اسلامی بینک سے وابستہ بھی، بینکنگ کا اچھا تجربہ رکھتے ہیں، ہمارے بہت سے وہ احباب بھی آئے ہیں جو ہماری بینکنگ کمیٹی کے ذمہ دار ارکان ہیں۔ اتنا منتخب اور نمائندہ اجتماع بہت کم ہوا کرتا ہے، یہ ہماری سعادت ہے۔ اہل حیدرآباد کا اخلاص ہے، یہاں کے منتظمین کی محبت ہے، اللہ تعالیٰ نے سب کو سمیٹ دیا ہے۔



## عرض داعی

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله  
الطاهرين وأصحابه أجمعين ... اما بعد

غالباً ۱۹۸۰ء کی بات ہے، اسی شہر حیدرآباد میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس منعقد ہوا، اس اجلاس کی وجہ سے اصحاب علم و تحقیق کی ایک خاصی تعداد یہاں موجود تھی، میں نے ان میں سے چند علماء کو جمع کیا اور اس بات پر گفتگو ہوئی کہ ہندوستان میں نئے مسائل پر غور و فکر کے لئے علماء اور جدید علوم کے ماہرین کا ایک پلیٹ فارم ہونا چاہیے جو ہر طرح کی جماعتی اور گروہی تنگ نظریوں سے بالاتر ہو کر محض ملت کے مفاد کے لئے کام کرے اور نئے مسائل کا حل امت کے سامنے پیش کرے، چنانچہ اسی مقصد کے لئے ”مرکز البحث العلمي“ کا قیام عمل میں آیا۔

اللہ کا شکر ہے کہ جو سفر ہم نے سرزمین حیدرآباد سے شروع کیا تھا اب ایک بار پھر اسی علم پرور اور ادب خیز زمین پر خیمہ زن ہوئے ہیں۔ وہ شہر جو عرصہ تک اس ملک ہی نہیں پورے عالم اسلام میں علوم اسلامیہ کے احیاء اور نشاۃ ثانیہ کا نشان سمجھا جاتا تھا اور اہل نظر جس کو ”بغداد ہند“ سے تعبیر کرتے تھے، جس ریاست میں فتاویٰ عادل شاہی، فتاویٰ ابراہیم شاہی اور فتاویٰ عالمگیری جیسی فقہ کی جامع کتابیں مرتب ہوئیں اور جس کے ذریعہ فقہ اسلامی کی دسیوں نادر تالیفات جو مخطوطات کے دینوں میں تھیں، طباعت و اشاعت کے سفینوں میں منتقل ہوئیں، اور اہل تحقیق کی چشم اضطراب کا سرمہ بنیں۔

اسی مقصد کی تکمیل کے لئے سہ ماہی ”بحث و نظر“ کا اجراء عمل میں آیا، اس نے فقہی موضوعات پر علمی و تحقیقی تحریریں لکھنے کا ایک خاص ذوق پیدا کیا اور نوجوان فضلاء و علماء نے اس موضوع پر توجہ کی، لیکن اس کام کے لئے جس طرح کے حوصلہ مند تعمیری کام کرنے والے مثبت فکر رکھنے والے رفقاء کی ضرورت تھی، اس ضرورت کی تکمیل ”انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل اسٹڈیز“ اور اس کے سلیم الفکر اور بالغ نظر مؤسس اور ذمہ دار جناب ڈاکٹر منظور عالم صاحب نے کی، ڈاکٹر صاحب سے میری پہلی ملاقات مسجد نبویٰ مدینہ منورہ میں ہوئی تھی، وہیں ہم نے طے کیا کہ ہمیں ہندوستان میں خالص امت اور ملت کو پیش نظر رکھ کر جماعتی اور گروہی حد بندیوں سے اوپر اٹھ کر کام کرنا چاہئے، اور ایسے مسائل کے بجائے جو عارضی اور جذباتی نوعیت کے ہوں اور وقتی اثر رکھتے ہوں، ایسے مسائل کی طرف اپنی توجہ مرکوز رکھنی چاہیے، جن کا نتیجہ گودیر سے سامنے آتا ہو، لیکن وہ پائیدار اور دور رس اثرات کے حامل ہوں۔

اسی سلسلہ میں ہندوستان آنے کے بعد میں نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے ”فقہ اکیڈمی“ کا خاکہ رکھا، اور ان سے تعاون کی خواہش کی، موصوف کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ انھوں نے اس اہم کام میں بھرپور تعاون کی پیش کش کی اور عملی تعاون کیا، اس طرح ”مرکز البحث العلمی“ کی صورت میں جو خواب دیکھا گیا تھا، ڈاکٹر صاحب کے ذریعہ وہ شرمندہ تعبیر ہو سکا۔

فجزاه اللہ خیر الجزاء۔

مجھے مسرت ہے کہ اس اکیڈمی کو اوّل دن سے ہمارے بزرگوں اور اکابر کی توجہ حاصل ہے، اس سلسلہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی کے اسماء گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جو اکیڈمی کے سمیناروں میں شرکت بھی فرماتے رہے اور اس کے کاموں کی حوصلہ افزائی بھی۔

واقعہ ہے کہ اس موقع سے مجھے حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی (سابق جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) کی یاد بے حد تڑپاتی ہے جو نہ صرف علمی اور



تحقیقی کاموں کا ذوق رکھتے تھے، بلکہ اس ذوق کے پروان چڑھانے اور علمی کاموں کی حوصلہ افزائی کرنے کا خاص مزاج رکھتے تھے، مسائل پر آزادانہ بحث اور تبادلہ خیال کرتے، اختلاف رائے کو برداشت کرتے، چھوٹوں کی رائے کو بھی صبر و ضبط کے ساتھ سنتے، حقیقت یہ ہے کہ فقہ و قانون کے اس شناور، تحفظ شریعت کے قافلہ سالار اور دلِ درد مند اور فکر ارجمند کے حسین امتزاج کو ہندوستان کی شریعت اسلامی کی حفاظت اور مسلمانوں کے ملی بقاء کی تاریخ میں کبھی بھلایا نہ جاسکے گا۔

چنانچہ ”انسٹی ٹیوٹ“ کے تعاون سے پہلا سمینار یکم تا ۳۱ اپریل ۱۹۸۹ء کو ہمدرد دگر دہلی میں منعقد ہوا، جس میں ملک کے شمال سے جنوب اور مغرب سے مشرق تک قریب قریب ہر علاقہ کے نمائندہ و مفتیان موجود تھے۔ جو مختلف درس گاہوں، مکاتبِ فقہ اور دبستانِ خیال سے تعلق رکھتے تھے اور محض امت کے مسائل کے حل کی درد مندانہ فکر نے ان کو ایک جگہ جمع کیا تھا، ان کے شانہ بشانہ علوم جدیدہ کے وہ ماہرین تھے، جو گہرے اخلاص اور شریعت کی عظمت و حرمت کے احساس کے ساتھ یہاں آئے تھے، پھر جب بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہوا تو اعتراف و رجوع، اختلاف رائے پر تحمل اور مختلف نقاط نظر پر مثبت غور و فکر کا ایسا خوش گوار منظر سامنے آیا کہ سلف صالحین کی یاد تازہ ہوگئی، میرے خیال میں یہ مسلمانان ہند کے لئے ایک یادگار اور تاریخی دن تھا۔ اس نے مسائل پر تبادلہ خیال اور اجتماعی غور و فکر کا ایک نیا ماحول پیدا کیا اور کارکنان کو ہمت و حوصلہ عطا کیا، چنانچہ دسمبر ۱۹۸۹ء میں دوسرا فقہی سمینار بھی انسٹی ٹیوٹ ہی کے تعاون سے دہلی میں منعقد ہوا اور نقشِ ثانی ”نقشِ اول“ سے بہتر ثابت ہوا۔ تیسرے سمینار کی میزبانی دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور نے کی، حضرت مولانا ابوالسعود صاحب سرپرست اکیڈمی کی دعاء و توجہ، مولانا مفتی اشرف علی صاحب کی سعی پیہم اور بنگلور کے اہل ذوق اور نوجوانوں کے جذباتِ محبت اور علم دوستی و علم پروری نے اس سمینار کو بھی غیر معمولی کامیابی سے ہم کنار کیا۔ اب چوتھا سمینار ہندوستان میں تہذیب و ثقافت کے دارالخلافہ اور علم و تحقیق کے مرکز

حیدرآباد میں منعقد ہو رہا ہے اور ریاست کی ایک ممتاز درس گاہ ”دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد“ میں منعقد ہو رہا ہے، جہاں سے فقہ پر بہتر اور مفید کام ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو نتیجہ خیز فرمائے۔ اس وقت سمینار جن موضوعات پر غور و خوض کے لئے منعقد کیا جا رہا ہے وہ سارے ہی موضوعات نہایت اہم ہیں، ان میں سب سے اہم مسئلہ ”اسلامی خطوط پر بینک کاری“ کے نظام کا ہے، بینک کے بنیادی مقاصد، سرمایہ جمع کرنے والوں کے لئے اعتماد اور بھرپور سہ قائم کرنا، رقم کی حفاظت کرنا اور بروقت ان کے لئے ان کی رقم کی واپسی کو ممکن بنانا، منجملہ پیسوں کو گردش میں لانا اور غرباء اور اہل حاجت کی مدد کے لئے قرض کی فراہمی ہے، غور کیا جائے تو یہ تمام ہی مقاصد وہ ہیں جو اسلام میں مطلوب اور پسندیدہ ہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ جدید بینکنگ کی بنیاد سود اور زر کے ذریعہ کسب زر پر ہے، جو زر کے فطری اور خلقی مقاصد کے خلاف ہے۔ زر ذریعہ تبادلہ ہے، زر قابل ادخار ہے، لیکن وہ اپنی فطرت کے لحاظ سے کسب زر کا ذریعہ نہیں ہے۔ زر کو کسب زر کا ذریعہ بنانا معاشرہ کے لئے زبردست فتنہ ہے، اس عمل کی وجہ سے معاملات و کاروبار میں واسطے پیدا ہوئے ہیں اور ان واسطوں کی وجہ سے مصنوعات کی لاگت بڑھ جاتی ہے، اسی لئے اسلام تجارت کو جائز رکھتا ہے اور سود کو حرام۔ ”أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا“ (سورہ بقرہ: ۲۷۵)، بینک کا طریق کار اس کے عین برعکس ہے، وہ تجارت اور براہ راست سرمایہ کاری کو ممنوع قرار دیتا ہے اور سود کو اپنے نظام کا ایک لازمی عنصر بنا لیتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندوستانی بینکنگ قانون کے مطابق کسی بینک کا قیام اور اس کا اسلامی بینک کا نام دینا بلا وضو نماز پڑھنے کے مترادف ہے، موجودہ بینکنگ نظام افراط زر اور معیشت میں انحطاط کے بنیادی اسباب میں سے ہے، صورت یہ ہے کہ نوٹ چھپتے جاتے ہیں اور ان کے پیچھے زحیفی کا کوئی وجود نہیں ہوتا، نوٹ کا پھیلاؤ جس قدر بڑھتا جاتا ہے اس کے ساتھ زر کی قیمت گرتی جاتی ہے، اسلام کے اصول معیشت پر عمل کیا جائے تو انسانیت اپنے اس خود

ساختہ بوجھ سے خود کو آزاد کر سکتی ہے۔ ”يُضَعُّ عَنْهُمْ اَصْرَهُمْ وَالْاَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ“ (سورہ اعراف، ۱۵۷)۔ اسلام کی رحمتِ عامہ اور پیغمبر اسلام کی شانِ رحمتہ للعالمین کا تقاضا ہے کہ اسلام کے نتیجہ خیز اور ثمر آور اصولِ معیشت کا ہم قوم و ملک کے سامنے تعارف کرائیں، صحیح طور پر اسلامی نظامِ معیشت سے لوگوں کو روشناس کریں، احکامِ شریعت کا انطباق کریں اور کچھ نہ کچھ عملی نمونہ پیش کریں کہ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام ایک ابدی مذہب ہے اور قیامت تک ہر دور اور عہد میں انسانی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ہمارا فرض ہے کہ قانونِ ملکی کی روشنی میں ایسی صورت پیدا کی جائے کہ براہِ راست سرمایہ کاری ہو سکے، نیز ایک ایسا خاکہ تیار کیا جائے اور بروئے عمل لایا جائے جو ممکن حد تک ان مقاصد کو پورا کرتا ہو جو شرعی نقطہ نظر سے سود سے پاک ہو، اس سلسلہ میں بنیادی طور پر علماء اور ماہرینِ معاشیات کے درمیان جس نقطہ نظر پر اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ ایک ایسے مالیاتی ادارہ کا خاکہ بنایا جائے جو بینک کے پسندیدہ مقاصد کو پورا کرے، وہ محض خیراتی اور رفاہی ادارہ نہ ہو، بلکہ منافع پیدا کرنے والا ادارہ ہو، اور اس کی حسابی جواب دہی اتنی پختہ ہو کہ اس پر اعتماد کیا جاسکے، یعنی بنیادی طور پر (VIABILITY) (واپلیٹی) اور (ACCOUNT VIABILITY) (اکاؤنٹ واپلیٹی) کو محفوظ رکھا جائے، اور ڈپوزٹ (جمع) اور (DEPLOYMENT) (سرمایہ کاری) سود سے پاک ہو۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کے کمپنی لاز اور کوآپریٹو کریڈٹ سوسائٹیز کے قانون کا بھی جائزہ لیا گیا۔ انشاء اللہ ان تمام نکات پر بحث بینکنگ کے موضوع پر گفتگو کے دوران سمینار میں آئے گی، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مفید اور صحیح نتائج تک پہنچائے۔

سمینار کا دوسرا موضوع ”ہندوستان کے موجودہ حالات میں انشورنس“ کا ہے، عام طور پر مشاہیر علماء کے نزدیک انشورنس میں ”ربوا“ اور ”قمار“ موجود ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں آزادی کے بعد سے مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں اور فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعہ ان کی نسل کشی، معیشت کی بربادی و تباہی کا سلسلہ جاری ہے، یہاں کیا انشورنس مسلمانوں کے لئے اجتماعی حاجت نہیں بن گئی ہے؟ اور اگر ان خصوصی حالات کے تحت اس کی

اجازت دی جاتی ہے تو پھر اس سے متعلق کچھ فقہی سوالات بھی ہیں، ندوۃ العلماء کے تحت ”مجلس تحقیقات شرعیہ“ کی دعوت پر یہ مسئلہ زیر بحث آچکا ہے، اور مجلس نے ہندوستان کے خصوصی حالات کے پیش نظر جواز کا فتویٰ دیا ہے، اس مسئلہ پر مزید غور و خوض کے بعد آپ کو فیصلہ کرنا ہے، اور اگر آپ اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں تو پھر ارباب افتاء اسی کے مطابق فتاویٰ دیں، تاکہ مسلمان ذہنی انتشار اور آراء و خیالات کے تضاد سے بچ سکیں۔

تیسرا موضوع ”دولتوں کے درمیان کرنسی تبادلہ“ کا ہے۔ اس مسئلہ کی بنیاد اس امر پر ہے کہ یہ ”عقد صرف“ میں داخل ہے، یا نہیں؟ اور کیا اس میں ایک ہی مجلس میں تقابض ضروری ہے؟ اگر تقابض ضروری ہے تو کیا ڈرافٹ کے ذریعہ کرنسیوں کے تبادلہ میں یہ شرط پوری ہو جاتی ہے؟، اس سلسلہ میں ہمیں ایک طرف شریعت کے مقاصد پر بھی نظر رکھنی ہوگی اور سلف صالحین کے اجتہادات سے بھی فائدہ اٹھانا ہوگا، دوسری طرف حالات و مشکلات پر بھی نظر رکھنی ہوگی۔

مغربی تہذیب و تمدن کی وجہ سے پیدا ہونے والے اخلاقی انحطاط نے بھی ہمارے لئے بعض معاشرتی مسائل پیدا کر دیئے ہیں، ایسا ہی ایک مسئلہ جنوبی افریقہ کا ہے، موقعہ ہوا تو اس پر بھی غور کیا جانا ہے۔

ان سمیناروں نے امت کو کیا دیا؟ یہ سب آپ کے سامنے ہے، جیسا کہ ذکر کیا گیا، مختلف اہل علم کے ایک اسٹیج پر بیٹھنے اور مل کر مسائل حل کرنے کا مزاج پیدا کیا، علمی اور تحقیقی انداز پر غور و فکر کی صلاحیت دی، مخالف رائے برداشت کرنے اور اپنی رائے پر اصرار کی بجائے قبول و اعتراف کا ماحول سازگار کیا، نئے مسائل پر سوچنے کی ایک تحریک پیدا کی، جدید و قدیم کے فاصلہ کو کم بلکہ ختم کیا اور ایک طرف علماء و فقہاء اور دوسری طرف علوم جدیدہ کے ماہرین نے مشترک طور پر مسائل پر تبادلہ خیال اور بحث کی طرح ڈالی، اور میری نگاہ میں ان سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ فقہ کا میدان جو علماء کی توجہ سے مرحوم ہوتا جا رہا تھا، نوجوان فضلاء اور قلم کاروں کی ایک جماعت نے اس میدان میں حوصلہ افزا اور امید افزا رفتار کے ساتھ قدم بڑھایا ہے۔ فالحمد لله

علی ذلک۔ لیکن ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے، اور سب سے اہم کام ان کاموں میں جو رہا ہے تسلسل کو برقرار رکھنا ہے، اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرے، اپنی مرضیات پر ثابت قدم رکھے اور زبغ و ضلال سے حفاظت فرمائے۔

اکیڈمی کے سمینار کی روایت کے مطابق ابھی بھی ہمیں افراط و تفریط سے بچتے ہوئے آگے بڑھنا ہے، ایسا نہ ہو کہ ہم کتاب و سنت کی قائم کی ہوئی حدوں سے آگے بڑھ جائیں، شریعت کی حدود اور بے سے تجاوز کر جائیں اور تجرد و اباحت کے راستے کھول دیں کہ دین میں تحریف و تصحیف اکبر کبار ہے، اور ایسا بھی نہ ہو کہ بدلے ہوئے حالات و اقدار، تغیر پذیر عرف و عادات، اور تبدیل شدہ نظام و اطوار سے صرف نظر کرتے ہوئے ہر جزئیہ میں منتقدین کے اجتہادات و استنباط اور ان کے عہد کے حالات پر مبنی مسائل و احکام اور فتاویٰ ہی پر اصرار و جمود برتا جائے، کہ اس طرز عمل سے عام لوگوں میں اسلام سے فرار اور بددینی کی طرف میلان پیدا ہوگا، اسی لئے سلف نے کہا کہ ”من لم یعرف زمانہ فهو جاہل“ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ صحیح خطوط پر ہم ان مسائل پر غور کریں اور اس رائے اور نتیجہ تک پہنچیں جو خدا کو راضی کرنے والا ہے۔

اکیڈمی اور اس کے ذمہ داروں کی طرف سے ہم آپ تمام مہمانوں کے شکر گزار ہیں کہ زحمت سفر برداشت کر کے آپ یہاں تک پہنچے، بیرون ملک کے مہمانوں کے خصوصاً کہ ان کو زیادہ طویل سفر کرنا پڑا، دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد اور اس کے ذمہ داران، نیز مجلس استقبالیہ اور شہر حیدرآباد کے باذوق داعیان کے بھی، کہ ان حضرات نے نہایت سعی و کاوش اور خوش سلیقگی سے سمینار کی تیاری کی، اخیر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ تمام حضرات کو شایان شان اجر عطا فرمائے، اور ہم سے وہ فیصلے کرائے جن سے وہ راضی ہو۔

اللہم ألهمنا مرأشد أمورنا وأعدنا من شرور أنفسنا۔ والسلام علیکم

ورحمة الله وبرکاته۔

مجاہد الاسلام قاسمی

## خطاب

ڈاکٹر عبدالرحمن بن عبداللہ بن عقیل  
ترجمہ: مولانا نورالحق رحمانی

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على نبيه محمد وعلى آله  
وصحبه اجمعين ..... اما بعد!

میں اپنے آپ کو ایمان و عقیدے میں شریک بھائیوں کے درمیان اور ایک ایسے ملک  
میں موجود پا کر انتہائی مسرت محسوس کر رہا ہوں جس نے متعدد صدیوں تک اسلام اور اسلامی علوم  
کا جھنڈا اٹھائے رکھا، جب کہ ان اسلامی ممالک میں اس کا دائرہ محدود ہو کر رہ گیا تھا جو اس فریضہ  
کو انجام دے رہے تھے۔

اس ملک میں ایمان اور دعوت الی اللہ کے علم بردار، علم دوست بھائیو! یہ بات  
درحقیقت ہمارے لئے اطمینان بخش اور تسکین قلب کا ذریعہ ہے کہ اللہ کے فضل سے کتاب اللہ  
اور سنت رسول اللہ ﷺ کی بنیاد پر آپ کے درمیان وحدت اور اجتماعیت ہو، اور دعوت الی اللہ  
ہندوستانی مسلمانوں کی اصلاح حال، ان کے مدارس و مکاتب میں ربط و اتحاد قائم کرنے، طریقہ  
تعلیم میں یکسانیت لانے، انھیں اتحاد کی لڑی میں پروانے اور ان کے تمام دینی و دنیوی مسائل کو  
حل کرنے کی خاطر آپ ہمیشہ متحد اور سرگرم عمل رہیں تاکہ غفلت اور جمود و تعطل کے بعد ان میں  
حرکت اور بیداری آئے۔

یہ بات آپ پر مخفی نہیں ہے کہ برطانوی سامراج نے جب اس ملک میں قدم رکھا تو اس نے اس کی پوری کوشش کی کہ مسلمانوں کو اقتدار، علمی مراکز اور تجارت سے دور کر دیں، جب کہ حکومت و اقتدار ان کے قبضہ میں تھا، علمی مراکز اور صنعت و حرفت پر ان کی پوری گرفت تھی۔ اور زندگی کے ہر میدان میں وہ لوگوں کے قائد اور امام تھے۔ اور ان خبیث صیہونی سازش کے ذریعہ مسلمانوں کو حکومت و سیاست، علمی مراکز اور تجارت و صنعت سے دور کر دیا۔ مسلمانوں میں کمزوری کی ابتداء دراصل شعور کی کمزوری سے ہوئی، پھر مسلمانوں کی صف میں اختلاف پیدا کرنے، ان کے شیرازہ کو منتشر کرنے اور انھیں مختلف ٹولیوں میں بانٹنے کے سلسلے میں دشمنانِ اسلام کی سازش کامیاب ہو گئی۔

پچھلے چند سالوں سے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور ان کی دینی و دنیوی مشکلات و مسائل کے حل کے لئے کی جانے والی مخلصانہ کوششوں کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں، اللہ کے فضل و کرم سے اس امت کا چیدہ اور برگزیدہ اہل علم طبقہ پاکیزہ عزائم کے ساتھ ان اہم مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے سرگرم عمل ہے، جن میں خاص طور پر جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، ڈاکٹر محمد منظور عالم، مولانا محمد تقی عثمانی کے نام قابل ذکر ہیں اور خوش قسمتی سے انھیں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم اور دوسرے اکابر و مشائخ کی سرپرستی حاصل ہے جن کے نام میں تو نہیں جانتا، لیکن اس کی خبر رکھتا ہوں کہ علمائے ہند کے درمیان اتحاد قائم کرنے اور ان کی شیرازہ بندی میں ان کا بڑا اہم کردار ہے۔

برادرانِ اسلام! مسلمان اس وقت دنیا میں تقریباً ایک ارب کی تعداد میں ہیں جو انسانوں کی مجموعی آبادی کا ایک چوتھائی ہے، اور ان میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد تقریباً بیس کروڑ، یا اس سے کچھ کم و بیش ہے جو مسلمانوں کی مجموعی تعداد کا تقریباً ایک چوتھائی ہے اور اسلامی بیداری کی جولہ اس وقت سارے عالمِ اسلام میں ہے اور جو مغرب سے لے کر روس تک حتیٰ کہ یورپ اور دنیا کے دوسرے ممالک کی اقلیتوں کو بھی اپنے دائرے میں لئے ہوئے ہے۔ اللہ کے

فضل و کرم سے وہ بیداری آپ کے پاس بھی لوٹ کر آئی ہے۔

برادرانِ اسلام! آپ کا شمار ان محقق علماء میں ہوتا ہے جنہوں نے علم حدیث اور سنتِ مطہرہ کا جھنڈا بلند رکھا ہے، وہ چوٹی کے علماء اور اصحابِ فضل و کمال جنہیں پوری دنیا جانتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، نواب صدیق حسن خاں اور دوسرے بے شمار باکمال افراد۔ حدیث اور فقہ پر مخطوطات کا جو ذخیرہ ہندوستان میں موجود ہے وہ اس کی ایک واضح دلیل ہے کہ اس ملک نے اسلامی تاریخ کے ایک نازک دور میں اسلام کے جھنڈے کو اٹھانے کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے، اس لئے کمیت اور کیفیت ہر دو لحاظ سے ہندوستانی مسلمانوں کی اہمیت مسلم ہے۔

اور پھر اللہ رب العزت نے آپ لوگوں کا شرح صدر فرمایا اور اسلامک فقہ اکیڈمی اور دوسرے اسلامی اداروں کے ذریعہ آپ کے درمیان وحدت اور اجتماعیت پیدا فرمائی جو مسلمانوں کے اتحاد اور ان کی صلاح و فلاح کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں، اب ہم اللہ تعالیٰ کی ذات سے اور پھر آپ حضرات سے یہ امید رکھتے ہیں کہ آپ وسعت نظری اور دور بینی سے کام لیتے ہوئے اور وقت کی نزاکت و اہمیت کا احساس کرتے ہوئے اپنی صف کو منظم کر کے دوبارہ اسلام کے مبارک پرچم کو اخلاص اور صداقت کے ساتھ اٹھانے کا عزم کریں گے۔ اخلاص و للہیت اور خدائے تعالیٰ کی خوشنودی کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں گے۔ اور اللہ رب العزت کے فرمان: ”وَإِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ“ (سورہ مومنون/۵۲)، نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان: ”وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“ (سورہ مائدہ: ۲) اور بھلائی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور گناہ اور ظلم و زیادتی میں کسی کی مدد نہ کرو) کو اپنا شعار بنائیں گے، قرآن کریم کی دوسری آیات، احادیث نبوی اور علماء و اسلاف کرام کی سیرت میں ہمارے لئے عمدہ اور قابلِ تقلید نمونہ ہے جو ہمیں عمل کی دعوت دے رہے ہیں۔



لیکن اگر ہندوستان مسلمان اتنی بڑی تعداد کے باوجود منظم اور متحد نہ ہوئے اور باہمی اختلافات کو (خواہ اس کے جو بھی اسباب ہوں) پس پشت ڈال کر باہمی تعاون کے ساتھ کام کرنے کا عزم نہ کیا تو پھر وہ دشمنانِ اسلام کی سازشوں کا شکار ہوں گے اور وہ دوبارہ ان کی صف میں داخل ہو کر انھیں ناکام بنانے کی کوشش کریں گے۔

اس لئے آپ آپس کے اختلاف اور نزاع و جدال سے مکمل طور پر پرہیز کریں اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں اور باہم تفرقہ نہ کریں اور اللہ کی اس نعمت کی قدر کریں کہ آپ کے درمیان عداوت تھی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے دلوں میں الفت ڈال دی۔

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے گذشتہ چند سالوں میں ”اسلامک فقہ اکیڈمی“، دوسرے دینی اداروں اور اکیڈمیوں کے ذریعہ مسلمانوں میں یکجہتی پیدا کی اور ان کے شیرازہ کو مجتمع کیا، مجھے اس سلسلے میں خاص طور پر ان مبارک کوششوں سے بڑی مسرت ہوئی جو ہندوستان کے عربی اور اسلامی مدارس کے نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم میں یکسانیت پیدا کرنے کی خاطر کی گئی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ یہ نہایت مبارک اور مستحسن اقدام ہے، اس سے مسلم طلباء کے افکار و نظریات میں یک جہتی پیدا ہوگی اور اللہ کی رضا کی خاطر ان کے طریقہ کار میں یگانگت اور وحدت پیدا ہوگی اور ان کی عزت و وقار کا تحفظ ہوگا، لیکن اگر ہندوستانی مسلمانوں نے اتحاد و اجتماعیت کا ثبوت نہ دیا اور قوت و شدت اور عزم و اصرار کے ساتھ کام نہ کیا تو ان کی ہوا اکھڑ جائے گی اور ان کا وقار خطرے میں پڑ جائے گا۔

آپ کو اس کا احساس ہونا چاہئے کہ آپ مجاہد فی سبیل اللہ ہیں اور جو خدمات آپ انجام دے رہے ہیں وہ جہاد ہے۔ اس لئے اس پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے اجر و ثواب کا یقین ہونا چاہیے۔ اور مسلمانوں کے اتحاد، ان کے فردی اختلافات کے ازالہ اور ان کے دینی و دنیوی معاملات کی اصلاح کے لئے ہمیشہ کوشاں رہنا چاہئے۔ اس طرح ہم اپنی اس عزت و قوت اور فضیلت و فوقیت کو دوبارہ واپس لا سکتے ہیں جو ماضی میں ہمیں حاصل تھی، ہم اللہ وحدہ لا شریک کی

ذات سے یہ امید کرتے ہیں کہ وہ آپ کی نصرت و اعانت کرے اور ثابت قدمی عطا کرے۔  
 اخیر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ سعودی اور دوسرے خلیجی ممالک کے علمائے کرام کا سلام  
 آپ تک پہنچا دوں جو آپ سے غایت درجہ محبت رکھتے ہیں اور آپ کے لئے ہمیشہ دعائے خیر  
 کرتے رہتے ہیں، اور جو آپ کے اتحاد و اتفاق، علمی و دینی خدمات اور مجاہدانہ سرگرمیوں کو قدر کی  
 نگاہ سے دیکھتے ہیں، آپ کے لئے استقامت اور مدد کی دعاء کرتے ہیں۔  
 یہ بھی نہایت خوش آئند بات ہے کہ ”اسلامک فقہ اکیڈمی“ ایسے مسائل کو غور و فکر کا  
 موضوع بنا رہی ہے جن کا مسلمانوں کی عملی زندگی سے براہ راست تعلق ہے اور جو اس دور کے  
 نہایت اہم مسائل ہیں، اس سمینار کے لئے آپ حضرات نے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے وہ  
 ہیں:

”اسلامی بینکوں کی اصلاح“ اور ”بیمہ کا مسئلہ اور مسلمانوں کی اقتصادی زندگی پر اس  
 کے اثرات“ وغیرہ، بلاشبہ یہ ایسا مبارک اقدام ہے جو گہرے شعور و آگہی اور فکر و بصیرت کی غمازی  
 کرتا ہے اور اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اکیڈمی کے ذمہ داروں کا ہاتھ زمانے کے نبض پر  
 ہے، یہ چیز مسلمانوں کو فکری و نظری زندگی سے نکال کر عملی زندگی کی طرف لائے گی، اور ایسے امور  
 کی طرف متوجہ کرے گی جن میں مسلمانوں کی بھلائی اور فلاح و ترقی ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپ کو اس راہ پر ثابت قدم رکھے اور پوری  
 نصرت فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب لوگوں کو ہر خیر کی توفیق عطا فرمائے اور تمام شرور و فتن سے محفوظ  
 رکھے اور ہم سب کا انجام بہتر فرمائے، اسلام اور مسلمانوں کو عزت عطا کرے اور سب کو اپنی  
 مرضیات کی توفیق بخشے، آمین۔

## تجویر و تعزیت

مولانا محمد رضوان القاسمیؒ

یہ ہمارا اہم فقہی اجتماع ہے، اس موقع پر ہمیں تین علمی شخصیتیں یاد آ رہی ہیں جو ہم سے کچھڑ گئی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے جو رحمت میں پہنچ گئی ہیں، میری مراد حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ سے ہے، جو ”امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ“ کے چوتھے امیر شریعت تھے اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے روح رواں اور جنرل سکرٹری تھے اور بہت ساری تنظیموں کے سربراہ اور بہت سوں کے رکن تھے۔ ان کی شخصیت اور ان کے خاندانی پس منظر سے ہم واقف ہیں، ہماری خواہش ہے کہ اس موقع پر ہم ان کو یاد رکھیں، اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ان کے چھوڑے ہوئے کاموں کو تکمیل تک پہنچائے، خصوصیت کے ساتھ امارت شرعیہ اور مسلم پرسنل لاء بورڈ ہر طرح کے اختلاف و انتشار سے بچتے ہوئے امت کی صحیح رہنمائی و قیادت جس طرح کرتے آئے ہیں آئندہ بھی کرتے رہیں، وہ تمام افراد جو ان دونوں اداروں سے وابستہ ہیں ان کے حوصلے جو ان اور عزائم تازہ رہیں اور یقین محکم رہے۔

اس موقع پر دوسری شخصیت ہمیں اور یاد آ رہی ہے، وہ اس مناسبت سے کہ ”فتاویٰ تاتارخانیہ“، جو فقہ و فتاویٰ کی عظیم کتاب ہے، ابھی کچھ دنوں پہلے اسی شہر میں ”دارۃ المعارف“ سے چھپی ہے، اس کے قلمی نسخہ پر مولانا نے بہت محنت کی، میری مراد فارسی کے مشہور ادیب اور اسلامی علوم و فنون کے غواص و شناور مولانا قاضی سجاد حسینؒ کی ذات گرامی سے ہے، جو میرے خیال میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کے استاذ بھی ہیں، میں محسوس کرتا ہوں

کہ ان کے لئے بھی دعا مغفرت کرنی چاہئے۔

ایک تیسری شخصیت جو عصری علوم و فنون سے پیدا شدہ نت نئے مسائل کو حل کرنے کا جو جذبہ اور حوصلہ پیدا ہوا ہے، مثلاً معاشیات، اقتصادیات اور سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی کی بنیاد پر جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں ان کے حل کا راستہ دکھانے میں ایک نمایاں اور ممتاز نام مولانا تقی امینی کا بھی ہے۔ مولانا کی کتاب ”احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت“، کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی، پھر ان کی وہ کتاب بھی فراموش نہیں کی جاسکتی جسے فقہ کے پس منظر پر انھوں نے مرتب کی ہے۔ اس سلسلہ کی تمام فقہی کتابیں یاد رہیں گی، ہمیں اس موقع پر مولانا یاد آ رہے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ان کو بھی خراج تحسین و عقیدت پیش کریں، اور ہم سب یہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

چوتھی شخصیت مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کی ہے، انھوں نے ”قاموس القرآن“ اور خلافتِ راشدہ جیسی اہم کتابیں لکھی ہیں، ”سیرت طیبہ“ اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، زبان ان کی بڑی پیاری تھی، بہت اچھا لکھتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی بھی مغفرت فرمائے۔



## خطبہ صدارت

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، پاکستان

خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا:

میرے لئے یہ بات بہت بڑے اعزاز اور خوشی و مسرت اور یادگار کی حیثیت رکھتی ہے کہ اللہ جل جلالہ کے فضل و کرم سے مجھے اس عظیم الشان علمی ادارے کے چوتھے فقہی مذاکرہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی، میں اپنے محترم بزرگ جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم کا اور اس اسلامک فقہ اکیڈمی کے تمام منتظمین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے اس محفل میں شرکت کا موقع عنایت فرمایا اور نہ صرف ایک سامع اور شریک کی حیثیت میں، بلکہ اس افتتاحی اجلاس کی صدارت کی ذمہ داری بھی مجھ ناچیز کو سونپی، اس سے پہلے اگرچہ اکیڈمی کی طرف سے ہر سال مجھے دعوت موصول ہوتی رہی لیکن میں اپنے بعض مشاغل کی وجہ سے حاضر خدمت نہ ہوسکا۔ مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم سے میرا غائبانہ تعارف ایک طویل مدت سے ہے، لیکن میں ان کو فقیہ ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ایک مخفی جوہر، مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بھی ودیعت کر رکھا ہے، آج اس محفل میں شرکت کرنے کے بعد ہندوستان کے علماء اور علم و فضل کے پیکر حضرات سے ملاقات کر کے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے کہ انھوں نے اس اکیڈمی کو قائم کر کے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کے اس کارنامے کو قبول فرمائے اور اس کے اغراض و مقاصد کو اپنی رضا کے مطابق پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس موقع پر اس اکیڈمی کے اغراض و مقاصد کو مد نظر رکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس اکیڈمی کا قیام جناب نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد کی تعمیل ہے۔ وہ ارشاد مجتمہ طبرانی میں ایک روایت ہے جسے علامہ پیشی نے مجمع الزوائد میں بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ!

”اذا جاء نا امر ليس فيه امر ولا نهى فماذا تأمرنا فيه“۔

یا رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا سوال آجائے، ایسا قضیہ سامنے آجائے جس کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو تو اس صورت حال میں آپ ہمیں کس بات کا حکم دیتے ہیں، ایسے موقع پر مجھے کیا کرنا چاہئے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”شاوروا الفقهاء العابدین ولا تمضوا فيه برأى خاص“۔

کہ ایسے موقع پر فقہاء عابدین سے مشورہ کرو، اور اس میں انفرادی رائے کو نافذ نہ کرو، محض انفرادی فتویٰ کو محض انفرادی رائے کو لوگوں پر مسلط کرنے کی بجائے فقہاء عابدین سے مشورہ کرو، اور اس مشورہ کے نتیجہ میں جس مقام پر پہنچو اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم سمجھو، یہ ہے وہ ارشاد جس کے ذریعہ نبی کریم ﷺ نے قیام قیامت تک پیدا ہونے والے تمام نئے مسائل کا حل ہمارے لئے تجویز فرمایا اور وہ یہ کہ آخری وقت میں جب کہ اجتہاد مطلق کا تصور تقریباً مفقود ہو گیا ہے اس دور میں نئے مسائل کو حل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ فقہاء عابدین کو جمع کیا جائے، مگر اس میں نبی کریم ﷺ نے دو صفتیں بیان فرمائی۔ ایک یہ کہ جن لوگوں کو جمع کیا جائے وہ تفقہ فی الدین رکھنے والے ہوں، دین کی صحیح سمجھ رکھنے والے ہوں، دین کے مزاج و مذاق کو اچھی طرح محفوظ کرنے والے ہوں، اور دوسری قید یہ لگا دی کہ وہ فقہاء، محض فلسفی قسم کے نہ ہوں، جو نظریاتی طور پر فقیہ ہوں نظریاتی طور پر اسلام کے احکام کو جانتے ہوں، جو محض علم رکھتے ہوں، لیکن اس علم پر خود عمل پیرا نہ ہوں۔ اس علم کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہ ہوں اور اس علم

کو اپنی زندگی کا منتہائے مقصود نہ بنایا ہو، تو ایسے فقہاء سے مشورہ کرنے کا کوئی حاصل نہیں، اس لئے کہ دین یہ محض ایک نظریہ اور فلسفہ نہیں کہ ایک شخص محض فلسفہ کے طور پر اس کو اپنالے، اس کے احکام بیان کر دے اور پھر بھی اس کا ماہر کہلائے، بلکہ یہ ایک عمل ہے، ایک پیغام ہے، ایک دعوت ہے، جب تک اس پر عمل صحیح طور پر نہیں ہوگا اس وقت تک دین کی صحیح سمجھ حاصل نہیں ہو سکتی، میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ یہ بات فرمایا کرتے تھے:

”کہ اگر میرا علم بمعنی جان لینا کوئی کمال کی بات ہوتی تو شاید ابلیس سے بڑا صاحب

کمال اس کائنات میں کوئی نہ ہوتا۔“

اس لئے کہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے، صرف جان لینے کا، علم حاصل کر لینے کا، تو ابلیس کو علم بہت بڑا حاصل تھا، بہت کچھ علم اس کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، اور عقل کے اعتبار سے بھی آپ دیکھیں تو عقل، خالص عقل جو وحی کی رہنمائی سے آزاد ہو، اس عقل کے اعتبار سے اس نے جو دلیل پیش کی سجدہ نہ کرنے کی کہ اے اللہ تو نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور مجھ کو آگ سے پیدا کیا، تو میں افضل ہوں، اس لئے کہ آگ افضل ہے مٹی کے مقابلے میں، تو اگر عقل کو وحی کی رہنمائی سے آزاد کر دیا جائے تو خالص عقل کی بنیاد پر اس کی دلیل کا توڑ پیش نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس سارے عقل اور اس سارے علم کے باوجود وہ راندہ درگاہ ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نکالا گیا، اسلئے کہ وہ علم نرا علم تھا، دانستن کے معنی میں اس پر عمل نہیں تھا، اس کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہیں تھا، آپ کو معلوم ہے کہ آج ہمارے اس دور میں جتنے مستشرقین ہیں، اگر آپ انکی لکھی کتابیں دیکھیں تو ان میں اسلامی کتابوں کے ڈھیر ملیں گے۔ اتنی کتابوں کے حوالے ملیں گے کہ بسا اوقات ہمارے عالم دین اتنی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتے ہیں، لیکن سارا علم اور ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد اس علم کا اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکتے کہ ایمان کی دولت حاصل کر لیتے، یہودی کے یہودی، عیسائی کے عیسائی رہے۔ تو معلوم ہوا کہ صرف فقہ کا عالم ہو جانا کافی نہیں، اور صرف فقہ کے عالم ہو جانے سے وہ مقام حاصل نہیں ہو جاتا جو نبی کریم ﷺ نے نئے مسائل کو

حل کرنے کے لئے تجویز فرمایا، بلکہ قید لگا دی کہ فقہاء کے ساتھ ”عابدین“ ہونے چاہئے، عبادت گزار ہونے چاہئے۔ یہ حدیث میں نے اس وجہ سے سنائی کہ آج کثرت سے یہ آواز بلند ہوتی رہتی ہے، مختلف حلقوں کی طرف سے کہ صاحب دین کی تفہیم اور دین کی تعبیر کا حق صرف علماء ہی کو کیوں حاصل ہے؟ ہر مسلمان بہ حیثیت ایک مسلمان وہ دین کی تفہیم و تشریح نہیں کر سکتا، ہر آدمی کھڑا ہو کر بہ آواز بلند کہتا ہے کہ میرے پاس قرآن موجود ہے۔ ڈکشنری موجود ہے، میں عربی زبان سے واقف ہوں اور عربی زبان پڑھ کر میں قرآن کریم سے احکام شرعیہ کا استنباط کر سکتا ہوں، یہ دین کی تفہیم و تعبیر کا سارا حق اٹھا کر علماء ہی کی جھولی میں کیوں ڈال دیا گیا۔ علماء کی اجارہ داری کیوں قائم کر دی گئی۔

تو جواب دیا نبی ﷺ نے کہ تشریح کا حق صرف فقہاء عابدین کو حاصل ہے، صرف فقہاء کو بھی نہیں، بلکہ فقہاء عابدین کو، اس کے سوا کوئی قرآن و سنت کے احکام کی صحیح تفسیر و تشریح نہیں کر سکتا۔

یہ عجیب واقعہ ہے کہ دنیا کے ہر علم و فن میں کوئی ذمہ دارانہ بات کہنے کے لئے، ساری دنیا میں یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ اس فن کا اس نے علم حاصل کیا ہو، اس کی ڈگری حاصل کی ہو، کوئی شخص آج تک ایسا پیدا نہیں ہوا جو کہتا ہو کہ میں انگریزی جانتا ہوں، میڈیکل سائنس کی کتابیں مطالعہ کر کے میں علاج کر سکتا ہوں، اگر میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر، محض مطالعہ کر کے ڈکشنریوں کے ذریعہ اس کے ترجمے دیکھ کر آدمی علاج کرنا شروع کر دے تو سوائے قبرستان آباد کرنے کے اور کوئی خدمت انسانیت کی وہ انجام نہیں دے سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دین کے اندر بھی یہ راستہ رکھا ہے کہ جب کتاب بھیجی تو نبی کریم ﷺ ساتھ بھیجا تا کہ آپ اس کی تعلیم دیں، اس کی تربیت دیں، اس کے معانی سکھائیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے سالہا سال کی محنت کر کے قرآن کریم کی ایک ایک سورہ سرکار دو عالم ﷺ سے پڑھی، اس لئے یہ نعرہ جو لگایا جاتا ہے کہ ہر شخص قرآن و سنت کے بارے میں جو چاہے کہہ سکتا ہے، اس کا جواب اس مکمل



حدیث کے اندر موجود ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ”مجمع الفقہ الاسلامی“ اسی حدیث کی تعمیل معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حدیث پر عمل کرنے کا صحیح نور، اس کی صحیح برکت اور اس کا صحیح فائدہ مجمع کو عطا فرمائے۔

جیسا کہ مجھ سے پہلے کئی حضرات اس پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ اس مجمع (اکیڈمی) کے قیام کا اصل مقصد ان نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے جو امت مسلمہ کو درپیش ہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ علماء کے نقطہ نظر سے یہ وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے کہ علماء باہم سر جوڑ کر ان مسائل کا حل امت مسلمہ کے سامنے پیش کریں جو آج امت کے لئے چیلنج بنے ہوئے ہیں، لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ وقت کا بہت بڑا تقاضہ ہے کہ علماء یہ کام کریں تو مجھے چند وہ جملے بھی یاد آتے ہیں جو بسا اوقات مختلف حلقوں کی طرف سے بار بار اٹھائے جاتے ہیں کہ علماء کو وقت کے تقاضے کے پیچھے چلنا چاہئے، علماء کو وقت کے تقاضوں کے مطابق کام کرنا چاہئے۔ اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنا چاہئے۔ یہ جملہ جس اجمال کے ساتھ بولا جاتا ہے اس کا صحیح مطلب بھی ہو سکتا ہے اور غلط مطلب بھی ہو سکتا ہے۔ وقت کے تقاضہ کا مفہوم بسا اوقات لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ مغرب سے جو ہوا چل کر آوے، مغرب سے جو فکر، جو فلسفہ، جو نظریہ اور جو طرز عمل ہمارے ملکوں میں درآمد ہو گیا، بجائے اس کے کہ اس کو بدلا جائے، اس کے بجائے اسلام کو بدل کر اس کے مطابق کیا جائے، اسے وقت کا تقاضہ قرار دیا جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ سود، ربوا کا چلن ہوا تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ صاحب اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان سود کو جوں کا توں قبول کر لیں، ایک زمانہ آیا کہ اشتراکیت اور شوٹلزم کا ڈنکا بجا، اور انھوں نے دنیا کے اندر اپنے نظریات کو پھیلانا شروع کیا، دنیا کے مختلف ملکوں اور سلطنتوں میں ان کا نظام رائج ہوا۔ اس کا شور شرابہ ہوا تو اس کے نتیجے میں ایک جماعت نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ شوٹلزم کو، اشتراکیت کو اسلام کے مطابق ڈھال دیا جائے، وقت کا تقاضہ یہ ہے، غرض جوئی و با مغرب سے درآمد ہوا اسلام کو اس کے مطابق

بنانے اور اس کو اسلام کے اندر داخل کرنے کے لئے وقت کے تقاضہ کا عنوان استعمال کر لیا جاتا ہے۔

لیکن یہ ”مجمع الفقہ الاسلامی“ درحقیقت ایسے وقت کے نام نہاد تقاضوں کے پیچھے نہ ہے اور نہ ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ، یہاں وقت کے تقاضوں سے مراد یہ ہے کہ بے شمار مسائل آپ کی زندگی کے اندر ایسے پیش آگئے ہیں کہ ہمیں ان کا صریح حکم کتاب اللہ میں، یا سنت رسول اللہ ﷺ میں فقہاء کرام کے کلام میں نہیں ملتا، جسے آپ اصطلاحی اعتبار سے ”اجتہاد فی المسائل“ کہہ سکتے ہیں، تو ”اجتہاد فی المسائل“ کے ذریعہ ان مسائل کا حل تلاش کیا جائے اور وسعت نظر کے ساتھ کیا جائے۔ پورے اسلامی مزاج کے ساتھ کیا جائے، اس کے اندر کسی اجنبی نظریہ اور فلسفہ سے مرعوب ہو کر نہیں، بلکہ حقیقی اسلامی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کا حل اسلامی اصولوں کے دائرہ میں رہ کر تلاش کیا جائے اور اس سے باہر نہ جایا جائے، یہ ہے اس مجمع (اکیڈمی) کا اصل مقصد اور اسی لئے اس میں الحمد للہ مختلف الخیال، مختلف اداروں سے تعلق رکھنے والے موجود ہیں اور پچھلے دنوں جو تحقیقات سامنے آئی ہیں، اللہ کے فضل و کرم سے ان میں ان بنیادی اصولوں کا لحاظ نظر آتا ہے، امید ہے کہ یہ اکیڈمی ان راستوں پر چلے گی، تو انشاء اللہ اس امت کے لئے بہترین مسائل کا حل پیش کرے گی۔

لیکن میں آخر میں اس سلسلہ کے ایک اہم نکتہ کی طرف آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، بلکہ توجہ دلانا بے ادبی کی بات ہوگی، سارے حضرات اکابر علماء ہیں، محض تذکیر اور تکرار کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ چونکہ ہم ایک ایسے معاشرہ میں جی رہے ہیں جس میں مغرب کا سیاسی اور فکری تسلط قائم ہے، سیاسی اعتبار سے پوری دنیا کے اوپر مغرب مسلط ہے، فکری اعتبار سے بھی مغرب کے افکار اور ان کے نظریات و فلسفے مسلط ہیں۔ اور یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ ”جس کی لاٹھی اس کی بھینس“ جس کے پاس ہتھیار اور جس کے پاس قوت ہو تو لوگوں کو بات بھی اسی کی سمجھ میں آتی ہے اور جلدی سے سینے میں اتر جاتی ہے، تو اس واسطے مغرب نے جو افکار

ہمارے یہاں پھیلا دیئے اور صدیوں کی محنت کے بعد پھیلائے، ہمارے نظام تعلیم کے اندر وہ افکار پھیلا دیئے، ان کی موجودگی میں اس بات کا بڑا قوی اندیشہ ہے کہ بعض ایسی چیزوں کو وقت کی ضرورت قرار دیا جائے جو درحقیقت وقت کی ضرورت نہیں ہیں، محض مغرب کے پروپیگنڈہ نے اسے وقت کی ضرورت قرار دے دیا، یہ ”وقت کی ضرورت“ ایک ایسا مجمل لفظ ہے جس کے اندر بہت کچھ سما سکتا ہے، اس لئے وقت کی ضرورت کے ہتھیار کو استعمال کرتے ہوئے ان کے دو دھاریں اپنے ذہن میں رکھنی ضروری ہے، یہ دو دھاری ہتھیار ہیں، اس سے امت مسلمہ کے مسائل بھی حل ہو سکتے ہیں اور اس سے امت مسلمہ کا کام بھی تمام ہو سکتا ہے، اس لئے ہم جب وقت کی ضرورت کا لفظ استعمال کریں تو یہ بات ہمارے ذہن میں ہونی چاہئے کہ محض پروپیگنڈہ کے شور و شغب سے مرعوب ہو کر ہم یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ یہ بھی وقت کی ضرورت ہے، بلکہ ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے اپنے اصول، ہمارے اپنے قواعد کے لحاظ سے یہ ضرورت ہے یا نہیں؟

اسی ضمن میں یہ سوال بہ کثرت اٹھتا ہے کہ کیا ان مسائل کو طے کرتے وقت کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی کرنی چاہئے، یا مختلف فقہی مذاہب کو سامنے رکھ کر اور اس میں سے جو ضرورت کے مطابق معلوم ہو اس کو اختیار کر لینا چاہئے۔

میں خاص طور پر آپ حضرات سے باادب عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خاص اس دور میں معاملات کے شعبہ میں چونکہ معاملات پیچیدہ ہوتے ہیں، بے شمار مسائل سامنے آگئے ہیں، لہذا اگر ایک شخصی حنفی مذہب کا پیروکار ہے اور وہ کسی ضرورت کی وجہ سے، عموم بلوئی کی خاطر وہ مسائل وقت کو حل کرنے کی خاطر دوسرے کسی امام کے قول کو اختیار کر لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، یہ جائز ہے اور نہ صرف جائز ہے بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو باضابطہ وصیت فرمائی تھی کہ اس دور میں جب کہ معاملات پیچیدہ ہو گئے ہیں اگر ائمہ اربعہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے کسی بھی فقہی مذہب میں کوئی گنجائش مل جائے تو اس دور کے لوگوں کے لئے آسانی پیدا کرنی چاہئے۔

لیکن اس میں ادق ترین نکتہ ہے جو بسا اوقات افراط و تفریط کا شکار ہو کر فراموش ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ مختلف مذاہب میں سے ”عموم بلوی“ کی خاطر کوئی قول اختیار کر لینا اور بات ہے، اور اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کی خاطر مذاہب کو گڈ مڈ کرنا بالکل جدائی ہے، یعنی اگر کوئی شخص محض اس بنیاد پر کہ میری خواہش نفسانی، میرے مفاد ایک مذہب سے پورے ہو رہے ہیں دوسرے سے پورے نہیں ہو رہے ہیں، تو اس بنیاد پر اگر وہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر تو اس کی کسی کے نزدیک اجازت نہیں، یہ اتباع ہوئی ہے، یہ خواہشات نفسانی کی اتباع ہے، اس کو تشبیر کہا گیا ہے، یہ شہوت پرستی ہے، یہ خواہش پرستی ہے، محض اپنے ذاتی فائدہ، یا ذاتی سہولت کی خاطر ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتا ہے اس کی مثال آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں:

آج جب کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے یہ عام رجحان پیدا ہوا، پورے عالم اسلام میں خاص طور پر عرب ممالک میں یہ رجحان بہت پیدا ہوا کہ ان معاملات کو حل کرنے کے لئے مختلف مذاہب سے رہنمائی حاصل کی جائے، اور کسی ایک مذہب کی اتباع نہ کی جائے، جب یہ لے آگے بڑھی تو اس نے بعض اوقات یہ صورت اختیار کر لی کہ محض ضرورت کی خاطر نہیں، بلکہ محض ذاتی مفاد، ذاتی سہولت کی خاطر ”جمع بین المذاہب“ اور ”تلفیق بین المذاہب“ کا راستہ اختیار کر لیا، اتباع ہوئی کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ فتاویٰ کے اندر لکھتے ہیں:

”اگر کوئی شخص ذاتی خواہش کی خاطر دوسرے مذہب کو اختیار کرتا ہے تو یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں، بلکہ حرام ہے۔“

حالانکہ علامہ ابن تیمیہ تقلید کے سخت مخالف ہیں، اتباع ہوئی کو وہ بھی حرام قرار دیتے ہیں، اس کی چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں:

ایک صاحب سے میری ایک بار ملاقات ہوئی، میں اور وہ دونوں سفر پر تھے اور دونوں سفر کے عالم میں مقیم تھے۔ ہفتہ دس دن ایک جگہ ٹھہرنا تھا، تو میں نے دیکھا کہ وہ ”جمع بین

الصلوٰتین“ کر رہے ہیں۔ دو نمازوں کو جمع کر رہے ہیں، حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے، امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جائز ہے، امام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے، اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمع حقیقی جائز نہیں ہے، ”جمع صوری“ کو جائز کہتے ہیں، تو وہ جمع کر رہے تھے، انہوں نے امام شافعیؒ کے قول پر عمل کیا ہوگا۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ ہفتہ بھر مقیم رہے اور جمع بین الصلوٰتین کرتے رہے تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے شافعی مسلک پر عمل کیا کہ دو نمازوں کو جمع کیا۔ آپ نے کس مسلک کو اختیار کیا؟ تو کہا کہ میں تو ہوں حنفی، لیکن سفر میں شافعی مسلک کو لے لیا تاکہ دو نمازوں کو جمع کرنے کی گنجائش مل جائے، میں نے عرض کیا کہ شافعی مسلک یہ بھی ہے کہ چار دن سے زیادہ ان کے یہاں قصر نہیں ہو سکتی، ان کے نزدیک مدت قصر صرف چار دن ہے، تو چار دن سے زیادہ مدت سفر نہیں ہوتی، اور آپ تو ہفتہ بھر سے مقیم ہیں، تو کہنے لگے کہ میں نے اس معاملہ میں حنفی مسلک کو لے لیا، تو میں نے پوچھا کہ کیا آپ دلائل کے نقطہ نظر سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے اور اس معاملہ میں شافعیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے۔ کہنے لگے کہ دلیل کے اعتبار سے تو میں نہیں سمجھتا، لیکن میں نے دیکھا کہ یہ میرے لئے زیادہ سوٹ کرتا ہے، تو اس واسطے میں نے اس میں حنفی کا مسلک لے لیا اور اس میں شافعی کا مسلک لے لیا۔ تو میری گزارش یہ ہے کہ محض ذاتی سہولت اور ذاتی مفاد، ذاتی راحت کے پیش نظر ایک مسئلہ میں ایک قول کو لے لینا اور دوسرے مسئلہ میں دوسرے قول کو لے لینا یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو اس سے دین کا حلیہ بگڑنے کا اندیشہ ہے، اس واسطے کہ ہر مذہب میں جو قول اختیار کیا گیا اس کے کچھ شرائط ہیں اس کے کچھ حدود ہیں۔ آپ نے ان شرائط کو مد نظر نہیں رکھا، چھوڑ دیا، اور ان شرائط کو مد نظر رکھے بغیر اور اس طرح سے ”تلفیق بین المذاہب“ کا سلسلہ شروع کر دیا تو اس کا نتیجہ سوائے اتباع ہوئی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا، اس لئے میری گزارش یہ ہے کہ بے شک دوسرے مذاہب خاص طور پر معاملات کے اندر، دوسرے مذاہب سے لے لینے کی گنجائش ہے، لیکن یہ اس وقت جب کہ واقعی کوئی ضرورت داعی ہو اور

واقعتاً اس سے مسلمانوں کے کسی اجتماعی مسئلہ کا حل نکالنا مقصود ہو۔ اور اس کا مقصد اتباع ہوئی، تشبیہ اور ذاتی منفعت کو حاصل کرنا نہ ہو، اس صورت میں اس کی گنجائش ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ یہ علماء کا مجمع ہے ان کے سامنے کہنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن یہ اس لئے میں نے تذکیراً اور تکراراً عرض کر دی کہ جب ہم کسی ایک جانب جھکیں تو ایسا نہ ہو کہ دوسری جانب کا خیال ہمارے دل سے اوجھل ہو، یہ کام بڑا نازک ہے، یہ پل صراط ہے۔ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس میں اس کا خیال رکھنا ہے کہ وقت کی ضروریات پوری ہوں، مسلمانوں کے مسائل حل ہوں اور دوسری طرف اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ آپ مغرب کے اس جھوٹے پروپیگنڈے سے مرعوب نہ ہوں، جو ہرنی و باکو وقت کی ضرورت کہہ کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، اس واسطے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم اس کام کو انجام دیں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس شریعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ یہ آنے والے ہر بڑے سے بڑے مسئلہ کا حل رکھتی ہے اور جب یہ تصور آپ سامنے رکھتے ہوئے جواب دیں گے تو انشاء اللہ امت کے مسائل حل ہوں گے، جیسا کہ مجھ سے پہلے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نے فرمایا کہ عالم کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ یہ حرام ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ اگر کسی چیز کو حرام کہا ہے اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہے تو اس کا متبادل حلال طریقہ بھی بتائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جب حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی کہ بادشاہ نے خواب دیکھا ہے کہ:

”إِنِّي أَرَى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ.....“ (سورہ یوسف: ۴۳)۔

جب یہ پوچھا گیا تو یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا

ہے، لیکن اس قحط سے بچنے کا راستہ پہلے بتا دیا:

”تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَابًّا فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ“ (سورہ یوسف: ۴۷)۔

تعبیر تو بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے۔ اور پہلے قحط سے بچنے کا یہ راستہ بتایا کہ سات

سال تک خوب جم کر زراعت کرو، اور خوشہ کے اندر گیہوں کو چھوڑ دو۔ تو بچنے کا طریقہ پہلے بتا دیا اور خواب کی تعبیر بعد میں بتائی، تو عالم کا کام محض حرام قرار دے کر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ متبادل راستہ بتانا بھی اس کی ذمہ داری ہے، اور یہ اکیڈمی درحقیقت اسی لئے قائم کی گئی ہے، اس کے لئے میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے علوم و فنون کے ماہرین کی بھی ضرورت ہوگی، متبادل طریقوں کے سمجھنے اور اس کے تعین کے لئے وہ طریقے تجویز کئے جاسکیں جو قابل عمل ہوں۔

الحمد للہ! دیکھتا ہوں کہ ”مجمع الفقہ الاسلامی“ نے اس اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے دیگر علوم و فنون کے ماہرین سے بھی استفادہ کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنی رحمت سے اس اکیڈمی کو اپنے مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائے، قدم قدم پر اس کی نصرت و دستگیری فرمائے، اس کے راستے کی دشواریوں کو دور فرمائے اور دین کی صحیح خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں اخیر میں ایک بار پھر اس کانفرنس کے منتظمین کا، اور تمام حاضرین کا تیرہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کی گزارشات کو غور و توجہ کے ساتھ سنا۔ اللہ تعالیٰ ہم سبھوں کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔



## پیغامات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ☆

راقم سطور کے لئے جو متعدد ناگزیر موانع کی بنا پر سمینار میں شرکت کی مسرت و عزت سے محروم ہو رہا ہے۔ اس اہم اجتماع اور تقریب کے لئے پیغام مسرت و تہنیت بھیجنا باعث عزت بھی ہے اور کسی قدر باعث تسکین و تسلی بھی ہے۔

کسی اسلامی ملک اور ملت اسلامیہ کے کسی اہم عنصر اور جزء کے لئے اتنی بات کافی نہیں کہ وہ بڑی تعداد میں ہے اور سیاسی و اقتصادی حیثیت سے وہ وزن اور اثر رکھتی ہے، اس کے دینی شعور، قوت عمل، افادیت اور نہ صرف صلاحیت بقاء، بلکہ صلاحیت قیادت کے ثبوت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ معلوم ہو کہ وہ دین و شریعت کے نہ صرف بقاء بلکہ اس کی ترقی و ارتقاء اور نئی نسل اور نئے دور کی رہنمائی کا ثبوت دینے کے لئے وہ کیا جدوجہد کر رہی ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے اس نے کیا وسائل اختیار کر رکھے ہیں۔

اسی سلسلہ کا ایک اہم کام شریعت اسلامی اور احکام فقہی کے اس بدلے ہوئے دور میں نہ صرف قابل عمل ہونے کی صلاحیت کا ثبوت دینا ہے، بلکہ ان کی برتری بھی ثابت کرنا ہے، اس سلسلہ کا ایک بنیادی اور اہم ترین کام یہ ہے کہ کتاب و سنت، شریعت اسلامی اور احکام فقہی کی روشنی میں بدلے ہوئے حالات اور نئے پیدا ہونے والے مسائل کے بارے میں شرعی احکام اور



مسائل و مشکلات کے حلول پیش کئے جائیں اور اصول شرعی کی ابدیت، شرعی و فقہی ذخیرہ کی وسعت اور استنباط و اجتہاد کی صلاحیت کا ثبوت دیا جائے۔

اس سلسلہ میں ”اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا“ ایک ایسا ادارہ اور تنظیم ہے جس پر ہندوستانی مسلمانوں، بالخصوص طبقہ علماء اور دینی غیرت و فکر رکھنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو فخر اور فخر سے زیادہ خدا کا شکر کرنے کا حق حاصل ہے، یہ ایک خالص تعمیری و فکری، علمی اور فقہی تنظیم اور اجتماعیت ہے جس میں ملک کے ممتاز، صحیح العقیدہ و صحیح الفکر اور وسیع العلم علماء اور کارکن شامل ہیں۔

راقم الحروف کو گذشتہ سال (۱۴۱۰ھ) میں تیسرے فقہی سمینار میں شرکت کی سعادت و مسرت حاصل ہوئی تھی جو بنگلور میں دارالعلوم سبیل الرشاد میں منعقد ہوا تھا اور وہاں مقالہ پڑھنے کی بھی عزت حاصل ہوئی تھی، اب چوتھا فقہی سمینار دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کے زیر اہتمام اگست کے دوسرے ہفتے میں منعقد ہو رہا ہے۔ راقم اپنی بعض مجبوریوں اور طبعی معذوریوں کی بنا پر شرکت سے مسرور و مفتخر نہیں ہو سکے گا، اس محرومی اور کوتاہی کی تلافی میں یہ چند سطور لکھ کر بھیج رہا ہے، جو اگر مناسب ہوگا تو سمینار میں پڑھ کر سنادی جائیں گی، ان سطور کو ایک قدیم عرب ادیب کے اس بلیغ جملہ پر ختم کرتا ہے کہ:

” يعز عليّ أن ينوب قلمي عن قدمي“۔



## حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب

عنایت فرمایم حضرت مولانا رضوان القاسمی صاحب! زید اخلاصکم

(اللہم علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ)

جناب کا مکتوب گرامی، چوتھا فقہی سمینار کے سلسلہ میں پرسوں باعث شرف ہوا، اللہ عزوجل کی مشیت میری طبیعت عید اضحیٰ کی نماز کے بعد سخت خراب ہوگئی۔ اللہ ارحم الراحمین کے فضل و کرم سے رو بہ صحت ہوں، لیکن اب بھی ضعیفی و کبرسنی کی وجہ سے اتنا ضعف ہے کہ مدرسہ کی مسجد چند قدم کے فاصلہ پر ہے، اس کی حاضری بھی بہ تکلف کرنی پڑتی ہے۔ قابل سفر نہیں ہوں، اس لئے حاضری سے معذور فرمایا جائے، خدا کرے حاضرین علماء کرام اس فقہی سمینار کو کامیاب فرمائیں، احکام کے جن فقہی جزئیات پر قیاس کر کے رائے قائم کی جائے وہاں اس پر پورا دھیان دیا جائے کہ فقہاء کرام رحمہم اللہ اجمعین نے جس جزئیہ کا حکم لکھا ہے وہ جزئیہ و مسئلہ کی خاص علت ہے، وہ علت بھی اس جزئیہ میں پائی جاتی ہے کہ نہیں؟ اس طرح مسئلہ کی حقیقت واضح ہو کر سامنے آئے گی۔ دست بہ دعا ہوں کہ اللہ عزوجل اس فقہی سمینار کو ہر طرح کامیاب فرمائیں اور باعث خیر و برکت ثابت فرمائیں۔

بحرمة سيد المرسلين صلى الله عليه وآله وأصحابه أجمعين۔ بقیہ حالت موجب شکر خدا ہے۔

احقر العباد عبدالرحمن عفی عنہ

امیر شریعت امارت شرعیہ بہار واڑیسہ

ناظم تعلیمات و مہتمم انجمن معاونین مدرسہ حمید یہ گودنا، سارن

۱۴ محرم الحرام ۱۴۱۲ھ

حضرت مولانا محمود حسن صاحب دامت برکاتہم

مکرم و محترم - زید مجدکم!

(اللہم علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ)

یاد فرمائی کا بہت بہت شکریہ۔ یہ عاصی پر معاصی گونا گوں امراض کے باعث سفر کے قابل نہیں، اور اس قسم کے مسائل سے کوئی مناسبت بھی نہیں رکھتا، اس لئے کبھی شرکت کی نوبت نہیں آئی۔ اب بھی معذرت خواہ ہے، دعاء ضرور کرتا ہے، اس کے لئے اہلیت بھی شرط نہیں۔ سمیع و بصیر سب کی سنتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ صحیح نتائج مرتب فرمائے۔

فقط والسلام

املاہ العبد محمود غفرلہ

مسجد چھتہ، دیوبند ۱۲/۱/۲۰۱۲ھ

حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب مدظلہ العالی

مکرم و محترم زید مجدکم

(اللہم علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ)

بندہ کو کمزوری بہت زیادہ ہے، یہاں تک کہ برابر کمرہ کے وضو خانہ ہے وہاں بھی پکڑ کر جانا ہوتا ہے، نماز کمرہ ہی میں پڑھنا ہوتا ہے۔ حاضری سے معذوری ہے۔ اللہ تعالیٰ مدعائے خیر کو بخیر کامیاب فرمائیں۔

## حضرت مولانا صدیق احمد صاحب باندوی

مکرمی زید مجرم

(السلام علیکم ورحمۃ اللہ)

سمینار کا علم پہلے سے ہے، اللہ پاک ہر اعتبار سے کامیاب فرمائے، اور تمام کارکنان کی عمر میں برکت عطا فرمائے، خصوصاً جناب قاضی مجاہد الاسلام مدظلہ کی تمام شرور و فتن سے حفاظت فرمائے۔

میں اپنی مجبوری کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکوں گا۔ انشاء اللہ مدرسہ سے مفتی عبید اللہ صاحب، مفتی زید صاحب حاضر ہوں گے۔ اپنے لڑکے نجیب کو بھی تیار کر رہا ہوں، آپ تمام حضرات کے لئے دعا کر رہا ہوں۔

احقر صدیق احمد غفرلہ

جامعہ عربیہ ہتھورا، باندہ، یوپی

۱۰/محرم الحرام ۱۴۱۲ھ

## حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی صاحب

مکرمی و محترمی مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب! زید مجرم

(السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ)

اسلامک فقہ اکیڈمی کے تحت چوتھا فقہی سمینار آپ کے یہاں منعقد ہونا طے ہوا ہے، یہ مسرت و خوشی کی بات ہے اور بالکل بر محل ہے، آپ کا ادارہ الحمد للہ سنجیدگی کے ساتھ اسلامی تعلیم و تحقیقات کے راستہ میں اچھے انداز میں گامزن ہے، اللہ تعالیٰ اس سمینار کو جو آپ کے انتظام میں منعقد ہونے جا رہا ہے زیادہ سے زیادہ کامیابی عطا فرمائے، آپ نے مجھ کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی ہے آپ کے اس پاس تعلق کا مشکور ہوں، اور اس میں شرکت کے بہانہ سے آپ کے ادارہ میں آنے اور کچھ وقت گزارنے کی خوشی ہوتی، لیکن ان تاریخوں کے ارد گرد یہاں مصروفیت بڑھی ہوئی ہے، اور اس کے ہفتہ عشرہ بعد شاید باہر کا ایک سفر بھی ہو، یہ دشواریاں ہیں جن کے باعث شرکت میں رکاوٹ پڑ سکتی ہے، حالات کا اندازہ کر کے کوئی رائے قائم کر سکوں گا، اگر دشواریوں کے باعث حاضری نہ ہو سکے تو امید ہے کہ معذور سمجھیں گے اور کچھ خیال نہ فرمائیں گے۔ خدا کرے آپ اور تمام رفقاء خیر و عافیت سے ہوں۔

والسلام

محمد رابع حسنی ندوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۰/۱۲/۱۴



جدید فقیہی تحقیقات

دوسرا باب

مسئلہ انشورنس





## اکیڈمی کا فیصلہ:

### ہندوستان کے پس منظر میں انشورنس کا مسئلہ

ہندوستان کے موجودہ حالات اور مسلمانوں کو درپیش ہر آن جان اور مال کے خطرے کو سامنے رکھتے ہوئے جان و مال کے تحفظ اور قیام امن کے سلسلہ میں حکومت کی ذمہ داریوں اور بسا اوقات نہ صرف غفلت بلکہ حکومت کے عملہ کی طرف سے فسادات کی ہمت افزائی اور بعض اوقات اس میں شرکت اور پھر مسلمانوں کے جان و مال کو بچانے والے نقصانات کی تلافی میں حکومت کی طرف سے کوتاہی اور اس وجہ سے کہ وہ ہندوستان کی انشورنس کمپنیاں بالواسطہ یا بلاواسطہ حکومت سے ہی متعلق ہیں، ان ہی حالات کی روشنی میں ”مجمع الفقہ الاسلامی“ کے چوتھے سمینار منعقدہ مورخہ ۲۷ تا ۳۰ محرم ۱۴۱۲ھ مطابق ۹ تا ۱۲ اگست ۱۹۹۱ء بمقام دارالعلوم سنیل السلام حیدرآباد میں غور کیا گیا تھا۔

شرکاء سمینار کا عام رجحان یہ تھا کہ ان حالات میں مسلمانوں کے لئے جان و مال کا بیمہ کرانا جائز قرار دینا چاہئے، لیکن دوران بحث یہ نقطہ اٹھایا گیا کہ فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں بچانے والے جانی و مالی نقصان کو بیمہ کے ذریعہ رائج انشورنس قانون کے تحت تحفظ حاصل ہے یا نہیں؟ اور مندرجہ ذیل تجویز منظور کی گئی:

” کمیٹی نے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کیا اور یہ محسوس کیا کہ انشورنس کمپنیوں کی پالیسی اس سلسلہ میں واضح نہیں ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات میں ہونے والے جانی و مالی نقصانات کو موجودہ انشورنس قانون کی رو سے تحفظ حاصل ہوتا ہے، اور اس کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس مسئلہ پر تفصیل سے غور کیا جائے اور انشورنس کے ماہرین سے مختلف اسکیموں کے بارے میں پوری معلومات حاصل جائیں، سمینار کے عام اجلاس میں کمیٹی کی اس تجویز سے اتفاق کیا گیا اور مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر ماہرین سے پوری معلومات حاصل کرنے کے بعد کوئی قطعی رائے قائم کرے:

- ۱- مولانا مجیب اللہ ندوی، اعظم گڈھ
- ۲- مولانا محمد برہان الدین سنہلی، لکھنؤ
- ۳- مولانا محمد عبید اللہ اسعدی، باندہ
- ۴- مولانا عتیق احمد بستوی، لکھنؤ
- ۵- مولانا مفتی حبیب الرحمن خیر آبادی، دارالعلوم دیوبند
- ۶- مولانا مفتی احمد خان پوری، ڈابھیل
- ۷- مولانا عبدالاحد ازہری، مالنگاؤں
- ۸- مولانا مفتی منظور احمد کانپوری، کانپور
- ۹- مولانا نظام الدین اشرفی، مبارک پور
- ۱۰- مفتی محمد ظفر الدین مفتاحی، دارالعلوم دیوبند
- ۱۱- مفتی عبدالقدوس رومی، آگرہ
- ۱۲- مولانا زبیر احمد قاسمی، حیدرآباد
- ۱۳- مفتی جنید عالم قاسمی، امارت شرعیہ، پٹنہ
- ۱۴- مولانا خلیل الرحمن اعظمی، جامعہ دارالسلام، عمرآباد

مجمع الفقہ الاسلامی کے سیمینار منعقدہ مورخہ ۳ تا ۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ مطابق ۳۰-۳۱ اکتوبر اور ۲-۱ نومبر ۱۹۹۲ء بمقام جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کے موقع پر اس سلسلہ میں ضروری معلومات اور ان پر غور کر کے کوئی قطعی فیصلہ کرنے کے سلسلہ میں کمیٹی مذکور کے موجودہ ارکان اور مزید دیگر علماء پر مشتمل ایک کمیٹی نے پوری صورت حال پر غور کیا، اور خاص کر انشورنس کے قانون کی اس دفعہ پر غور کیا گیا جس سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ فسادات کی صورت میں جان و مال کو بچانے والے نقصانات کو تحفظ نہیں مل سکتا، لیکن اس سلسلہ میں ”لائف کارپوریشن آف انڈیا“ کی جاری کردہ تفصیلات پر غور کرنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اس اعلامیہ کی دفعہ (۱۰) شق (III A. B.) میں فرقہ وارانہ فسادات سے بچانے والے نقصانات کا استثناء دراصل دفعہ ۱۰ سے حاصل ہونے والی ان مراعات سے استثناء ہے جن کے تحت حادثاتی موت کی صورت میں اصل انشورنس پالیسی پر مستزاد اضافی رقم دی جاتی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ عام طور پر حادثاتی موت میں اصل انشورنس پالیسی سے زائد رقم دیے جانے کا پروویژن فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں بچانے والے جانی اور مالی نقصانات کو شامل نہیں ہوگا، یعنی اس صورت میں انشورنس پالیسی پر اضافی رقم نہیں ملے گی، لیکن چینی بھرانشورنس پالیسی ہے جیسے دیگر عام جانی و مالی نقصانات میں ملتی ہے اسی طرح اس میں بھی ملے گی، اس نقطہ کے واضح ہوجانے کے بعد ”مجمع الفقہ الاسلامی“ کی یہ کمیٹی (مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ نے ۱۹۶۰ء میں انشورنس کے سلسلہ میں جو فیصلہ کیا تھا، نیز ملک کی مؤقر درسگاہ ”دارالعلوم دیوبند“ سے اس بابت جو فتویٰ دیا جا چکا ہے) مجلس کے فیصلے اور دارالعلوم کے فتویٰ کو مد نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل قطعی فیصلہ کرتی ہے:

”مروجہ انشورنس اگرچہ شریعت میں ناجائز ہے کیونکہ وہ ربوہ، قمار، غر جیسے شرعی طور پر ممنوع معاملات پر مشتمل ہے، لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں جبکہ مسلمانوں کی جان و مال، صنعت و تجارت وغیرہ کو فسادات کی وجہ سے ہر آن شدید خطرہ لاحق رہتا ہے، اس کے پیش نظر ”الضرورات تبيح المحظورات“ رفع ضرر، دفع حرج اور تحفظ جان و مال کی شرعاً اہمیت کی بنا پر ہندوستان کے موجودہ حالات میں جان و مال کا بیمہ کرانے کی شرعاً اجازت ہے (۱)۔“

۱- واضح رہے کہ فقہ اکیڈمی کی طرف سے یہ تجویز اور سیمینار میں شریک اہل علم کی طرف سے اس کی تائید کا یہ مطلب نہیں کہ انشورنس مسلمانوں کی حفاظت کا ضامن ہے، اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس انشورنس کے بعد جو بھی صورت پیش آئے اس میں ملنے والی سب رقم انشورنس کرانے والوں کے لئے جائز و درست ہوگی، بلکہ اس میں تفصیل ہے اور وہ یہ کہ صرف فسادات کی صورت میں جان و مال کے نقصان کے بعد جو کچھ ملے اور جو حق قانون و ضابطہ میں بتایا جائے، اس کے مطابق ملنے والا مال تو انشورنس کرانے والوں کے لئے جائز و درست ہوگا اور بقیہ صورتوں میں صرف اپنی جمع کردہ رقم کے بقدر لینا اور استعمال کرنا جائز ہوگا، زائد کا نہیں۔ اور انشورنس کی صورت میں زائد کے جواز کی جہت حکومت کی نااہلی اور غیر ذمہ داری کی وجہ سے اس کی طرف سے اور اس پر ضمان کی ہے۔

## سوالنامہ

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی ☆

ادھر خصوصیت کے ساتھ جو صورت حال پورے ملک میں پیدا ہو رہی ہے اور فرقہ پرست قوتوں نے جس طرح پورے ملک میں نفرت کا زہر پھیلا دیا ہے اور جس طرح مسلمانوں کی نسل کشی کی جارہی ہے اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو ہر وقت خطرہ میں ہے، خاص کر ان کی صنعت و تجارت کو تباہ کر کے معاشی طور پر ان کی کمر توڑنے کی کوشش کی جارہی ہے، اس صورت حال کے پیش نظر کیا مسلمانوں کو اس بات کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ جان و مال کا انشورنس کرا سکیں؟۔

۱- کیا آپ کے نزدیک فقہی نقطہ نظر سے جان و مال کے عمومی خطرہ کو دیکھتے ہوئے اسے ضرورتِ شدیدہ یا حاجت کا درجہ دیا جاسکتا ہے؟، جسے فقہاء بہ درجہ ضرورت (الحاجة قد تتنزل منزلة الضرورة) تسلیم کرتے ہیں۔

۲- اور موجودہ حالات میں یہ دیکھتے ہوئے کہ کہاں کب کیا ہو جائے گا کہنا مشکل ہے، کیا اسے عمومی ملتی ضرورت تسلیم کیا جاسکتا ہے جس کی روشنی میں مسلمانوں کو اپنی زندگی اور اپنی تجارت کے انشورنس کرانے کا مشورہ دیا جائے؟۔

☆ سابق سکریٹری جنرل اسلامک فٹھ اکیڈمی (انڈیا)

۳- ہندوستان میں انشورس کمپنیاں عام طور پر سرکاری ہوتی ہیں، کیا اس صورت حال سے حکم مسئلہ پر کچھ فرق پڑے گا؟-

اس مسئلہ میں ”مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ“ نے اپنے اجتماع (منعقدہ مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۶۵ء) میں مختلف علماء کے جوابات پر غور کرتے ہوئے ایک فیصلہ کیا تھا، اس فیصلہ پر مولانا شاہ معین الدین صاحب مرحوم، مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی صاحب، مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا سید فخر الحسن مرحوم صدر مدرس دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا محمد اویس ندوی، مولانا شاہ عون احمد قادری، مولانا ابواللیث ندوی اور مولانا اسحاق سندیلوی نے دستخط کئے تھے۔ اس تجویز کی نقل منسلک کی جا رہی ہے۔

واضح رہے کہ زیر بحث مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ”انشورس“ کرانا جائز ہے یا ناجائز، اس وقت قابل توجہ بات صرف یہ ہے کہ اسے ناجائز تصور کرتے ہوئے فقہی ضرورت، یا حاجت شدیدہ کی بنیاد پر اس عمل کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟۔ نیز یہ کہ موجودہ حالات میں جان و مال کا جو خطرہ مسلمانوں کو درپیش ہے وہ آپ کے نزدیک اس فقہی ضرورت، یا حاجت بہ منزلہ ضرورت کے ضمن میں داخل ہے یا نہیں؟



## تجویز مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ

مجلس تحقیقات شرعیہ نے اپنے اجتماع (مؤرخہ ۱۵/۱۶ دسمبر ۱۹۶۵ء) میں انشورنس کے مسئلہ پر علماء کرام کے ان جوابات کی روشنی میں غور کیا جو مجلس کے سوالنامہ کے پیش نظر ان حضرات نے تحریر فرمایا تھا، اس غور و خوض کے بعد مجلس جس نتیجہ پر پہنچی ہے وہ ایک مختصر تمہید کے ساتھ درج ذیل ہے:

انشورنس کا مسئلہ شریعت کے شعبہ معاملات سے تعلق رکھتا ہے، معاملات میں ہمیشہ دو فریق ہوتے ہیں، اس لئے اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

اول: دونوں فریق مسلمان ہوں، اس صورت میں معاملات کی جو شکلیں شریعت اسلامیہ نے مقرر کی ہیں، ان کے علاوہ کسی شکل کا اختیار کرنا، کسی حال میں جائز نہیں۔  
دوم: ایک فریق مسلمان ہو اور دوسرا غیر مسلم ہو، صورت دوم کی دو شکلیں نکلتی ہیں:  
الف: معاملہ کی شکل مقرر کرنا مسلمان کے اختیار میں ہو، اس کا حکم بھی وہی ہے جو صورت اول کا ہے۔

ب: معاملہ کی شکل مقرر کرنا اس کے (مسلمان کے) اختیار میں نہ ہو، صورت ثانیہ کی شکل (ب) میں بوقت ضرورت اسلام کے بعض جلیل القدر ائمہ و فقہاء کے قول کی بناء پر شرعاً اس کی گنجائش نکلتی ہے کہ مسلمان کچھ قیود و شرائط کے ساتھ اس نوع کے معاملات میں حصہ لے سکتے ہیں۔

مجلس یہ رائے رکھتی ہے کہ اگرچہ انشورنس کی سب شکلوں کے لئے ”ربوا اور قمار“ (سود اور جو) لازم ہے، اور ایک کلمہ گو کے لئے ہر حال میں اصول پر قائم رہنے کی کوشش کرنا ہی

واجب ہے، لیکن جان و مال کے تحفظ و بقا کا جو مقام شریعتِ اسلامیہ میں ہے مجلس اسے بھی وزن دیتی ہے، نیز مجلس صورتِ حال سے بھی صرف نظر نہیں کر سکتی کہ موجودہ دور میں نہ صرف ملکی، بلکہ بین الاقوامی ریاستوں سے انشورنس انسانی زندگی میں اس طرح ذخیل ہو گیا ہے کہ اس کے بغیر اجتماعی اور کاروباری زندگی میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں اور جان و مال کے تحفظ کے لئے بھی بعض حالات میں اس سے مفر ممکن نہیں ہوتا، اس لئے ضرورتِ شدیدہ کے پیش نظر اگر کوئی شخص اپنی زندگی، یا اپنے مال، یا اپنی جائداد کا بیمہ کرائے تو مذکورہ بالا ائمہ کرام کے قول کی بنا پر شرعاً اس کی گنجائش ہے۔

**تنبیہ:** اوپر کی عبارت میں لفظ ”ضرورتِ شدیدہ“ سے مراد یہ ہے کہ جان، یا اہل و عیال، یا مال کے ناقابل برداشت نقصان کا اندیشہ قوی ہو۔ ”ضرورتِ شدیدہ“ موجود ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ مجلس کے نزدیک مبتنی بہ (جو شدید دشواریوں میں مبتلا ہو کر بیمہ کرانا چاہتا ہے) کی رائے پر منحصر ہے، جو خود کو عند اللہ جواب دہ سمجھ کر علماء کے مشورہ سے قائم کرے۔



## چند اہم سوالات:

موجودہ عہد میں جو معاملات بہت کثرت کے ساتھ رائج ہیں، ان میں سے ایک اہم معاملہ بیمہ (انشورنس) کا ہے، جیسے جیسے دنیا میں آمدورفت کے وسائل نے ترقی پائی، باہمی رابطہ بڑھا، بین الاقوامی تجارت کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ خاص کر بحری سفر میں تجارتوں کو دور دور تک پھیلنے اور بڑھنے کا موقع دیا، ایک ملک کی صنعتی اور غذائی پیداوار دوسرے ملکوں کو جانے لگی، ان چیزوں کا مجموعی اثر دنیا کی صنعت و تجارت اور معاش پر خوشگوار پڑا، لیکن ساتھ ہی ساتھ دور دراز ممالک کے اسفار اور سمندری سفروں کے خطرات میں بھی اضافہ ہوا، جس کا اثر یہ پڑا کہ کبھی کبھی کسی شخص کی پوری پونجی ضائع ہو جاتی ہے، اور وہ شخص مفلس ہو جاتا ہے، اس طرح کے خطرات کے تحفظ کے لئے بعض تدبیریں اختیار کی گئیں۔ مثلاً کتب فقہ میں ”سوکرہ“ کا ذکر ملتا ہے، جس کی صورت شامی نے ان الفاظ میں لکھا ہے:

”جرت العادة أن التجار إذا استأجروا مركبا من حربي يدفعون له أجرته ويدفعون أيضا مالا معلولا لرجل حربي مقيم في بلاده يسمي ذلك المال ”سوكره“ على أنه مهما هلك من المال الذي في المركب بحرق أو غرق أو نهب أو غيره، فذلك الرجل ضامن بمقابلة ما يأخذه منهم، وله وكيل عنه مستامن في دارنا يقيم في بلاد السواحل الإسلامية بإذن السلطان يقبض من التجار مال السوكره وإذا هلك من مالهم في البحر شئى يؤدى ذلك المستامن للتجار بدله تماما“ (شامی ۲۳۹/۳-۲۵۰)۔

(یعنی سمندری اسفار میں تجارتی مال بھیجنے والے تاجر کسی ایسے فرد کو ایک معین رقم ادا کر کے جو اس ملک میں اپنے کسی ایجنٹ کے ذریعہ رقم وصول کرتا اور خدا نخواستہ اگر سمندری سفر میں کسی وجہ سے مال تجارت ضائع ہو جاتا تو اس کا مکمل معاوضہ وہ شخص اپنے ایجنٹ کے ذریعہ تاجر کو ادا کرتا)۔

شامی نے اس کے جواز و عدم جواز پر بحث کی ہے، اس بحث سے قطع نظر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مال تجارت کو پیش آنے والے خطرات سے تحفظ کے لئے بیمہ کی ایک خاص شکل اس عہد میں رائج تھی۔

یہی صورت تجارت کی وسعت و خطرات کی زیادتی کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی چلی گئی اور آج معاشی نظام میں بیمہ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے اور قومی و بین الاقوامی تجارت میں شاید ہی کوئی ایسا معاملہ ہو جس میں ”انشورنس“ کو اختیار نہ کیا گیا ہو، بلکہ اب اشخاص اور ذمہ داریوں کے بیمہ کا بھی رواج پڑ گیا ہے، اور بیمہ ایک مرتب قانونی نظام کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، جو صورتیں بیمہ کی رائج ہیں ان میں ایک صورت ”بیمہ زندگی“ بھی ہے، یعنی ایک شخص بیمہ کمپنی کو متعین اقساط ان شرطوں پر ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے کہ ایک محدود مدت کے اندر اگر خدا نخواستہ اس کی موت واقع ہو جائے تو بیمہ کمپنی اس کے اصل خاندان کو اس کی موت سے پہنچنے والے نقصان کی تلافی کے لئے اتنی مقدار رقم ادا کرنے کی پابند ہوگی جتنی رقم کا بیمہ کرایا گیا ہے، اور اگر بیمہ کرانے والا وہ متعین مدت گزار لیتا ہے اور زندہ رہتا ہے تو وہ اپنی جمع کردہ رقم سود کے ساتھ بیمہ کمپنی سے پانے کا حق دار ہوگا۔

اسی طرح کسی جسمانی نقصان کا بھی بیمہ کرایا جاسکتا ہے، یعنی اگر متعین مدت تک اس کے ہاتھ پیر و دیگر اعضاء سلامت رہیں تب تو وہ اپنی جمع کردہ رقم کی واپسی کا مستحق ہوگا اور اگر کوئی حادثہ پیش آ گیا اور اس انسان کے جسم کا کوئی حصہ متاثر ہو کر ناکارہ ہو گیا تو اس عضو کے ناکارہ ہو جانے سے اس انسان کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کے لئے بیمہ کمپنی اتنی رقم ادا کرنے کی پابند ہوگی جتنے پر بیمہ ہوا ہے۔

دوسری صورت املاک کے بیمہ کی ہے، یعنی مکان و دکان اور تجارتوں وغیرہ کا بیمہ، کہ کوئی شخص ایک متعین رقم بیمہ کمپنی کو دیتے رہنے کی ذمہ داری اس شرط کے ساتھ لیتا ہے کہ اگر خدا نخواستہ متعین مدت کے اندر اس کی ان املاک کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو ان کی تلافی بیمہ کمپنی



کرنے کی پابند ہوگی اور اگر کوئی نقصان نہیں ہوا تو بھی اس صورت میں وہ جمع کی ہوئی رقم واپس نہیں ہوگی، یعنی بیمہ کرانے والا اصلاً کسی ملنے والی رقم کے معاوضہ میں قسط ادا نہیں کرتا، بلکہ متوقع خطرہ کے نتیجے میں پہنچنے والے امکانی نقصان کی تلافی کی وجہ سے جو تحفظ و اطمینان وہ حاصل کرتا ہے، لہذا انشورنس کی اس صورت میں اپنی جمع کی ہوئی رقم پالیسی لینے والے کو واپس نہیں ملتی۔

بیمہ کی تیسری صورت ذرائع نقل و حمل کا ایسا بیمہ ہے کہ جس کے ذریعہ کسی حادثہ کی صورت میں ضائع ہونے والی سواری یا اس کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی کی جاتی ہے، اسی طرح ڈرائیور کو کوئی نقصان جانی یا جسمانی پہنچ جائے تو اس کی تلافی کی جاتی ہے، اسی ذیل میں کسی حادثہ کے نتیجے میں کار یا ٹرک کے مالک پر کار یا ٹرک کے ذریعہ کسی دوسرے شخص کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی کرنا بھی شامل ہے، ان صورتوں میں جو اقساط ادا کی جاتی ہیں خدا نخواستہ وہ خطرہ پیش آگیا جس کے لئے بیمہ کرایا گیا ہے تو بیمہ کمپنی اس کی تلافی کرنے کی پابند ہے اور اگر کوئی خطرہ پیش نہیں آیا تو پالیسی لینے والا اپنی دی ہوئی رقم واپس لینے کا حق دار نہیں ہوگا۔

بعض صورتیں بیمہ کی ایسی بھی مروج ہیں جن میں سمندری، ہوائی یا بری نقل و حمل کے ذریعہ مال تجارت ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا جاتا ہے اور کبھی قیمتی دستاویزات بذریعہ ڈاک یہاں سے وہاں بھیجی جاتی ہیں، اور ان صورتوں میں اجرت نقل و حمل کے علاوہ کچھ زائد رقم ادا کی جاتی ہے کہ بہ صورت ذرائع ہوں، اس مرحلہ مال کے وہ کمپنی یا ڈاکخانہ اتنی رقم ادا کرنے کا پابند ہوگا، جتنی رقم کا بیمہ کرایا گیا ہے۔

غرض یہ کہ بیمہ نے انسانی زندگی میں اتنا اثر و نفوذ پیدا کیا ہے کہ روزانہ قسم قسم کے خطرات پیدا ہو رہے ہیں اور چھوٹے بڑے خطرات سے پہنچنے والے امکانی نقصانات کی تلافی کے لئے بیمہ کی صورت اختیار کرنے کا رواج تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔

”بیمہ زندگی“ ہو یا ”بیمہ املاک“ یا دوسری مروجہ صورتیں جو بیمہ کمپنی کے ذریعہ اختیار کی جاتی ہیں تقریباً جملہ علماء امت اس کے ناجائز ہونے پر متفق نظر آتے ہیں اور اصولی طور پر اسے

نادرست قرار دیتے ہیں، بعض خاص صورتوں کا استثنائی قواعد کی روشنی میں جواز بھی علماء کے یہاں ملتا ہے، مثلاً سرکاری قانون کے تحت سرکاری ملازمین کا بیمہ زندگی، یا گاڑیوں کا بیمہ، یا بین الاقوامی منڈیوں میں مال بھیجنے کے لئے مال کا انشورنس ہونا اگر قانوناً لازم کر دیا گیا ہے تو علماء اس قانونی لزوم کو ایک طرح کا جبر قرار دے کر مجبوری کی حالت میں اس طرح کے انشورنس کی اجازت دیتے ہیں، یعنی ان لوگوں کو اس عمل میں معذور قرار دیتے ہیں۔

بیمہ کے مسئلہ میں علماء کی آراء کو پیش نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل چند سوالات پیدا

ہوتے ہیں:

۱- ہندوستان کے موجودہ حالات میں جبکہ مسلمانوں کے جان و مال محفوظ نہیں ہیں اور ہر لمحہ ان کی جان، ان کا مال، ان کی تجارت، ان کی صنعت، ان کے مکانات اور ان کی مساجد نیز مدارس خطرہ میں ہیں اور بسا اوقات اس طرح کے واقعات میں حکومت کی غفلت، یا اس کے جانبدارانہ رویہ کو دخل ہوتا ہے، حالانکہ حکومت شہریوں کے جان اور مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہے، ایسے واقعات کے پیش آجانے کی صورت میں بچی کھچی نسل کے لئے اور ان لوگوں کے لئے جو زندہ تو رہ گئے ہیں لیکن ان کی املاک تباہ ہو چکی ہیں، تجارتیں اور صنعتیں برباد ہو چکی ہیں، نئے سرے سے زندگی کا شروع کرنا دشوار امر ہوتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ جبکہ آج کی بیمہ کمپنی عام طور پر سرکاری نظم کے تحت چلتی ہے اور حکومت نے انھیں قومیا لیا ہے، لہذا اس کے نفع و نقصان کی ذمہ داری حکومت کی طرف لوٹی ہے تو کیا مسلمانوں کے لئے یہ جائز ہوگا کہ وہ اپنی زندگی، اپنی تجارت، اپنی صنعت اپنے مکانات اور اپنی مساجد کا بیمہ کرائیں تاکہ خدا نخواستہ اگر کوئی نقصان ان کو پہنچ جائے تو اس نقصان کی تلافی اور جان و مال کا معاوضہ بیمہ کمپنی سے وصول کر لیں۔ اس میں اولاً تو اگر زیادہ تعداد میں مسلمان جان و مال کا بیمہ کرائیں گے تو ایسی امید کی جاتی ہے کہ سرکاری ایجنسی جو امن قائم کرنے کی ذمہ دار ہے وہ فسادات کو روکنے کی زیادہ کوشش کرے گی کہ مسلمانوں کو بچانے والے جانی و مالی نقصان کی تلافی سرکار ہی کو کرنی پڑے گی، دوسری طرف

خدا نخواستہ کوئی واقعہ پیش آ ہی جائے تو مسلمانوں کو اتنی رقم مل جائے گی کہ وہ ان واقعات سے پہنچنے والے نقصانات کی تلافی کر سکیں، اور اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے لائق ہو سکیں، اس طرح فساد کرانے والی قوتوں کا وہ نشانہ اور وہ مقصد پورا نہیں ہوگا کہ مسلمانوں کی کمر معاشی طور پر توڑ دی جائے اور ان کو ذہنی طور پر مرعوب کر کے غلامی کی زندگی پر راضی رہنے پر مجبور کیا جائے۔ اس طرح کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض علماء نے ہندوستان کے خاص پس منظر میں انشورنس کے جواز کی رائے دی ہے، چنانچہ ”مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ“ نے (دسمبر ۱۹۶۵ء) میں انشورنس کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ:

مجلس یہ رائے رکھتی ہے کہ اگرچہ انشورنس کی سب شکلوں کے لئے ربوا و قمار (سود اور جوا) لازم ہے اور ایک کلمہ گو کے لئے ہر حال میں اصول پر قائم رہنے کی کوشش کرنا ہی واجب ہے، لیکن جان و مال کے تحفظ و بقا کا جو مقام شریعت اسلامیہ میں ہے، مجلس اسے بھی وزن دیتی ہے، نیز مجلس اس صورت حال سے بھی صرف نظر نہیں کر سکتی کہ موجودہ دور میں نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی ریاستوں سے انشورنس انسانی زندگی میں اس طرح ذخیل ہو گیا ہے کہ اس کے بغیر اجتماعی اور کاروباری زندگی میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں اور جان و مال کی تحفظ کے لئے بھی بعض حالات میں اس سے مفر ممکن نہیں ہوتا، اس لئے ضرورت شدیدہ کے پیش نظر اگر کوئی شخص اپنی زندگی یا اپنے مال یا اپنی جائداد کا بیمہ کرائے تو مذکورہ بالا ائمہ کرام (جن سے امام صاحب وغیرہ دارالحدیث کی نسبت سے مراد ہیں) کے قول کی بناء پر شرعاً اس کی گنجائش ہے۔

اوپر کی عبارت میں لفظ ضرورت شدیدہ سے مراد یہ ہے کہ جان، یا اہل و عیال یا مال کے ناقابل برداشت نقصان کا اندیشہ قوی ہو، ”ضرورت شدیدہ“ موجود ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ مجلس کے نزدیک مبتنی ہے جو (شدید دشواریوں) میں مبتلا ہو کر بیمہ کرانا چاہتا ہے) کی رائے پر منحصر ہے، جو خود کو عند اللہ جواب دہ سمجھ کر علماء کے مشورہ سے قائم کرے۔

اسی طرح مفتی عبدالرحیم صاحب لاہوری نے فتاویٰ رحیمیہ (۶/۱۳۲) میں اس مسئلہ

پر بحث کرتے ہوئے بعض خاص حالات میں خاص پابندیوں کے ساتھ انشورنس کے جواز کا ذکر کیا ہے، بعض دیگر حضرات کے یہاں بھی اس طرح کی رائے مل سکتی ہے (نظام الفتاویٰ ۱۳۹۲ء، محمودیہ ۲۳۰/۲)۔

اسی ذیل میں دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ہندوستان کے مخصوص حالات کو سامنے رکھتے ہوئے جان و مال اور تجارت و صنعت کے بیمہ کرانے کی اجازت دی جائے تو پالیسی ہولڈر اگر مدت پوری ہونے سے پہلے انتقال کر جائے تو بیمہ کمپنی ادا کی ہوئی اقساط سے زائد انشورنس کی رقم ادا کرتی ہے، اب مرحوم کے وارثان کے لئے اس زائد رقم کا استعمال جائز ہوگا یا نہیں؟ اور اگر وہ اپنی مدت پوری کر لیتا ہے تو بلا اقساط جمع کی ہوئی رقم واپس ملتی ہے، اور ساتھ ہی کچھ زائد رقم بونس و منافع یا سود کے نام پر دی جاتی ہے تو اس زائد رقم کا استعمال اس شخص کے لئے جائز ہوگا یا نہیں؟ اسی ذیل میں یہ سوال جو بہت اہم اور قابل غور ہے کہ اگر بیمہ شدہ جان یا مال کی ہلاکت یا ضیاع فسادات کی صورت میں ہو جائے اور انشورنس کمپنی پالیسی ہولڈر کی طرف سے ادا کی ہوئی رقم سے زائد رقم مستحقین و متاثرین کو ضابطہ کے مطابق ادا کرے تو اس زائد رقم کو معاوضہ جان و مال کا تصور کیا جائے اور اس سے استفادہ کو درست قرار دیا جائے یا نہیں؟

بعض حضرات علماء نے ان حالات میں انشورنس کی اجازت تو دی ہے، مگر زائد رقم کے استعمال کو ناجائز لکھا ہے، سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں جبکہ اصلاً حکومت جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہے اور فسادات کی صورت میں عظیم ایشان جانی و مالی نقصان شہریوں کو پہنچتا ہے، اگر انشورنس کمپنی کے ذریعہ جو نیشنلائز ہے متاثر شہریوں کو ان کی جمع کی ہوئی رقم سے زائد رقم ملتی ہے تو اسے اس نقصان کی تلافی کیوں نہ قرار دیا جائے جس سے بچانا حکومت کی ذمہ داری تھی؟

ایک سوال یہ بھی ہے کہ ”جبری انشورنس“ کی صورت میں حکماً جواز پر تو اتفاق ہے کہ وہ ایک ضرورت اور مجبوری ہے، لیکن ایسے انشورنس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی زائد رقم کا کیا حکم ہوگا؟ جس کی ایک صورت سرکاری ملازمین کا جبری بیمہ زندگی ہے، جس کی وجہ سے ان کی تنخواہ

سے ماہ بہ ماہ ایک متعین حصہ کٹتا رہتا ہے، جیسے کہ پروویڈنٹ فنڈ کے لئے کٹتا ہے، اور حسب ضابطہ گورنمنٹ ملازمت کے اختتام پر جمع شدہ رقم مع اضافہ واپس کرتی ہے یا ملازمت کے اختتام سے پہلے حسب ضابطہ جمع کردہ اقساط مع اضافہ واپس کرتی ہے، تو دونوں صورتوں میں اس زائد رقم کا کیا حکم ہوگا، کیا اس کو پروویڈنٹ فنڈ پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس میں اصل کے ساتھ ملنے والی زائد رقم کو علماء جازز کہتے ہیں۔

جبری انشورنس کی ایک صورت کارو غیرہ، نیز تجارتی سامان کے انشورڈ کرانے کی ہے، اس میں اگر کسی وقت کوئی حادثہ پیش آنے کی وجہ سے مقررہ رقم ملتی ہے تو ادا کردہ رقم کا کیا حکم ہوگا؟ جبکہ املاک کے انشورنس میں بھی یہی ہوتا ہے کہ کوئی حادثہ پیش نہ آئے تو کچھ بھی نہیں ملتا، اگرچہ سالہا سال گزر جائیں۔

انشورنس پر گفتگو کے ذیل میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ حمل و نقل کا کام انجام دینے والی جو کمپنیاں ہیں وہ خود متعلقہ سامان کا انشورنس کریں اور اجرت سے زائد رقم لے کر یہ معاملہ کہ بہ صورت ضیاع و نقصان ہم ذمہ دار ہیں تو اس صورت میں معاملہ کرنے والی کمپنیوں سے نقصان کا معاوضہ لینے کا کیا حکم ہوگا؟ اور کیا یہ جواز ہر حال میں ہوگا یا کہ مخصوص حالات میں؟

## تفصیلی مقالات:

### انشورنس کا مسئلہ

مولانا شمس پیرزادہ ☆

انشورنس کا نظام اپنی اصل کے اعتبار سے:

انشورنس کا نظام اپنی اصل کے اعتبار سے تعاونی نظام ہے جس سے مقصود مصیبت اور حادثات کی زد میں آنے والے لوگوں کی تکلیف کو دور کرنا اور نقصانات کی تلافی میں تمام انشورنس والوں (پالیسی ہولڈرس) کو شریک کرنا ہے، تاکہ نقصان کا بار کسی ایسے شخص کو جو مصیبت، یا حادثہ کی زد میں آیا ہو، تنہا اٹھانا نہ پڑے، گویا انشورنس نقصان کی تلافی کی ایک شکل ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے:

" INSURANCE IS A DEVICE TO HANDLE RISK. ITS PRIMARY FUNCTION IS TO SUBSTITUTE CERTAINTY FOR UNCERTAINTY AS REGARDS THE ECONOMIC COST OF DISSTEROUS EVENTS. INSURENCE MAY BE DEFINED MORE FORMALLY AS A SYSTEM UNDER WHICH THE INSURER, FOR A CONSIDERATION, PROMISES TO REIMBURSE THE INSURED OR TO RENDER SERVICES TO THE INSURED IN THE EVENT THAT CERTAIN

ACCIDENTAL OCCURRENCES RESULT IN LOSSES DURING A GIVEN TIME PERIOD."(THE NEW ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA 15 th EDITION VOL. 9 P. 45)

ڈاکٹر محمد مصباح الدین اپنی کتاب ”انشورنس اینڈ اسلامک لا“ میں لکھتے ہیں:

"THE TERM INSURENCE IN ITS REAL SENSE IS COMMUNITY POOLING TO ALLEVIATE THE BURDEN OF THE INDIVIDUAL, LEST IT SHOULD BE RUINOUS TO HIM THE AIM OF ALL INSURANCE IS THUS. TO MAKE PROVISION AGAINST THE DANGERS WHICH BE SET HUMAN LIFE AND DEALINGS.

(INSURANCE & ISLAMIC LAW. P.3)

اور یہ بھی واقعہ ہے کہ فائر انشورنس کا آغاز اس وقت ہوا جبکہ لندن میں ۱۹۶۶ء میں تیرہ ہزار مکانات اور ایک سو کینسائیں آگ کی زد میں آکر تباہ ہو گئی تھیں۔

ڈاکٹر غریب الجمال ”انشورنس“ کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

”ويمكن تعريفه بأنه نظام تعاقدى يقوم على أساس المعاوضة غايته التعاون على ترميم أضرار المخاطر الطائرة بواسطة هيئات منظمة تزاوّل عقود بصورة فنية قائمة على أسس وقواعد إحصائية“ (التأمين ۲۰۸)۔

واضح ہوا کہ انشورنس تعاون کی ایک منظم شکل ہے۔

اور جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ اسلام معاشرہ کی تشکیل تعاون و تکافل کی بنیاد پر کرتا ہے، اس لئے انشورنس کا معاملہ اپنی اصل کے اعتبار سے اسلام کے اس اعلیٰ مقصد سے گہری مناسبت رکھتا ہے۔

انشورنس وقت کی ایک اہم ضرورت ہے:

انشورنس نہ کھیل (لعب) ہے اور نہ کسی فاسد غرض کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آیا

ہے، بلکہ وہ تمدنی تجارتی اور معاشی تقاضوں کے تحت ابھرا ہے، اگر انشورنس کے نظام کو بالکل ختم کر دیا جائے تو تجارت اور معیشت کے میدان میں بڑی رکاوٹیں کھڑی ہو جائیں گی، مثال کے طور پر درآمد و برآمد کا کاروبار، موٹر اور ہوائی جہاز وغیرہ کے حادثات کی زد میں آنے والوں کو معاوضہ دینے کا مسئلہ، آتشزدگی کی صورت میں نقصان کی تلافی کا مسئلہ وغیرہ، اور چونکہ انشورنس اقتصادیات میں اہم رول ادا کرتا ہے، اس لئے موجودہ دور میں اس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

### انشورنس کا موجودہ نظام:

انشورنس کا موجودہ نظام اپنی اصل کے اعتبار سے تو صحیح ہے، لیکن اس میں فاسد اجزاء بھی شامل ہو گئے ہیں، مثلاً سودی معاملات، چنانچہ پالیسی ہولڈروں سے جو روپیہ وصول ہوتا ہے اس کو گورنمنٹ سیکورٹیز وغیرہ میں لگایا جاتا ہے جس سے سود کی آمدنی ہوتی ہے، مثال کے طور پر لائف انشورنس کارپوریشن کو جیسا کہ اس کی مطبوعہ سالانہ رپورٹ بابت (۸۹-۱۹۸۸ء) سے ظاہر ہوتا ہے، سود، ڈویڈنڈ (منافع) اور رینٹ (کرایہ) کی مد میں اٹھارہ ارب، چوراسی کروڑ بیاسی لاکھ روپیہ وصول ہوا، اس میں سود کی رقم کا کم سے کم تخمینہ لگایا جائے تب بھی وہ اربوں ہی میں ہوگا، لہذا انشورنس کا موجودہ نظام حرام چیزوں سے پاک نہیں ہے۔ تاہم اسے قمار (جوا) قرار دینا صحیح نہیں ہے، کیونکہ جوئے کا تعلق محض بخت و اتفاق سے ہے، جبکہ انشورنس کا تعلق حادثات سے ہے جن میں مصیبت زدگان کی مدد کی جاتی ہے جو انسانیت کا بھی تقاضہ ہے اور موجودہ زمانہ کے اقتصادی و معاشی حالات کا بھی، جوئے میں آدمی خطرہ میں پڑتا ہے جبکہ انشورنس خطرات کو دور کرنے اور نقصان کی صورت میں تلافی کا سامان کرتا ہے، گویا یہ مستقبل کے لئے احتیاط کی صورت ہے، اس لئے اسے قمار نہیں قرار دیا جاسکتا۔

انشورنس کے نظام کو غرر (دھوکہ) قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ علمی بنیادوں پر



قائم ہے اور اس میں اعداد و شمار کو بڑا دخل ہے، اگر قدرے غرر اور جہالت ہو بھی تو اسے ضرورۃً نظر انداز کیا جاسکتا ہے:

”نہی عن بیع الثمار علی أشجارها قبل أن یبدو صلاحها.... وجوز بیعها بعد ذلك مع أنها فی بیعها بعد ذلك نوع غرر و جهالة أقل مما قبله. فدل علی أن هذا القدر من الغرر لا یضر، لأن القدر الطبعی الموجود فی كثير من تصرفات الناس و معاملاتهم“ (الاقتصاد الاسلامی / ۴۰۴)۔

انشورنس ایک نیا معاملہ ہے:

انشورنس باہمی تعاون کی ایک نئی شکل ہے اور معاملات (عقود) میں ایک نئے معاملہ (عقد) کا اضافہ ہے، اس لئے اس کے حسن و قبح پر اسی حیثیت سے غور کرنا چاہئے۔ معاملات کی جو شکلیں نزول قرآن کے زمانہ میں رائج تھیں، کوئی وجہ نہیں کہ ان اشکال پر کسی نئی شکل کے اضافہ کو روانہ سمجھا جائے، زمانہ اور حالات کے تقاضے سے معاملات کی نئی شکلیں وقوع میں آسکتی ہیں، ”بیع الوفاء“ بھی معاملہ کی ایک نئی شکل تھی جو بخارا وغیرہ میں پانچویں صدی ہجری میں رائج ہو گئی تھی، اس کے جواز و عدم جواز سے قطع نظر علماء کے ایک گروہ نے اس کو اس بنا پر جائز قرار دیا تھا کہ یہ معاملہ نہ بیع صحیح کی تعریف میں آتا ہے اور نہ بیع فاسد کی تعریف میں اور نہ ہی اس کو رہن قرار دیا جاسکتا ہے، بلکہ یہ ایک نیا معاملہ (عقد) ہے جس میں ان تینوں معاملات کی خصوصیات موجود ہیں۔

انشورنس کا معاملہ بھی ایک نیا معاملہ ہے جو اس دور میں وجود میں آیا ہے اور اس کی کوئی مثال ماضی کے دور میں نہیں ملتی، یہ معاملہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے سادہ نہیں، بلکہ مرکب ہے، اس لئے معاملات کی ایک شکل پر اسے قیاس نہیں کیا جاسکتا، مثال کے طور پر انشورنس میں ربا کا جزء شامل ہے، لیکن اس کو معاملہ ربا اس لئے قرار نہیں دیا جاسکتا کہ آگ وغیرہ کا حادثہ پیش نہ آنے کی صورت میں ادا شدہ رقم پالیسی ہولڈر کو واپس نہیں ملتی کجا کہ سود ملے۔

اس قسم کے نئے مرکب اور پیچیدہ معاملات کے جواز و عدم جواز کا فیصلہ قرآن و سنت کی اساس پر بصیرت کے ساتھ کرنا ہوگا، متداول فقہی کتب میں سے کسی فقہی جزئیہ کو نکال کر اس پر ان مرکب اور وسیع الاطراف معاملات کو قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا۔

اور استاذ مصطفیٰ الزرقانی نے فقہاء کے بارے میں بالکل بجا فرمایا ہے:

” لو أنهم عاشوا في عصرنا اليوم، وشاهدوا الأخطار التي نشأت من الوسائل الحديثة كالسيارات التي فرضت على الإنسان من الخطر بقدر ما منحته من السرعة وثبت أمامهم فكرة التامين ولمسوا الضرورة التي نلمسها نحن اليوم في سائر المرافق الاقتصادية الحيوية لتخفيف آثار الكوارث الماحقة لما ترددوا الخطة في إقرار التامين نظام شرعياً“ (حوالہ سابق)۔

انشورنس کی مختلف قسمیں اور مختلف صورتیں ہیں، اس لئے سب پر یکساں حکم نہیں لگایا

جاسکتا۔

تھرڈ پارٹی موٹروہیکل انشورنس:

یہ انشورنس ان لوگوں کے لئے ہوتا ہے جو موٹر کے حادثہ کی زد میں آتے ہیں، اس کا پریمیم موٹر کے مالک کو ادا کرنا پڑتا ہے، یہ ایک معمولی رقم (چند سو) ہوتی ہے جو ایک سال کے لئے ادا کی جاتی ہے، کسی راہ گیر کا ایکسیڈنٹ ہونے کی صورت میں انشورنس کمپنی (جو اب سرکاری ادارہ ہے) اس کو ایک بڑی رقم ادا کرتی ہے اور موٹر کے مالک یا ڈرائیور کو کچھ ادا کرنا نہیں پڑتا۔

حادثہ اگر ڈرائیور کی غلطی سے ہوا ہے اور اس میں اگر کسی شخص کی موت واقع ہوگئی ہے تو شریعت کی رو سے قتلِ خطا کی دیت ادا کرنے کی ذمہ داری ڈرائیور پر عائد ہوتی ہے، مگر وہ دیت کی بڑی رقم کہاں سے ادا کرے گا؟ اسلام نے عاقلہ (اس کے خاندان) کو دیت کی ادائیگی میں شریک کیا تھا، لیکن موجودہ زمانہ میں خاندانی سسٹم نہیں رہا اور ڈرائیور بالعموم اس بوجھ کا متحمل نہیں

ہوتا اس لئے موجودہ متمدن دنیا نے تھرڈ پارٹی انشورنس کا طریقہ رائج کر کے بہت بڑی سہولت فراہم کر دی ہے اور حکومت نے اسے بجا طور پر لازم (Compulsory) قرار دیا ہے، یہ انشورنس درحقیقت تعاون ہی کی ایک شکل ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کے نظام میں کچھ فاسد چیزیں بھی شامل ہو گئی ہیں، مگر اس بنا پر اس معاملہ کو جو ایک ناگزیر تمدنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کیا جاتا ہے، ناجائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اور جو شخص موٹر کے حادثہ کی زد میں آ کر مر گیا ہو، اس کے ورثاء کے لئے تھرڈ پارٹی انشورنس کی رقم وصول کرنا ایسا ہی ہے جیسے دیت وصول کرنا، دیت ان کا حق ہے اور اس کے وصول کرنے میں وہ حق بجانب ہیں، اور معاملہ کی اس نوعیت سے کہ دیت کی ادائیگی کی ذمہ داری ڈرائیور کی طرف سے انشورنس کمپنی نے لے رکھی ہے کوئی اثر نہیں پڑتا، اور نہ اس بات سے اس کا حق ساقط ہوتا ہے کہ انشورنس کمپنی کی آمدنی میں حرام کی بھی آمیزش ہوتی ہے، کیونکہ اس تحقیق کی کوئی ذمہ داری حق وصول کرنے والوں پر شرعاً عائد ہی نہیں ہوتی، اگر خون بہا (دیت) کی رقم کوئی شخص اپنی حرام کی کمائی میں سے دے تو کیا ورثاء کے لئے یہ رقم لینا ناجائز ہوگا؟، اگر ان کے لئے دیت لینا جائز ہے قطع نظر اس سے کہ دیت ادا کرنے والا کہاں سے ادا کر رہا ہے تو ان کے لئے انشورنس کی رقم بھی لینا جائز ہوگا، قطع نظر اس سے کہ اس میں حرام کی آمیزش ہوئی ہے۔

اسی طرح ان لوگوں کے لئے بھی انشورنس سے اپنا کلیم (Claim) وصول کرنا جائز ہے جو موٹروں کے حادثات کی زد میں آ کر زخمی ہوئے ہوں، کیونکہ یہ بھی نقصان کی تلافی ہے جس کی ذمہ داری ڈرائیور پر عائد ہوتی ہے اور قانون کے مطابق اس کی یہ ذمہ داری انشورنس کمپنی کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔

غرضیکہ تھرڈ پارٹی موٹر انشورنس موجودہ دور کی ایک اہم ضرورت اور جائز نوعیت کا معاملہ ہے، اگرچہ اس کے نظام میں فاسد اجزاء بھی شامل ہو گئے ہیں جس کا گناہ ان لوگوں کے سر ہے جو اس نظام کو چلاتے ہیں۔

## آگ اور فسادات سے ہونے والے نقصان کا انشورنس:

جزل انشورنس میں آگ اور دیگر حادثات کا انشورنس شامل ہے، نیز فسادات (RIOTS) کی زد میں آنے والی پراپرٹی (Property) کا انشورنس بھی، یہ تقریباً ایک سال کے لئے ہوتا ہے اور جتنی رقم کا انشورنس کرانا ہو اس کے لئے تقریباً تین روپے فی ہزار کے حساب سے رقم ادا کرنا پڑتا ہے۔ آگ، سیلاب یا فسادات کی وجہ سے نقصان کی صورت میں وہ رقم جس کا انشورنس کرایا گیا تھا، بشرطیکہ واقعی نقصان اسی کے بقدر ہوا ہو پالیسی ہولڈر کو ادا کر دی جاتی ہے، اور اگر سال کے دوران نقصان نہ ہوا ہو تو ادا شدہ رقم واپس نہیں ملتی، یہ بھی تعاون ہی کی ایک شکل ہے کہ ایک فرد کا نقصان کئی افراد پر بانٹ دیا جاتا ہے اور یہ موجودہ دور کی ایک اقتصادی اور اجتماعی ضرورت ہے، اس لئے ضمناً جو خرابیاں اس میں پائی جاتی ہیں ان کو نظر انداز کرنا پڑے گا۔ اور جہاں تک فرقہ وارانہ فسادات کا تعلق ہے یہ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جس کی لپیٹ میں ہزاروں اور لاکھوں لوگ آرہے ہیں، لوٹ مار، آتش زدگی کی وارداتیں اس بڑے پیمانہ پر ہو رہی ہیں کہ دکانیں، کارخانے اور گھر بڑی طرح ان کی زد میں آرہے ہیں اور پورے محلے اور بستیاں تباہ ہو رہی ہیں، یہ سنگین صورت حال اس بات کی متقاضی ہے کہ دکاندار، کارخانہ دار وغیرہ اپنے اموال کا بیمہ کرائیں، اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ملک کی اکثریت غیر مسلم ہے اور انشورنس کے نظام کو چلانے والی حکومت سیکولر ہے، اس لئے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ انشورنس کا نظام غیر شرعی عناصر سے پاک ہو سکتا ہے، ایسی صورت میں اموال کے انشورنس کے سلسلہ میں بحیثیت مجموعی یہی رائے قائم کی جاسکتی ہے اور یہ رائے جواز ہی کے حق میں جاتی ہے۔

## انشورنس کے جواز کے شرعی دلائل:

اوپر ہم نے انشورنس کے جواز کی جو صورتیں بیان کی ہیں ان کے جواز کے وجوہ بھی مختصراً بیان کر دیئے ہیں، مزید شرعی دلائل درج ذیل ہیں:

۱- شریعت کا ایک بہت بڑا اصول ”یُسْر“ اور ”رَفْعِ حَرْجِ“ ہے:  
 ”يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ“ (سورۃ بقرہ: ۱۸۵)۔  
 وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (سورۃ حج: ۷۸)۔  
 اس بنا پر علماء کہتے ہیں:

”إِذَا ضَاقَ الْأَمْرُ اتَّسَعَ“ ”المشقة تجلب التيسير“ ”والضرورات  
 تبيح المحظورات“ ”وما حرم لذاته يباح للضرورة“ ”وما حرم سداً لذريعة  
 يباح للحاجة“

۲- اسلام نے قتلِ خطا کی دیت عاقلہ (عصبات) پر عائد کی ہے:  
 ”ولا نعلم بين اهل العلم خلافا في أن دية الخطأ على العاقلة. قال ابن  
 المنذر: اجمع على هذا كل من نحفظ عنه من أهل العلم وقد ثبت الاخبار عن  
 رسول الله ﷺ أنه قضى بدية الخطأ على العاقلة وأجمع أهل العلم على القول  
 به.....“ (المغني ۷/۷۷۱)۔

۳- فقہاء نے اس صورت میں جبکہ دو گھوڑے سواروں کا ایک دوسرے سے تصادم ہوا  
 ہو، اور وہ ہلاک ہو گئے ہوں، ان دونوں کی دیت (خون بہا) ان کے عاقلہ (عصبات) پر عائد کی  
 ہے (دیکھئے: بدایۃ المجتہد ۲/۴۰۹)۔

فقہاء نے عموم بلوئی کا لحاظ کیا ہے، مثال کے طور پر جانوروں کی نجاست کے سلسلہ میں  
 دفع حرج کے لئے نرمی پیدا کر دی ہے:

۴- موجودہ زمانہ میں سرکاری ملازمین کے لئے ریٹائرمنٹ پر پنشن (التقاعد) کا  
 طریقہ رائج ہے جس میں ضمناً کئی خرابیاں پائی جاتی ہیں، اس کے باوجود اس معاملہ کو علماء نے  
 ناجائز نہیں قرار دیا، لہذا جبکہ انشورس اور ”التقاعد الحالیہ“ (موجودہ پنشن) میں کافی مماثلت  
 ہے۔ انشورس کو ضمنی خرابیوں کے باوجود کیوں نہ ایک جائز معاملہ قرار دیا جائے، جامعہ اردنیہ کے  
 کلیۃ الشریعہ کے استاذ مصطفیٰ احمد الزرقاء فرماتے ہیں:

” فالواقع في نظرنا أن نظم التقاعد الحالية فيها شوائب عديدة وظلم واستغلال سيئ بالنظر الشرعي الإسلامي، مما يجعلها في حاجة إلى دراسة تفصيلية خاصة ولكننا استشهدنا به الآن من زاوية معينة هي أن الموظف في جميع الأحوال وفي نظام تقاعدى سليم من الوجهة الشرعية يقطع منه أكثر أو قل حتماً مما يأخذ عند التقاعد أو الوفاة هو أو أسرته، و لم يعتبر أحد من العلماء في ذلك شبهة ربا، لأن الفكرة الأساسية فيه هي معونة الموظف فيه عند عجزه المفروض ولو كان غنيا وانتقال هذه المعونة إلى أسرته بشرائط معينة“ (الاقتصاد الإسلامي/ ۲۰۶)۔

۵- اگر کسی چیز کی بیع میں ضمناً ممنوع چیز کا ارتکاب ہوتا ہے تو وہ بیع باطل نہیں قرار پاتی:

”البيوع المنهى عنها نهيا لا يستلزم بطلانها كثيرة.....منها

النجش.....ومنها السوم على سعر الغير“ (الفقه على المذاهب الاربعه ۲/ ۲۷۳)۔

### لائف انشورنس:

لائف انشورنس (التامين على الحياة) ایک عقد (معاملہ) ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بیمہ کرائے والا اپنی زندگی کا جس قیمت کا بیمہ کرانا چاہتا ہے اس کو وہ قسط وار ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے، مدت معینہ کے اندر وفات پانے کی صورت میں وہ رقم جس کا اس نے بیمہ کرایا ہے لائف انشورنس کارپوریشن کی طرف سے جو حکومت کا قائم کردہ ادارہ ہے اس کے ورثاء کو مل جاتی ہے، اور اگر مدت معینہ کے اندر وفات نہ ہوئی ہو تو ادا شدہ پوری رقم مع بونس کے واپس مل جاتی ہے، اگر ایک دو قسطوں کے بعد مزید قسطیں ادا نہیں کی گئیں تو کچھ نہیں ملے گا، البتہ کم از کم تین قسطوں کی ادائیگی کی صورت میں ادا شدہ رقم واپس ملے گی، مگر اس وقت جبکہ موت واقع ہو چکی ہو یا مدت ختم ہو چکی ہو، لائف انشورنس کی سالانہ قسط عموماً پچاس روپے فی ہزار کے حساب

سے مقرر کی جاتی ہے اور انشورنس کے لئے ڈاکٹری معائنہ ضروری ہے، بہت زیادہ بیمار اور بوڑھے اشخاص کا بیمہ نہیں کرایا جاسکتا، چنانچہ لائف انشورنس کارپوریشن کی طرف سے ایجنٹوں کے لئے یہ ہدایت ہے کہ ان لوگوں کے بیمہ کی درخواستیں قبول نہیں کرنا چاہئے جن کی تندرستی بظاہر، یادِ حقیقت خراب ہو (ہدایت نامہ ۲۰۱-۲۰۰)۔

لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا وصول شدہ رقوم کو کاروبار میں لگاتی ہے، بالعموم گورنمنٹ سیکورٹیز اور شیئرز میں اس کا سرمایہ (INVEST) ہوتا ہے، اس طرح سود اور منافع دونوں چیزیں اسے حاصل ہوتی ہیں اخراجات جانے کے بعد جو راند رقم (Surplus) بچتی ہے اس کا ۹۵% بونس کی شکل میں پالیسی ہولڈروں کو ادا کیا جاتا ہے اور ۵% حکومت کو جاتا ہے۔

کارپوریشن کا انوسٹمنٹ (Investment) ۳۱ مارچ ۱۹۸۹ء کو گورنمنٹ آف انڈیا سیکورٹیز میں ۶۸۲ کروڑ روپیہ تھا، پبلک سیکٹر کارپوریشن کے ڈنچر میں (Debentures) میں ۴۵۶ کروڑ روپیہ اور پرائیویٹ سیکٹر کے شیرز میں جن میں کمپنیوں کے ڈنچر اور ترجیحی شیرز بھی شامل ہیں ۱۳۲۱ کروڑ روپیہ تھا، یہ چند مثالیں ہیں جن سے سودی کاروبار کا اندازہ ہوتا ہے۔ مالی سال ۸۹-۱۹۸۸ء میں سود، منافع اور کرایہ (Interest Dividends Rents) کی رقم مجموعی طور پر اٹھارہ ارب پچاسی کروڑ روپیہ لائف انشورنس کارپوریشن کو وصول ہوئی (تفصیلات کے لئے دیکھئے: لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا کی شائع کردہ سالانہ رپورٹ اختتام مارچ ۱۹۸۹ء، صفحات ۸۳، ۸۷، ۸۹ اور ۱۳۳)۔

ان تفصیلات سے درج ذیل امور واضح ہوتے ہیں:

۱- ”لائف انشورنس“ کا نظام فائر انشورنس اور اس جیسے دوسرے انشورنس (جزل انشورنس) سے بنیادی طور پر مختلف ہے، کیونکہ اس کی تشکیل تعاون کی بنیاد پر نہیں، بلکہ کاروبار کی بنیاد پر ہوئی ہے، چنانچہ ایسے لوگ جو بوڑھے ہوں، یا شدید بیماری میں مبتلا ہوں اپنی بیمہ نہیں کرا سکتے، حالانکہ دوسروں کی بہ نسبت یہ یا ان کے ورثاء تعاون کے زیادہ مستحق ہو سکتے ہیں۔

۲- موت کے حادثہ سے تو لازماً ہر شخص کو دو چار ہونا ہی ہے، اس لئے طبعی موت پر کسی معاوضہ یا (Compensation) کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا جبکہ ناگہانی حادثہ کی زد میں آنے والے شخص کے لئے دیت کا مطالبہ ایک معقول اور منصفانہ بات ہے، اسی طرح آتش زنی اور فسادات کی وجہ سے تلف ہونے والے اموال کا معاوضہ بھی۔

۳- ”لائف انشورنس“ میں اصل رقم مدت مقررہ کے بعد بونس کے ساتھ لوٹائی جاتی ہے جو سود ہی کی شکل ہے، جبکہ فائر انشورنس وغیرہ میں اصل رقم سرے سے لوٹائی ہی نہیں جاتی، بلکہ حادثہ کی صورت میں ایک معقول معاوضہ ادا کیا جاتا ہے جو تعاون کی ایک شکل ہے۔

۴- جنرل انشورنس میں حادثہ پیش نہ آنے کی صورت میں ادا شدہ رقم واپس نہیں ملتی، بلکہ پالیسی ہولڈر کی طرف سے دوسرے حادثہ زدگان کے لئے یہ (Contribution) ہوتا ہے، اس لئے کسی بھی شخص کو جو حادثہ کی زد میں آیا جنرل انشورنس سے ملنے والی رقم کا اصل (Source) پالیسی ہولڈروں کی طرف سے ادا شدہ رقم ہیں اور سود وغیرہ کی جو آمیزش اس میں ہوتی ہے وہ ایک ضمنی چیز ہے، جبکہ لائف انشورنس جو بونس ادا کرتا ہے اس کا بڑا عنصر سود ہے۔

لائف انشورنس اور جنرل انشورنس (فائر وغیرہ) کے اس بنیادی فرق کے پیش نظر لائف انشورنس کو دوسری قسم کے انشورنس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اور نہ اسے جائز قرار دیا جاسکتا ہے، لائف انشورنس کے لئے اضطرار کی بھی وہ صورت نہیں ہے جو دیگر حادثات کے لئے ہے، البتہ دو صورتیں لائق غور ہیں:

ایک یہ کہ آئے دن جو لوگ فسادات کی زد میں آتے ہیں ان کی دیت کون ادا کرے گا؟ لائف انشورنس کی صورت میں تلافی کا سامان ہو سکتا ہے، اس لئے جہاں حالات زیادہ پرخطر ہوں ان علاقوں کے لئے جواز کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے، مگر شاید کم ہی اس کی ضرورت پیش آئے، کیونکہ ہلاک شدگان کو بالعموم ریاستی حکومتیں معاوضہ دیتی ہیں، یہاں تک کہ بعض ریاستیں ایک لاکھ فی کس بھی دیتی ہیں، اسی طرح زمینوں کی بھی امداد کی جاتی ہے، علاوہ ازیں ریلیف کمیٹیاں بھی امداد پہنچاتی ہیں۔



دوسری صورت یہ ہے کہ جو رقم لائف انشورنس کی قسطوں میں ادا کی جاتی ہے وہ انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوتی ہے، تقریباً دس ہزار روپے تک یہ چھوٹ مل جاتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص اپنا سرمایہ محفوظ کرنے کے لئے لائف انشورنس کی پالیسی خریدتا ہے او یہ نیت رکھتا ہے کہ مدت ختم ہو جانے پر وہ صرف زر اصل سے فائدہ اٹھائے گا اور جو زائد رقم اسے وصول ہوگی اسے صدقہ کے مصرف میں لائے گا اور اپنے ورثاء کو بھی اسی کی ہدایت کرتا ہے اور ان سے اسی کے مطابق عمل درآمد کی توقع رکھتا ہے تو اس صورت میں بھی جواز کی گنجائش ہے۔



## انشورس

مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی ☆

اس وقت ہمارا ملک جن حالات سے دوچار ہے اور بالخصوص مسلمان جن مصائب و آلام میں مبتلا ہیں وہ کسی باخبر ذی ہوش انسان سے مخفی نہیں ہے، سچ پوچھئے تو موجودہ ملکی حالات اور مسلمانوں کی پریشانیوں کی وجہ سے علماء بہت سارے مسائل پر دوبارہ غور کرنے پر مجبور ہیں۔ کوئی شبہ نہیں، ملک کا امن و امان تباہ ہو چکا ہے۔ سیاسی جماعتوں کی باہمی کشمکش اور آویزشوں نے ملک کو تباہی و بربادی کے کنارے پہنچا دیا ہے۔ یہی نہیں ہے کہ صرف مسلمان ہی موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار ہیں اور وہی جلانے اور قتل کئے جا رہے ہیں، اب تو انسان نمادندوں کے منہ کو خون لگ گیا ہے اور انھوں نے اپنے لوگوں کو بھی ذات پات اور برادری کے نام پر جلانا اور قتل کرنا شروع کر دیا ہے اور آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جن لوگوں کا رشتہ اسلام سے ہے وہ سب سے زیادہ نشانہ بنائے جاتے ہیں اور حد یہ ہے کہ حکومت کے عملہ بھی ایک طرفہ ان پر مظالم کے پہاڑ توڑنے میں شرم محسوس نہیں کرتے۔

انہی حالات نے زندگی اور مال و جائداد کے بیمہ کا سوال پیدا کر دیا ہے، ورنہ یہ مسئلہ اپنی جگہ مسلم ہے کہ اپنی ہیبتِ ترکیبی سے بیمہ قطعاً ناجائز و حرام ہے، اس لئے کہ یہ قمار و ربا سے مرکب ہے اور دونوں کی حرمت کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ میں مصرح ہے۔

”أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا“ (سورہ بقرہ: ۲۷۵)۔  
 ”إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ  
 فَاجْتَنِبُوهُ“ (المائدہ: ۹۰)۔

حدیثیں اس مضمون کی بہت آئی ہیں جن میں سود اور جو ا کی حرمت بیان کی گئی ہے  
 یہاں ان سب کے نقل کرنے کی خاص ضرورت نہیں ہے۔  
 اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ مسلمانوں کے جان و مال کی شریعت میں بڑی  
 قدر و قیمت ہے، قرآن و حدیث میں اس کی فضیلت آئی ہے، حالت اضطرار و مخصوصہ میں اکل مہیتہ  
 اور شرب خمر تک کی اجازت دی گئی ہے اگر بقدر سد مرتق استعمال کرے، ”غیر باغ و لا  
 عاد“ (سورہ بقرہ: ۱۷۳) کی قید لگائی گئی ہے۔

”إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخَنزِيرِ وَمَا أُهْلَ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ  
 فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ“ (سورہ بقرہ: ۱۷۳)۔  
 دوسری جگہ ارشاد ہے:

”فَمَنْ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرٍ مُّتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ“  
 (المائدہ: ۳)۔

جان مسلم کی قدر و قیمت ان آیتوں سے واضح ہوتی ہے، اسی طرح حدیث نبوی میں  
 جان و مال کی حفاظت کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

”من قتل دون نفسه فهو شهيد ومن قُتِلَ دون عرضه فهو شهيد ومن  
 قتل دون ماله فهو شهيد أو كما قال ﷺ“

”حجۃ الوداع“ کے خطبہ میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

”فإن دماءكم وأموالكم حرام كحرمة يومكم في شهركم هذا في  
 بلدكم هذا۔ او كما قال ﷺ“

اس کے علاوہ فقہاء امت نے بھی ایسے اصول بیان فرمائے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دائرہ شریعت کے اندر رہ کر ضرر کو دور کیا جائے۔ ”الضرر یزال، الضرورات تبیح اللظورات، الضرر الأشد یزال بالضرر الأخف“۔

ان تمام پر غور و فکر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شریعت مطہرہ نے مسلمانوں کی جان و مال کو کس قدر اہمیت دی ہے، اور ان کی حفاظت کتنی ضروری قرار دی گئی ہے۔ کتاب و سنت اور فقہ میں سینکڑوں مثالیں ایسی ہیں جن سے باسانی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام ایک جامع اور وسیع نظام حیات ہے اور اس میں بہت ساری رعایتیں ہیں۔

پھر یہ بھی مسئلہ اپنی جگہ طے ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کے احکام میں بڑا فرق ہے، جہاں اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے وہاں جان و مال کا تحفظ آسان ہے، قوانین اسلام کا اجراء ان کے ہاتھوں میں ہے اور جہاں یہ بات نہیں ہے وہاں کے رہنے والے مسلمان بڑی حد تک مجبور و بے بس ہوتے ہیں، اسلام نے ایسے غیر اسلامی ملک میں رہنے اور بسنے والوں کے لئے کچھ سہولتیں دی ہیں جس کی تفصیل فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں موجود ہے۔

ہمارا ہندوستان بھی انہی ممالک میں ہے جن پر دارالاسلام کی تعریف صادق نہیں آتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ یہاں حدود و قصاص جاری نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں، اسلام کے خلاف سینکڑوں قوانین ملک میں نافذ ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے لے کر حضرت گنگوہیؒ، حضرت کشمیریؒ اور حضرت مدنیؒ تک سارے علماء اسی کے قائل رہے کہ انگریزوں کے تسلط کے بعد ملک دارالاسلام نہیں رہا، اور آزادی کے بعد بھی حضرت مدنیؒ نے یہی فرمایا کہ اس وقت جو حالات ہیں یہ ملک بدرجہ اولیٰ دارالاسلام نہیں ہے۔

دارالاسلام ما غلب فیہا المسلمون وکانوا آمینین۔ دارالحرب ہو

علی خلاف دارالاسلام یعنی ما غلب فیہا غیر المسلمین“ (قواعد الفقہ)۔

”تحقیقات شرعیہ لکھنؤ“ نے ۱۹۶۲ء میں بیمہ کے سلسلہ میں مفصل سوالات مرتب

کر کے ہندو پاک کے تمام قابل ذکر علماء و مفتیان کرام کے پاس بھیجے اور اس وقت انھوں نے جوابات دیئے اور اسی کی روشنی میں وہ تجویز متفقہ طور پر پاس ہوئی جس کا حوالہ ہمارے اس سوالنامہ میں دیا گیا ہے۔

خاکسار کی ذاتی رائے یہ ہے کہ وہ تجویز اس وقت بہت صحیح آئی، اور اس سے مسلمانوں کو کافی سہارا ملا، اور ملک کے علماء اور مفتیان کرام نے اسے پسند کیا اور اس کے مطابق عوام و خواص کی رہنمائی کا فریضہ ادا کیا۔

ابھی گزشتہ سال ”دارالافتاء دارالعلوم دیوبند“ میں بیمہ سے متعلق سوال آیا، جب ملک میں آگ و خون کی بارش ہو رہی تھی اور مسلمانوں کا سفر کرنا مشکل ہو رہا تھا، ٹرینوں پر حملے ہو رہے تھے، زندہ مسلمانوں کو جلایا جا رہا تھا، ان کی دکانوں اور کارخانوں کو لوٹا اور پھونکا جا رہا تھا اور حکومت تماشہ دیکھ رہی تھی۔

دارالعلوم دیوبند کے علماء اور مفتیان کرام نے ان حالات میں بیمہ کرانے کی اجازت دی اور جان و مال کو محفوظ رکھنے کو ضروری قرار دیا اور اس تجویز کو ”جمعیۃ علماء ہند“ نے ہزاروں کی تعداد میں چھپوا کر ملک کے تمام گوشوں میں پہنچانے کی جدوجہد کی، بلکہ بعض اعتبار سے دارالعلوم دیوبند کی تجویز زیادہ جامع تھی۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اس مسئلہ پر اہل عرب بھی بہت ساری کتابیں لکھ کر شائع کر چکے ہیں اور وہ اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہیں، موافق و مخالف رائیں تفصیل سے آچکی ہیں، یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے، افسوس یہ ہے کہ علماء کرام کسی تجویز پر متفق نہیں ہو پاتے ہیں۔

ان تمام بحثوں کو پڑھنے اور سننے کے بعد اب انداز ہوا کہ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی سابق صدر ”شعبۃ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی“ نے انگریزی دور حکومت میں ”لاربا بین المسلم والحربی فی دار الحرب“ پر جو کچھ لکھا تھا ان کی رائے درست تھی، حضرت مکحول کی مرسل روایت پر جس کی بنیاد ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد نے جس کو قبول کیا ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ ثقہ کی مرسل روایت اصولاً مقبول ہے۔

” قال في المبسوط هذا مرسل ومكحول ثقة والمرسل من مثله

مقبول“ (فتح القدير)۔

اگر اس دور میں بھی مولانا مرحوم کی اس رائے کو قبول کر لیا جائے تو بہت ساری پریشانیاں اس ملک میں مسلمانوں کی دور ہو جائیں گی اور اس کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔ مولانا سے ایک دفعہ اس مسئلہ پر میری گفتگو ہوئی تو فرمایا کہ اس ملک میں غیر مسلموں سے ہمارا دن رات کا واسطہ ہے، وہ ہم مسلمانوں سے سود لینا جائز کہتے ہیں اور لیتے رہتے ہیں اس ایک طرفہ کاروبار کا حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی دولت کا بڑا حصہ اس راستہ سے ان کے گھروں میں منتقل ہو گیا، مسلمان فلاں و مفلس بن کر رہ گئے، اور ہم نے ناجائز کا فتویٰ دیا، اس لئے ان سے مسلمان کچھ نہیں لے سکے، ہزاروں مسائل جو امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ سے منقول ہیں، ان پر ہمارا عمل ہے اور اس پر عمل کرتے ہوئے ہم ائمہ ثلاثہ کی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتے، اپنے دلائل بیان کر کے ائمہ ثلاثہ کے اقوال پر ترجیح دیتے ہیں۔

اس ایک مسئلہ میں جب ہم کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے اس قول پر عمل کر لیا جائے تو علماء و عظماء شروع کر دیتے ہیں اور جو ہم نے اپنے مضامین میں بنیاد قائم کی ہے اس کا کوئی جواب نہیں دیتا، آپ نے میرے وہ تمام مضامین پڑھے ہوں گے جو اُس زمانہ میں رسالہ ”معارف“ میں لکھے گئے تھے اور اعتراضات کے جوابات دیئے گئے تھے، ہمارے علماء دیوبند نے بر بنائے احتیاط اس قول پر فتویٰ نہیں دیا، مگر اب ملک آزاد ہو چکا ہے، حالات بدل چکے ہیں اور ابھی نہیں معلوم آپ حضرات کے سامنے کیسے کیسے حالات آئیں۔ حیدرآباد میں جو کچھ ہوا ہے وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، آپ لوگوں کو غور و فکر اور دوراندیشی سے کام لینا ہوگا۔

دوران گفتگو حضرت مولانا گیلانی نے یہ بھی فرمایا کہ غلامی کا مسئلہ سامنے رکھیں، کیا یہ انسانیت کی توہین نہیں، مگر رسول اکرم ﷺ نے اس وقت اسے اس لئے بھی جائز قرار دیا تھا کہ مخالف کا ہمارے ساتھ وہی سلوک تھا، اور ہمیں وہ غلام و باندی بنا رہے تھے، اگرچہ رحمتِ عالم

ﷺ نے غلام و باندی کے حقوق بیان کئے، ان کے ساتھ اچھے برتاؤ کا تاکید فرمایا، آزاد کرنے کی ترغیب دی اور اس کے ثواب کو بیان فرمایا، تاکہ ان غلاموں کو انسانیت سے فروتر نہ سمجھا جائے اور ایسا سلوک نہ کیا جائے جس سے انسانیت کی تذلیل ہو، یہ بھی درست ہے کہ اس میں دوسری حکمتیں اور مصلحتیں بھی تھیں۔

عرض یہ کرنا ہے کہ بیمہ کے جواز کی ایک صورت اس مسئلہ سے بھی پیدا ہوتی ہے اور اس کے ساتھ دوسرے مسائل بھی حل ہوتے ہیں، اس لئے اس فارمولہ پر بھی غور کرنے میں مضائقہ نہیں ہے۔ دارالحرب اور دارالکفر میں اسلام نے جو گنجائشیں دی ہیں، ان سے بھی فائدہ اٹھانا چاہئے، آج کل سہولت کی خاطر بہت سے علماء مذہب حنفی کے بہت سارے مسئلوں سے عدول کرنے پر آمادہ ہیں اور اس پر لمبے لمبے مقالے لکھ کر شائع کر رہے ہیں، آخر امام اعظمؒ اور امام محمدؒ کے ایک مسئلہ پر عمل کر لیا جائے اور ائمہ ثلاثہ اور امام ابو یوسفؒ کے قول اور مسلک کو چھوڑ دیا جائے تو کون سی قیامت برپا ہو جائے گی۔

علامہ شامیؒ نے جہاں ”سوکرہ“ کا تذکرہ کیا ہے جو بیمہ سے ملتی جلتی شکل ہے جس کا حوالہ اور ذکر سوالنامہ میں بھی ہے اور انھوں نے اس کے عدم جواز پر اپنا رجحان دارالاسلام میں ظاہر کیا ہے وہیں اس کے جواز کو دارالحرب میں ذکر کیا ہے کہ دارالحرب میں ایسا کرنے میں مضائقہ نہیں۔

”بخلاف المستأمن فی دارالحرب فإن له أخذ ماله برضاہم ولو بربا أوقمار، لأن مالہم مباح لنا إلا أن الغدر حرام، وما أخذ برضاہم لیس غدرًا من المستأمن، بخلاف المستأمن منہم دارنا، لأن دارنا محل إجراء الأحكام الشرعية“ (رد المحتار)۔

لفظ مستأمن کے جواز کی جو بنیاد بیان کی گئی ہے اس پر غور کیا جائے، وہ بنیاد اس ملک میں پائی جاتی ہے یا نہیں، اگر پائی جاتی ہے تو ہمیں سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرنا چاہئے اور وسعت نظری سے فیصلہ کرنا چاہئے۔

## کیا موجودہ حالات میں بیمہ کرانے کی اجازت ہے؟

مفتی حبیب الرحمن خیر آبادی ☆

موجودہ ترقی کے دور میں معاشی نظام عالمگیر ہو گیا ہے اور بین الاقوامی تجارت نے اس درجہ فروغ اور وسعت اختیار کر لی ہے کہ دنیا کے ممالک ایک دوسرے سے دور ہونے کے باوجود قریب تر اور متحد نظر آ رہے ہیں، نیز تجارت اور صنعت و حرفت کے ذرائع اور طریقہ کار ملکی اور غیر ملکی سطح پر اس درجہ پھیل چکے ہیں اور انسانی زندگی میں اتنے سرایت کر چکے ہیں کہ تجارت کی وسعت و ترقی کے ساتھ قسم قسم کے خطرات اور حوادث بھی روز بروز پیدا ہوتے جا رہے ہیں، ان کے نتیجے میں بہت سے تاجروں کا کاروبار فیل ہو جاتا ہے، کبھی ان کا سب کچھ لٹ جاتا ہے اور بالکل نادار و مفلس ہو جاتے ہیں، جیسا کہ ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات میں مسلمانوں کی دکانیں، کارخانے خاک سیاہ اور تباہ کر دیئے جاتے ہیں۔

مستقبل میں اس طرح کے خطرات سے بچنے اور نقصانات کی تلافی کرنے کے لئے قدیم زمانہ میں امداد باہمی کے طور پر ایسی تدبیروں کا پتہ چلتا ہے جن کے ذریعہ حوادث و خطرات میں نقصانات کا تدارک کیا جاتا رہا، مثلاً کسی شخص کا مال تجارت سمندر میں ضائع ہو جائے تو تمام تاجر مل کر اس کی معاونت کے طور پر اسے ہر ماہ، یا ہر سال ایک معین رقم ادا کیا کرتے تھے، جس کو آج ہم بیمہ پالیسی کا نام دیتے ہیں، پہلے یہ شکل نہایت سادہ سی تھی بعد میں اس کی نئی نئی صورتیں



نکل گئیں، یہاں تک کہ موجودہ دور میں ایک مقررہ قسط پر بیمہ کاری کا نظام سب سے زیادہ مقبول ہے جس کو سرمایہ کارانہ نظام بیمہ کہا جاتا ہے اور آج معاشی نظام میں بیمہ کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے، یہاں تک کہ بیمہ پالیسی نے ایک مرتب قانونی نظام کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور یہ معاملہ مستقل کاروبار بن گیا ہے اور انسانی زندگی میں اس طرح دخیل ہو گیا ہے کہ اس کے بغیر اجتماعی اور کاروباری زندگی میں طرح طرح کی مشکلات سامنے آتی ہیں اور جان و مال کے تحفظ کے لئے بیمہ سے گلو خلاصی ناممکن ہو گئی ہے۔

بیمہ، خواہ زندگی کا ہو، یا املاک کا ہو، یا بچوں کی تعلیم، شادی وغیرہ جیسی ذمہ داریوں کا ہو، ان سب کی حقیقت یہ ہے کہ بیمہ کمپنی جس میں بہت سے سرمایہ دار شریک ہوتے ہیں، اسی طرح جس طرح تجارتی کمپنیاں ہوتی ہیں، بیمہ دار سے ایک معین رقم بالا قسط وصول کرتی ہے اور ایک معین مدت کے بعد وہ رقم اسے یا اس کے پس ماندگان کو حسب شرائط واپس کر دیتی ہے، اس کے ساتھ ایک مقررہ شرح فیصد کے حساب سے اصل رقم کے ساتھ کچھ مزید رقم بہ طور سود دیتی ہے اس رقم کے جمع کرنے سے کمپنی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسے دوسرے لوگوں کو بہ طور قرض دے کر ان سے اعلیٰ شرح پر سود حاصل کرے یا کسی تجارت میں لگا کر اس سے منافع حاصل کرے، اس کے شرکاء اپنی ذاتی رقم خرچ کئے بغیر بڑی رقم بہ صورت سود یا منافع حاصل کرتے ہیں اور اسی منافع یا سود میں سے بیمہ دار کو ایک حصہ دیتے ہیں اور بیمہ دار کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کا سرمایہ محفوظ رہے اس میں اضافہ بھی ہو، نیز اس کے پسماندگان کی اعانت ہو یا ناگہانی حوادث پیش آنے کی صورت میں نقصان کی تلافی ہو، وغیرہ وغیرہ۔

پہلے زمانہ میں مسلمانوں کے حالات آج سے بہت زیادہ مختلف تھے، فرقہ وارانہ فسادات، لوٹ مار، قتل و غارت گری اور ناگہانی حوادث اس کثرت سے نہیں تھے جو آج طرح طرح کے آلات اور مشینوں کے رواج کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں، نیز پچھلے دور میں زیادہ تر مسلمان اسلامی حکومتوں میں رہتے تھے جہاں حکومت کی طرف سے بیت المال کے ذریعہ بڑی

حد تک ایسے حالات میں انہیں سہارا ملتا تھا، ہندوستان میں بسنے والے مسلمان اس سے یکسر محروم ہیں، آج مسلم قوم میں مصارف زندگی کا بوجھ بڑھ جانے سے باہم ہمدردی و غم خواری کا جذبہ سرد ہو گیا ہے، اقتصادی حیثیت سے مسلمان اس درجہ کمزور ہے کہ اپنے زکوٰۃ و صدقات اور عطایا کی رقوم سے اس قسم کے نقصانات کی تلافی ناممکن ہو گئی ہے۔

علاوہ ازیں آج ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود اور تشخص کو مٹانے اور اقتصادی و معاشی حیثیت سے انہیں تباہ و برباد کرنے کی منظم کوششیں ہو رہی ہیں، یہاں کی جمہوریت، جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری کا آئین محض بن کر رہ گیا ہے۔ امن و امان کے محافظ حکمراں خود مجرمانہ غفلت برتتے ہیں اور فساد یوں کے ساتھ مل کر لوٹ مار، آتشزدگی اور قتل و غارت گری میں شریک رہتے ہیں اور کھلے تعصب اور جانب داری کی صورت اختیار کر کے قدم قدم پر قانون شکنی کرتے ہیں، حتیٰ کہ فساد یوں کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہیں کرتے، نامزد رپورٹ کے باوجود مسلمانوں کا لوٹا ہوا مال برآمد نہیں کرتے اور یہ کسی خاص مقام اور علاقے میں نہیں، بلکہ ملک کا ہر گوشہ اس خطرے سے دوچار ہے، نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ آج ہندوستان میں مسلمانوں کی جان، املاک، دکان، مکان، صنعت و حرفت، کارخانے، فیکٹریاں، کاریں، بسیں غرض تمام املاک غیر محفوظ ہیں، قصداً معاشی طور پر مسلمانوں کی کمر اس بری طرح توڑی جا رہی ہے کہ یہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے لائق نہ رہ سکیں گے اور ذہنی طور پر انہیں مرعوب کر کے غلامی کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

غرض موجودہ ہندوستان فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن چکا ہے اور یہ ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ناممکن ہے، آئے دن فتنہ فساد ہوتے رہتے ہیں، کسی مسلمان کو اپنی جان، اپنی املاک کی حفاظت و بقاء پر کوئی بھروسہ نہیں کہ کس وقت لٹ پٹ جائے، ہم دیکھتے ہیں کہ کل تک ایک آدمی ہاتھ پیروں سے صحیح سالم تھا آج اچانک کسی حادثے کی زد میں آ گیا اور پانچ ہو کر رہ گیا، اسی کے ساتھ اس کا خاندان بھی حوادث کا شکار ہے، نہ پیٹ بھرنے کو روٹی ہے، نہ تن ڈھانپنے کے لئے

کپڑا، ایک کارخانہ دار کل تک ایک بڑی انڈسٹری کا مالک تھا اچانک اس کا کارخانہ لٹ گیا، مشینری اور سارا سامان جل کر راکھ ہو گیا، اب وہ نان جویں کا محتاج ہو گیا، نیز ٹرینوں، بسوں اور موٹروں کے حادثے بھی ہماری زندگی کا روزمرہ بن چکے ہیں، آخر ان نقصانات کی تلافی کیونکر ہو، ہمیں اپنی جان و مال کا تحفظ اور اپنی عزت و ناموس کا تحفظ بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح اپنا دین و ایمان اور شعائر اسلامی کا تحفظ ضروری ہے اور اس کا حل شریعت اسلامی کی روشنی میں نکالنا تمام فرائض میں سے ایک اہم فریضہ ہے۔

اس خطرناک اور نازک ترین حالات میں مسلمانوں کو تباہی و بربادی اور اقتصادی بد حالی سے بچانے کے لئے یہ حل نکالا جا رہا ہے کہ وہ اپنی جان، اپنی املاک، دکان، کارخانے، تجارت، صنعت و حرفت اور کھیتی، مساجد و مدارس وغیرہ کا بیمہ کرائیں۔ اس سے کافی حد تک جان کی اور املاک کی حفاظت ممکن ہے، کیونکہ بیمہ کمپنی آج کل عام طور پر سرکاری نظم کے تحت چل رہی ہے اور حکومت نے اسے تو میا لیا ہے اور کمپنی کے نفع و نقصان کی ذمہ داری حکومت کی طرف لوٹی ہے، فساد زدہ علاقوں میں یہ دیکھا گیا کہ فساد یوں کو جب اس کا علم ہوا کہ فلاں شہر کی املاک، یا فلاں محلہ کی املاک بیمہ شدہ ہیں تو انھیں نقصان نہیں پہنچاتے اور چونکہ تمام بیمہ کمپنیاں سرکاری ہیں اس لئے ظن غالب یہ ہے کہ انشورڈ کرانے کی صورت میں حکومت مسلمانوں کے جان و مال کے تحفظ کا معقول بندوبست کرے گی، اور فسادات کو روکنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے گی، کیونکہ عدم تحفظ کی صورت میں سارا نقصان حکومت کو برداشت کرنا پڑے گا اور اگر خدا نخواستہ بیمہ کے بعد نقصان ہو جاتا ہے تو بیمہ کمپنیاں اتنی رقم دے دیتی ہیں کہ پہنچنے والے نقصانات کی کافی حد تک تلافی ہو سکتی ہے اور لٹے پٹے مسلمان اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے لائق ہو سکتے ہیں، اس طرح فساد کی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں آئے دن کے فسادات اور جان و مال کے جن خطرات و نقصانات کی طرف نشان دہی کی گئی ہے اور امر واقعی ہیں اور بیمہ (انشورڈ) کے ذریعہ جان و مال کے تحفظ کے جو تجربات اوپر ذکر کئے گئے ہیں وہ بھی لائق توجہ ہیں، بیمہ کرانے کے

مسئلہ میں علماء مصر و شام مختلف الخیال نظر آتے ہیں، اگرچہ اکثریت کا یہی خیال ہے کہ بیمہ پالیسی کی موجودہ صورتیں ناجائز ہیں اور جب تک بیمہ کے موجودہ نظام کو تبدیل نہ کیا جائے مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں، عدم جواز کی تفصیل آگے آرہی ہے، معدودے چند حضرات بیمہ کو مطلقاً جائز کہتے ہیں، وہ لوگ بیمہ پالیسی کو امداد باہمی کی شکل قرار دیتے ہیں اور باہمی تعاون اسلامی حکم ہے، نیز وہ فرماتے ہیں کہ جب ”بیع بالوفاء“ درست ہو سکتی ہے تو بیمہ پالیسی کو بھی گوارا کیا جاسکتا ہے، اور بیمہ کمپنی ضرورت مندوں کو جو قرض دیتی ہے اور اس پر جو سود لگاتی ہے، یا بیمہ پالیسی خریدنے والوں کو اصل مع منافع دیا جاتا ہے وہ شرعی ربوا (سود) نہیں ہے۔

کچھ حضرات یہ فرماتے ہیں کہ بیمہ میں اگر کوئی قباحت کی چیز ہے تو وہ سود ہے، اسے ختم کر دیا جائے تو بیمہ اپنی تمام اقسام کے ساتھ جائز ہے، یہ لوگ عقد موالات پر قیاس کرتے ہیں کہ جس طرح عقد موالات میں ایک غیر شخص دیت کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں میراث کا حصہ دار بن جاتا ہے اسی طرح بیمہ کا معاملہ سمجھ لیا جائے، نیز وہ لوگ اس معاملہ کو ودیعت باجر اور ضمان خطر الطریق کی صورت میں داخل فرماتے ہیں، اجرت کے عوض ودیعت کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اپنے مال کو کسی دوسرے شخص کے پاس امانت رکھا جائے اور امانت کی حفاظت کی اجرت مقرر کر دی جائے، اس صورت میں اگر مال ضائع ہو جائے تو امین ضامن ہوتا ہے اور نقصان کا معاوضہ دینا اس کے ذمہ ضروری ہوتا ہے، اور ضمان خطر الطریق کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی نے کسی دوسرے شخص سے کہا کہ فلاں راستہ سے سفر کرو یہ راستہ قابل اطمینان ہے، اگر راستہ قابل اطمینان نہ ہوا، اور خدا نخواستہ تمہارا مال لوٹ لیا گیا تو میں تمہارے مال کا ضامن ہوں گا، تو اس صورت میں اگر اس کا مال لوٹ لیا گیا تو وہ مال کا ضامن ہوگا اور نقصان کی تلافی، اس کے ذمہ واجب ہوگی، لہذا جس طرح امین اور ضامن سے نقصان کی تلافی میں رقم لینا درست ہے، ان حضرات کے نزدیک بیمہ پالیسی خریدنے والوں کے لئے بھی بیمہ کمپنی سے نقصانات کا معاوضہ لینا جائز اور صحیح ہے۔

عصر جدید کے جن علماء نے بیمہ پالیسی کو امداد باہمی کا معاہدہ بتایا ہے اور ”مولی

الموالات“ کے احکام پر قیاس کر کے عقد موالات کی طرح بیمہ کو جائز قرار دیا ہے یہ قیاس بہ ظاہر صحیح نہیں ہے، کیونکہ احادیث کی روشنی میں ”عقد موالات“ صرف ان نو مسلموں کے لئے جائز قرار دیا گیا ہے جن کا کوئی وارث مسلمان موجود نہ ہو، اور جس کا کوئی وارث مسلمان ہو، خواہ قریب کا ہو یا دور کا، تو ورثہ کی حق تلفی کی وجہ سے اس کا ”عقد موالات“ باطل قرار پائے گا، اس لئے بیمہ کی شکل کو امداد باہمی کہنا درست نہیں، یہ تو درحقیقت بیمہ اور سٹہ سے سودی کاروبار پر آنے والی نحوست کو پوری قوم کے سر ڈالنے کا ایک خوب صورت حیلہ ہے، ایک شخص پر پڑنے والا نقصان پوری قوم و ملت کے سر ڈالا جاتا ہے، ابتداء میں بیمہ کی اصلیت واقعی ایک تعاون باہمی تھی، لیکن جب یہ نظام یہودیوں کے ہاتھ میں آیا تو انھوں نے اس نظام کو جس کی بنیاد ”تعاون علی البرّ والتقویٰ“ پر تھی ایسے نظام میں تبدیل کر ڈالا جس میں ربوا اور قمار جیسے سنگین گناہ پائے جاتے ہیں اور اب تو بیمہ کمپنی بینک کی طرح سے مستقل سودی کاروبار کا ایک ادارہ بن چکا ہے۔

بیمہ کے مسئلہ کو امانت کی اجرت پر قیاس کرنا بھی درست نہیں، کیونکہ یہاں مال بیمہ کمپنی کی تحویل میں نہیں ہوتا، بلکہ بحری جہاز کے مالک یا اس کے ملازموں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اگر بالفرض یہ صورت ہو کہ بیمہ کمپنی کا جہاز بھی ہو تب بھی ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینا جائز نہ ہوگا، کیونکہ بیمہ کمپنی اس صورت میں اجیر مشترک ہوگی اور اجیر مشترک ناگہانی حوادث کی وجہ سے مال ضائع ہو جانے کی صورت میں ضامن نہیں ہوتا۔ ”ضمان خطر الطريق“ پر قیاس کرنا بھی سمجھ میں نہیں آتا، کیونکہ یہ مطلقاً نہیں ہے، اگر راستہ کا اطمینان دلانے والا ”أنا ضامن“ کا لفظ نہ بولے تو مال لٹ جانے پر اطمینان دلانے والا ضامن نہیں ہوگا، ہاں اگر لفظ ”و انا ضامن“ صراحت کے ساتھ بولے تو اس ضمانت لینے پر وہ ضامن ہوتا ہے، رہا عام خطرہ تو وہ تاجر اور بیمہ کمپنی دونوں کو ہوتا ہے، تاجر جب ہی بیمہ کراتے ہیں جبکہ انھیں خطرہ ہو اور ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینے کی طمع ہو، لہذا بیمہ کے مسئلہ کو ”ضمان خطر الطريق“ پر بھی قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا۔

بیمہ پالیسی کی موجودہ صورت حال ایک جدید مسئلہ ہے اور غالباً اس صدی کی پیداوار

ہے، اس لئے ہماری فقہ و فتاویٰ کی متداول کتابیں اس سے خالی ہیں، کہیں اس کا ذکر فقہاء متاخرین کی کتابوں میں نہیں ملتا، علامہ شامیؒ نے جس بیمہ کا ذکر اپنی کتاب ”رد المحتار“ میں کیا ہے، ان کے زمانہ میں سودی بیمہ نہیں تھا۔ پھر التزام مالا یلزم کی صورت پائے جانے کی وجہ سے ان تاجروں کو ہلاک شدہ مال لینا جائز نہیں، لیکن اسلام دنیائے انسانیت کے لئے وہ پیغام حیات ہے جو قیامت تک آنے والی نسلوں کو زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی کرتا ہے اور ہر زمانہ اور ہر ماحول میں کافی وافی روشنی دکھاتا ہے، اسلامی پیغامات اور ربانی ہدایات میں ہماری ماڈی، روحانی، شخصی، اجتماعی، اقتصادی، معاشی، سیاسی ہر قسم کی ضروریات کا سامان ہدایت موجود ہے۔ جب ہم اسلامی اصول و ضوابط کے آئینہ میں موجودہ بیمہ پالیسی کی شکل و صورت کو دیکھتے ہیں تو آج کل کل بیمہ کمپنی کا موجودہ طریقہ کار خالص ناجائز کاروبار نظر آتا ہے، اسی لئے فی نفسہ اکثر علماء نے اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے، علماء نے عدم جواز کی حسب ذیل وجہیں ذکر فرمائی ہیں:

۱- بیمہ کی تمام صورتوں میں جو منافع یا بونس دیا جاتا ہے وہ بیع و تجارت کے اصول پر نہیں، بلکہ ربوا کے طور پر دیا جاتا ہے، کیونکہ ربوا اس زیادتی کا نام ہے جو تجارتی نقصان سے قطع نظر کر کے اپنی رقم کی میعاد معین کر کے معاوضہ میں وصول کی جائے، خواہ کاروبار میں کتنا ہی نفع یا نقصان ہو، یہاں بیمہ میں بھی اسی طرح سے رقم وصول کی جاتی ہے، اور ربوا کی حرمت نص قرآنی سے ثابت ہے۔ وَ أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبَا (سورہ بقرہ: ۲۷۵)۔

۲- بیمہ میں قمار کی صورت پائی جاتی ہے، کیونکہ اس میں خطر ضرور پایا جاتا ہے۔ بیمہ پالیسی خریدنے میں نفع کا معاملہ غیر معین و غیر معلوم چیز پر معلق رہتا ہے، حوادث کا حال کسی کو معلوم نہیں کہ واقع ہوں گے یا نہیں، اور ہوں گے تو کب اور کس شکل کے، ایسی مبہم اور نامعلوم چیز پر کسی نفع کو معلق کرنا شریعت میں قمار کہلاتا ہے، قمار کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔ ارشاد ربّانی ہے:

”إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ“ (المائدہ: ۹۰)۔

اس آیت میں قمار کو شیطانی عمل اور بت پرستی کے برابر مجرم قرار دیا گیا ہے۔

۳- بیمہ میں پالیسی خریدنے والے اور بیمہ کمپنی کے درمیان معاہدہ میں بعض فاسد شرطیں پائی جاتی ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص بیمہ پالیسی کی کچھ رقم جمع کرنے کے بعد باقی قسطوں کی ادائیگی بند کر دے تو اس کی جمع کی ہوئی رقم سوخت ہو جاتی ہے، اس طرح جمع کردہ رقم کو جرمانہ میں ضبط کر لینا یقیناً ناجائز اور خلاف شرع ہے۔

۴- بیمہ میں ”صفقتان فی صفقة“ کا معاملہ پایا جاتا ہے، یعنی ایک معاملہ کے ختم ہونے سے پہلے اس میں دوسرا معاملہ داخل کر دیا جاتا ہے جس کی ممانعت حدیث شریف میں آئی ہوئی ہے۔

۵- بیمہ میں آئندہ پیش آنے والے حوادث کی پیش بندی کی جاتی ہے جبکہ حوادث کا وقوع غیر متعین اور نامعلوم ہے، عقیدہ تقدیر کے پیش نظر آنے والے حوادث اللہ کے سپرد ہونے چاہئیں، بیمہ کرانے میں ایک گونہ اس عقیدہ سے فرار کی شکل پائی جاتی ہے۔

۶- بیمہ پالیسی خریدنے والوں کے ذریعہ نظام میراث درہم برہم ہو جاتا ہے، کیونکہ بیمہ کی رقم صرف نامزد شخص کو ملتی ہے، جبکہ تمام ہی جائز ورثہ متروکہ مال میں اپنا حصہ شرعی لینے کے حق دار ہیں۔

ان بہت سے ناجائز امور پر مشتمل ہونے کی وجہ سے بیمہ پالیسی کے معاملہ کی تمام صورتیں شرعاً ناجائز و حرام ہیں، بلا ضرورت شدیدہ اور بلا قانونی مجبوری کے ایسا کرنا سخت گناہ ہے۔ لیکن ہندوستان جیسے غیر مذہبی ملک میں جہاں دشمنان اسلام نے مسلمانوں کی جان و مال کو تلف کرنے پر ہی کمر باندھ رکھی ہے، اور مسلمان خطرات میں ایسے گھرے ہوئے ہیں کہ اپنی جان

ومال کی حفاظت کرنے میں یا قانونی شکایوں میں کسے ہونے کی وجہ سے بے بس ہیں، تو مجبوری کا حکم دوسرا ہوگا، جن صورتوں میں قانونی اعتبار سے مجبور محض ہیں، مثلاً ہوائی جہاز کے ذریعہ سفر بغیر بیمہ زندگی نہیں ہو سکتا، سرکاری ملازمت بغیر بیمہ زندگی کے نہیں ملتی، یا ملازمت بحال نہیں رہ سکتی اور بغیر ملازمت کے گزارہ مشکل ہو، یا تمام ایسے کاروبار جن میں بیمہ زندگی کرانا قانوناً ضروری ہے، اس طرح کے حالات کے پیش نظر اپنے جان و مال کا تحفظ ضروری ہے اور بیمہ کرانے کے علاوہ کوئی مفر نہ ہو، یعنی اس کے بغیر جان و مال، عزت و آبرو اور اہل و عیال کو شدید ناقابل برداشت نقصان کا قوی اندیشہ ہو اور بیمہ کرا لینے کی صورت میں جان و مال اور اہل و عیال کے تحفظ کا ظن غالب ہو اور معاشرہ قائم رکھنے کے لئے اور کوئی صورت اپنی جان و مال کی حفاظت کی نہ ہو تو ایسی ضرورت شدیدہ اور سخت مجبوری و اضطرار کے مخصوص حالات میں محض اپنی جان و مال کی حفاظت اور دفع مضرت کی نیت سے جان و مال کا بیمہ کرانے کی بقدر ضرورت گنجائش دی جاسکتی ہے۔

لیکن بیمہ کمپنی کے قواعد کے مطابق محض نفع لینے کی نیت سے کسی قسم کا بیمہ کرانے کی اجازت نہ ہوگی، مفتی عبدالرحیم صاحب لاچپوری، مفتی نظام الدین صاحب، نیز ”مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ“ نے بھی خاص حالات میں اس کی گنجائش دی ہے، جس طرح شریعت میں ضرورت شدیدہ اور مجبوری کی بنا پر بعض ممنوع اور حرام اشیاء کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے، مثلاً اکل میتہ کی بقدر ضرورت گنجائش ہے، بعض حالات و مصالح کی بناء پر غیبت کرنے اور جھوٹ بولنے کو مباح قرار دیا گیا ہے، اسی طرح یہاں بھی اضطرار و مجبوری اور ضرورت شدیدہ کی بنا پر بیمہ زندگی اور بیمہ املاک کرانے کی گنجائش ہوگی، لیکن ضرورت شدیدہ اور مجبوری کا معیار قائم کرنے کے لئے پوری دیانت داری کے ساتھ مہتملی بہ کو اپنے مقامی یا قریب پاس کے معتمد و مستند علماء محققین اور معتبر مفتیان کرام سے مشورہ لینا ضروری ہے، یہ گنجائش فقہی قاعدہ ”الضرورات تبیح المحظورات“ اور دوسرا قاعدہ ”الضروریات“ اور ”المشقة



تجلب التیسیر“ کے پیش نظر دی گئی ہے، جہاں شدید خطرات نہ ہوں لوگ اضطراب و مجبوری کے حالات میں نہ ہوں تو محض امکان و احتمال کی بنیاد پر کسی طرح کا بھی بیمہ کرانے کی شرعاً اجازت نہ ہوگی جیسا کہ اوپر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا۔

بیمہ کرانے کے بعد جانی نقصانات ہونے پر بیمہ کمپنی جو رقم دیتی ہے اس میں قدرے تفصیل ہے، جیون بیمہ میں پالیسی مکمل ہونے کے بعد یا طبعی موت کے بعد جمع کردہ رقم سے زائد رقم ملتی ہے وہ قمار اور سود میں داخل ہو کر ناجائز ہوگی، لہذا وہ رقم فقراء پر واجب التصدق ہوگی، اور جو لوگ فرقہ وارانہ فساد میں ظلماً مارے جاتے ہیں تو حکومت پر قانوناً جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری ہے اور اس کی عدم حفاظت سے جان ضائع ہوتی ہے، لہذا جمع کردہ رقم سے زائد رقم بطور تعاون حسب معاہدہ حکومت کی بیمہ کمپنی سے لے لینا درست ہوگا، اور جو لوگ بیمہ کرانے بغیر ظلماً مارے جاتے ہیں اور ان کے عوض حکومت خود اپنے قانون کے مطابق دیتی ہے وہ بھی شرعاً حکومت کا عطیہ ہوگا اور مقتول کے ورثاء کو لینا درست ہوگا۔

اسی طرح ہماری املاک کے تحفظ کی ذمہ داری بھی حکومت پر ہے، لہذا فرقہ وارانہ فساد میں املاک کے ضیاع کی صورت میں جس قدر مالیت کا بیمہ کرایا گیا ہے املاک کے تباہ ہو جانے کی صورت میں حکومت کی بیمہ کمپنی سے ملنے والی رقم کو ایک تعاون قرار دے کر لینا مباح ہوگا۔ واضح رہے کہ فساد کے علاوہ مالک کے فعل سے اگر املاک کا نقصان ہوا، یا نجی طور پر یا کسی غلطی سے جان ضائع ہوئی تو یہ صورت اس سے مستثنیٰ رہے گی۔

اس زائد رقم کو پراویڈنٹ فنڈ پر قیاس کرنا صحیح نہیں، کیونکہ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم سرکاری ملازمین کے قبضہ میں آنے سے پہلے حکومت وضع کر لیتی ہے اور وہی اس میں اضافہ بھی کرتی ہے، گویا جو رقم وضع کی وہ بھی حکومت کی رقم ہے اور جو اضافہ کر کے دی ہے وہ بھی حکومت کی رقم ہے، لہذا مدت ملازمت کے ختم ہونے پر حکومت نے جو رقم وضع کی ہوئی مع اضافہ کے دی اس میں شرعی سود کا تحقق نہیں ہوتا، وہ حکومت کی طرف سے ایک طرح کا انعام ہے اور بیمہ پالیسی کا

معاملہ حقیقت میں ایک سودی کاروبار ہے، اسی طرح جس طرح پر کہ موجودہ بینک کا کاروبار ہو رہا ہے، دونوں میں جو فرق ہے وہ محض شکل کا ہے، حقیقت کے لحاظ سے سودی کاروبار کرنے میں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

بیمہ کا معاملہ جن حضرات کے پیش نظر ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ بیمہ میں دو طرح سے سود پایا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ بیمہ کمپنی بیمہ داروں سے جو رقم وصول کرتی ہے وہ ضرورت مندوں کو سود پر قرض دیتی ہے، دوسرے یہ کہ بیمہ داروں کو ان کی کل اقساط کی ادائیگی پر جو رقم زائد بہ طور منافع دیتی ہے وہ سود ہے، کیونکہ بیمہ دار جو رقم قسطوں کی صورت میں جمع کرتا ہے وہ دین ہے اور دین میں میعاد کے مقابلہ میں جو منافع بہ طور مشروط یا معروف دیا جاتا ہے وہ شریعت کی اصطلاح میں سود ہے جس کی حرمت کتاب و سنت اور اجماع امت سے ثابت ہے، علاوہ ازیں بیمہ میں قمار کی شکل پائی جاتی ہے، نفع نقصان کا معاملہ غیر معین و غیر معلوم چیز پر معلق رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ میں یہ شکل نہیں پائی جاتی، اس لئے بیمہ پالیسی میں ملی ہوئی زائد رقم بلاشبہ سود و قمار میں داخل ہوگی اور پراویڈنٹ فنڈ عطیہ اور انعام میں شمار ہوگی، لہذا دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔

اسی طرح حمل و نقل کا کام کرنے والی جو کمپنیاں متعلقہ سامانوں کا بیمہ کرتی ہیں اور اجرت سے زائد رقم لیتی ہیں اور سامانوں کے ضیاع و نقصان کا ذمہ لیتی ہیں اس صورت میں بھی معاملہ کرنے والی کمپنیوں سے نقصان کا معاوضہ لینا جائز نہ ہوگا، اس صورت میں بیمہ کمپنی کی حیثیت اجیر مشترک کی ہوگی اور یہ مسئلہ کتب فقہ میں اپنی جگہ مصرح ہے کہ ناگہانی آفات سے مال ضائع ہو جانے کی صورت میں اجیر مشترک ضامن نہیں ہوگا۔

علامہ شامی کے زمانہ میں بنام ”سوکرہ“ بیمہ کی جو شکل رائج تھی اس میں سود و قمار نہ تھا، بلکہ صرف امداد باہمی اور تعاون علی البر کی شکل تھی، اور آج بیمہ کمپنیاں باقاعدہ سودی کاروبار کر رہی ہیں، لہذا آج کی بیمہ کمپنیاں جو معاوضہ دے رہی ہیں وہ سراسر سود اور قمار میں داخل ہوگا اور اس پر ناجائز و حرام کا حکم لگایا جائے گا۔

## انشورنس کی حقیقت اور اس کا شرعی حکم

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی ☆

سب واقف جانتے ہیں کہ ”انشورنس“ ان معاملات میں سے ہے جن کا وجود، بلکہ تذکرہ بھی زمانہ نبوت اور خیر القرون میں نہیں تھا، بلکہ اس کے بہت بعد ۱۲ویں صدی ہجری تک کی فقہ وفتاویٰ کی معروف کتابوں میں بھی اس کا ذکر نہیں ملتا، غالباً مشہور و متداول کتابوں میں تیرہویں صدی کے علامہ ابن عابدین شامی (۱۲۵۲ھ) کی شہرہ آفاق تالیف ”رد المحتار“ وہ پہلی کتاب ہے، جس سے انشورنس سے فی الجملہ مشابہ ایک معاملہ کا تذکرہ (سوکرہ کے نام سے) ملتا ہے (رد المحتار ۳/۲۳۹)، اس معاملہ کا حکم علامہ شامی نے یہ بتایا ہے: والذی یظہر لی لا یحل للناجر أخذ بدل الہالک۔

لیکن چونکہ اسلام یعنی شرعی قوانین میں قیامت تک پیش آنے والے ہر قسم کے حالات و معاملات کے بارے میں اصولی راہنمائی دی گئی ہے، اس لئے دیگر پیش آمدہ معاملات و مسائل کی طرح اس معاملہ ’انشورنس‘ کا حل بھی اسلامی شریعت کے اصول کی روشنی میں تلاش کرنا علمائے امت کی ذمہ داری ہے، بجز اللہ ہر زمانے میں علماء امت نے جس طرح اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی سعی میں کوتاہی نہیں کی، اسی طرح رواں صدی میں عام ہونے والے اس مسئلہ ’انشورنس‘ کا شرعی حل معلوم کرنے کی طرف متوجہ ہونے میں بھی دیر نہیں لگائی، چنانچہ اس

☆ استاذ حدیث و تفسیر، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

درمیان عرب و عجم کے متعدد بڑے علماء نے اس کا حکم تحقیق و بحث کے بعد تفصیل سے بیان کر کے اپنا فرض کفایہ ادا کیا، ان جلیل القدر علماء کی آراء اور بحث و تحقیق کے منظر عام پر آجانے کے بعد یہ سمجھنا غالباً درست نہ ہوگا کہ اب مزید بحث و تحقیق یا گفتگو کی ضرورت اور گنجائش باقی نہیں رہی، شاید اسی احساس کے پیش نظر ادھر ربع صدی کے اندر چھوٹے بڑے بہت سے علماء نے زیر بحث مسئلہ پر اپنی اسی محنت و صلاحیت صرف کر کے رائیں پیش اور شائع کی ہیں، خود راقم الحروف بھی دس سال سے زیادہ عرصہ سے اس مسئلہ کو بحث و فکر اور مطالعہ کا موضوع بنائے ہوئے ہیں۔ ذیل میں اپنے غور و فکر کا حاصل اور خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے:

### انشورنس کی حقیقت اور اس کی قسمیں:

انشورنس کا حکم دریافت کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کی اصل شکل یا حقیقت تفصیل کے ساتھ سامنے آئے تاکہ اس پر اصول شرع کی روشنی میں غور و فکر کیا جانا ممکن ہو۔

یہاں ہندوستان میں انشورنس کی عموماً دو قسمیں رائج ہیں:

۱- جان کا انشورنس (جان کا بیمہ)، ۲- مال کا انشورنس (مال کا بیمہ)۔

### جان کا انشورنس:

اس کی جو صورت عموماً رائج ہے، وہ یہ ہے کہ بیمہ کمپنی کسی شخص کی صحت اور تندرستی کی ڈاکٹروں سے جانچ کروانے کے بعد، عمر کا اندازہ کر کے (مثلاً یہ شخص مزید ۳۰ سال زندہ رہے گا) اس شخص سے اس طرح کا معاہدہ کرتی ہے کہ وہ اتنی مدت تک (جو مدت کمپنی اور بیمہ کرانے والے کے درمیان طے ہو جاتی ہے) ہر ماہ، یا ہر تین ماہ بعد یا ہر سال اتنی رقم (جو مدت کمپنی اور اس کے درمیان طے ہو جاتی ہے) کمپنی کو ادا کرتا رہے (اسے پریمیم کہا جاتا ہے)، اگر اس درمیان یعنی بیمہ کرانے والے شخص کی عمر کا اندازہ کر کے جو مدت مقرر کی گئی ہے اس سے پہلے بیمہ کرانے والے شخص کا انتقال ہو جائے، خواہ کسی حادثہ کی وجہ سے یا طبعی طور پر، تو بیمہ کمپنی مرنے والے کی

طرف سے نامزد کردہ شخص کو (یا اس کے ورثہ کو) اتنی رقم (مثلاً ۵۰ ہزار روپیہ) ادا کرے گی، اگر وہ (بیمہ کرانے والا) زندہ رہا تو بھی جمع شدہ مقدار کی برابر رقم یا کم و بیش کمپنی اسے دیدے گی، لیکن اگر پرییم ادا کرنے میں بیمہ کرانے والے شخص نے کوتاہی کی تو کمپنی وہ پوری رقم ضبط کر لے گی جو پرییم کے طور پر اسے دی گئی ہے، مزید یہ کہ بیمہ کرانے والے کی موت ہو جانے پر بھی اس صورت میں کمپنی اس کے نام زد کردہ شخص (یا ورثہ) کو کچھ نہیں دے گی۔

### مال کا انشورنس:

اس میں عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ بیمہ کمپنی کسی دکان یا جائداد یا کسی اور قسم کے قیمتی مال کے مالک سے اس طرح کا معاہدہ کرتی ہے کہ مالک مال ہر ماہ (یا ہر سال جو بھی وقفہ طے کر لیا جائے) ایک مقرر مدت تک متعین رقم کمپنی کو ادا کر دے، جسے ”پرییم“ PREMIUM کہا جاتا ہے (رقم کی مقدار اور مدت کی تعیین دونوں کے، یعنی کمپنی اور مالک مال کے درمیان طے ہوتی ہے) پرییم ادا کرتے رہنے کی صورت میں مقررہ مدت کے اندر وہ مال جس کا بیمہ کرایا گیا ہے، اگر تلف ہو جائے، یا اس میں نقصان ہو جائے تو بیمہ کمپنی اس کی تلافی مقررہ اصول کے مطابق کر دیتی ہے، لیکن اگر متعین مدت کے اندر بیمہ شدہ مال میں کسی طرح کا نقصان نہ ہو تو پرییم کے طور پر مالک مال کی طرف سے ادا کردہ رقم کمپنی مالک مال کو نہیں لوٹاتی، اسی طرح اگر بیمہ کرانے والا (مالک مال) پرییم ادا کرنے میں کوتاہی کرے تو بھی بیمہ کمپنی اس کو جمع شدہ رقم واپس نہیں کرتی بلکہ معاہدہ کے مطابق پرییم ادا نہ کرنے کی صورت میں کمپنی مال کا نقصان یا اس کے تلف ہو جانے کی تلافی بھی نہیں کرتی۔

ممکن ہے کہ انشورنس کی مذکورہ بالا قسموں شکلوں کے علاوہ اور بھی رائج ہوں۔ لیکن ہم یہاں صرف دونوں قسموں کی۔ ان دو شکلوں کو ہی زیر بحث لا کر ان کا حکم شرعی دریافت کرنے کی کوشش کریں گے۔ امید ہے کہ اس بحث کی روشنی میں بیمہ کی مذکورہ شکلوں کے علاوہ دیگر شکلوں کا حکم دریافت کرنا بھی ممکن ہوگا۔

تجزیہ:

انشورنس کی مذکورہ بالا دونوں قسموں کے معاہدہ کی تحلیل و تجزیہ کے بعد حسب ذیل اجزا

نکلتے ہیں:

۱- معاہدہ کے ایک فریق، یعنی پالیسی ہولڈر کی طرف سے کمپنی کو ہر ماہ یا جو بھی وقفہ متعین ہو اس کے بعد ایک مقررہ رقم پر بیم کے طور پر ادا کیا جانا۔

پھر وہ خطرہ پیش آجانے کے بعد کہ جس سے بچنے اور اس کی تلافی کے لئے انشورنس کرایا گیا ہے، کمپنی کی طرف سے پالیسی ہولڈر کو خطیر رقم کا ملنا، جو عموماً پر بیم کے طور پر جمع شدہ رقم سے بہت زیادہ ہوتی ہے، کمپنی کی طرف سے پالیسی ہولڈر کو کچھ نہ ملنے کی صورت میں ایک ہی (کمپنی) کی جانب رقم کا آنا، دوسری جانب پالیسی ہولڈر کی جانب اس کا کوئی حقیقی بدل نہ پہنچنا۔

۲- دونوں طرف سے (کمپنی اور پالیسی ہولڈر کی طرف سے) دی جانے والی چیزوں کا ہم جنس ہونا (ملکی سکہ ہی میں دونوں اپنا اپنا واجب ادا کرتے ہیں)۔ واضح رہے کہ ایک ملک کی کرنسی کو ”ہم جنس“ مانا گیا ہے اور اس پر اب تقریباً دنیا بھر کے بیشتر علماء و فقہاء متفق ہو گئے ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: ”قرارات المجلس الفقهي الاسلامي، لرابطة العالم الاسلامي“۔ من دورتنا الأولى حتى الدورة الثامنة: ۹۶، ۹۷، القرار السادس، حول العملة الورقية)۔

۳- دونوں طرف سے ادا کی جانے والی چیز (ملکی سکہ) کا اموال ربویہ میں سے ہونا، کیونکہ ملکی سکہ، خواہ کسی بھی ملک کا ہو، ثمن اصلی کے (سونے چاندی کے)۔ حکماً۔ قائم مقام تسلیم کر لیا گیا ہے، یہ بات بھی اب تقریباً متفق علیہ ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: ”قرارات المجلس الفقهي الاسلامي، لرابطة العالم الاسلامي“۔ من دورتنا الأولى حتى الدورة الثامنة: ۹۶، ۹۷، القرار السادس، حول العملة الورقية)۔

۴- یہاں اس وضاحت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ سارا لین دین کمپنی اور پالیسی

ہولڈر کے درمیان ایک معاہدہ کی رو سے ہوتا ہے۔

## سود اور انشورنس کا تقابل:

انشورنس کے ان اجزاء کا ہم جب ربا (سود) کی تعریف و اجزاء سے تقابل کرتے ہیں تو ہمیں ان دونوں (انشورنس اور ربا) کے درمیان پوری مطابقت نظر آتی ہے، کیونکہ ربا کی جس تعریف پر قریب قریب تمام فقہاء متفق نظر آتے ہیں وہ یہ ہے کہ ”اموال ربویہ میں سے کسی چیز کا ہم جنس کے ساتھ تبادلہ کرنے کا معاہدہ کیا جائے اور اس میں کسی ایک جانب سے بلا عوض اضافے کا دینا بھی مشروط ہو، یعنی اضافہ کی شرط جزو معاہدہ ہو (یہ تعریف متعدد مشہور و معتبر کتب فقہ سے ماخوذ ہے مثلاً بدائع الصنائع ۵/۱۸۳، الملک العلماء الکاسانی (ت ۵۸۷ھ) رد المحتار ۲/۱۷۶، للعلامة ابن عابدین الشامی (ت ۱۲۵۲ھ) سے لیکن بنیادی طور پر فقیہ محمد بن عبداللہ التمر تاشی (ت ۱۴۰۰ھ) کی معروف کتاب ”تویر الابصار سے ماخوذ ہے۔ کتاب مذکورہ کی رو سے ربا کی تعریف یہ نکلتی ہے۔ ”ہو فضل خال عن عوض لاحد المتعاقدين في عقد المعاوضات بمعیار شرعی“ تعریف مذکورہ کا پوری طرح قرآن و سنت سے ماخوذ ہونا ہم نے اپنے ایک مقالہ شائع شدہ ”البعث الاسلامی“ (عربی ماہ نامہ جو ندوة العلماء لکھنؤ سے نکلتا ہے کے شمارہ نمبر ۱۰ جلد نمبر ۳۲ میں بالتفصیل ثابت کر دیا ہے۔ ازراہ اختصار یہاں وہ تفصیل نہیں پیش کی جا رہی ہے۔ کچھ تفصیل راقم کے سلسلہ ”بنک انشورنس اور سرکاری قرضے کے ص ۶۴ تا ۶۸ پر دیکھی جاسکتی ہے)۔

غور کرنے سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ ربا (سود) کی تعریف کا تحلیل و تجزیہ کرنے کے بعد حسب ذیل اجزاء نکلتے ہیں:

- ۱- ہم جنس چیز کا تبادلہ ہم جنس کے ساتھ کئے جانے کا معاہدہ۔
- ۲- وہ چیز اموال ربویہ میں سے ہو۔
- ۳- اضافہ ایک ہی جانب ہو، دوسری جانب اس کا کوئی ایسا عوض نہ ہو جو شرعاً عوض کہلا سکے۔
- ۴- یہ اضافہ معاہدہ کی رو سے ہو۔

ربا کے ان اجزاء کا انشورنس کے اجزاء سے گہری نظر کے ساتھ تقابل کرنے کے بعد ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں میں پوری مطابقت ہے، کیونکہ انشورنس کرانے کے نتیجے میں صرف ایک ہی

طرف رقم زیادہ رہ جاتی ہے، خطرہ پیش آجانے کی صورت میں پالیسی ہولڈر کی طرف، اس طرح پر کہ اس نے پریم کے نام سے ابھی۔ مثلاً صرف پانچ سو روپے ہی کمپنی کو دیئے تھے اس کے بعد ہی وہ خطرہ پیش آ گیا جس سے بچنے، یا جس کی تلافی کے لئے انشورنس کرایا گیا تھا، اس لئے معاہدہ کی رو سے کمپنی نے پالیسی ہولڈر کو، مثلاً بیس ہزار روپے ادا کئے، غور طلب بات یہ ہے کہ یہ ۱/۲۱۹ ہزار روپیہ جو پالیسی ہولڈر کی طرف آئے اس کا کوئی حقیقی عوض کمپنی کو نہیں ملا۔ (اس طرح ربا کے اجزاء میں سے جزء نمبر ۳ پایا گیا) اگر وہ خطرہ پیش نہیں آیا اور پالیسی ہولڈر نے پریم کے طور پر پوری رقم جمع کر دی جس کا از روئے معاہدہ ادا کرنا ضروری تھا (مثلاً دس ہزار روپے ادا کئے) لیکن چونکہ وہ خطرہ پیش نہیں آیا جس کے لئے بیمہ کرایا گیا تھا، اس لئے کمپنی نے پالیسی ہولڈر کو کچھ نہیں دیا، اس طرح کمپنی کے پاس تو پالیسی ہولڈر کی طرف سے، مثلاً دس ہزار روپے پہنچ گئے، مگر پالیسی ہولڈر کو اس کا کوئی حقیقی عوض نہیں ملا، اس لئے ربا کے اجزاء میں مذکورہ ترتیب کے مطابق جزء نمبر ۳ پایا گیا۔ ربا یہ کہنا کہ ”انشورنس کرانے کے نتیجے میں پالیسی ہولڈر کو جو ذہنی اطمینان حاصل ہوا وہ اس رقم (پریم کے طور پر جمع کرائی گئی رقم) کا عوض ہے فقہی اور علمی اعتبار سے کوئی وزن نہیں رکھتا، کیونکہ ذہنی اطمینان ایسی چیز نہیں ہے جسے شرعاً قابل معاوضہ (مستقوم) کہا جاسکے، بعض لوگوں نے (بیمہ کے جواز کا رجحان رکھنے والوں نے) اسے مال کے محافظ کی اجرت کے مشابہ قرار دے کر جواز کا پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن غور کرنے سے باسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے محافظ کی اجرت نہیں قرار دیا جاسکتا، اس لئے کہ (جیسا کہ ظاہر ہے) محافظ عموماً انسان ہوتا ہے اور انسان کے عمل کی اجرت مشروع ہے، کیونکہ حفاظت میں انسان کا وقت اور محنت دونوں خرچ ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک (وقت اور محنت) شرعاً قابل معاوضہ ہے، برخلاف انشورنس والے ”اطمینان“ کے کہ نفس اطمینان کے لئے کوئی عمل یا وقت صرف نہیں ہوتا، پھر اس اطمینان کی نوعیت روپیہ کی شکل میں بدل مل جانے کی ہے، اس طرح پریم کی ادائیگی گویا اس مال کی پیشگی فیس بن جاتی ہے کہ جس کے ملنے کی توقع اسے حادثہ پیش



آجانے کی شکل میں ہے، اس طرح گویا اس کی حیثیت مال کے کرایہ کی ہو جاتی ہے۔ جو صریحاً سود ہے، کیونکہ سود کو مال کا کرایہ ہی قرار دیا جاتا ہے، بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہاں دونوں طرف تبادلہ کی چیز روپیہ ہوتی ہے اور روپیہ اموالِ ربویہ میں سے ہے، اس طرح ربا کے مذکورہ اجزاء میں سے دو جزء (۲، ۱) پائے گئے، یہ بھی ظاہر ہی ہے کہ روپیہ کا لین دین اور اس کے نتیجہ میں ایک طرف اضافہ، معاہدہ کی رو سے ہی ہوتا ہے اس بنا پر ربا کا جزء نمبر ۴ بھی پایا گیا۔ مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ ربا کے معاہدہ کے اندر جتنے اجزاء پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب یہاں (انشورنس میں) بھی پائے جا رہے ہیں، لہذا جو حکم ربا کا ہے وہی اس (انشورنس) کا بھی ہوگا، یا ہونا چاہئے؟۔

### جان و مال کے بیمہ کا فرق اور شرعی حکم:

اوپر جان و مال کے بیمہ کی جو شکلیں بہ طور مثال، فرض کر کے لکھی گئی ہیں، ان میں کہا گیا ہے کہ جان کے بیمہ کی صورت میں کمپنی کی طرف سے بیمہ کرانے والے شخص کی۔ مقررہ مدت کے اندر۔ موت نہ ہونے کی شکل میں بھی اسے (بیمہ کرانے والے کو) پر بیمہ کے طور پر جمع شدہ رقم کے بقدر۔ یا کم و بیش۔ مقدار دی جاتی ہے۔ (لیکن مال کے بیمہ کی شکل میں خطرہ پیش نہ آنے پر کمپنی پالیسی ہولڈر کو کچھ نہیں دیتی)۔

کمپنی کی طرف سے جان کا بیمہ کرانے والے کو اس کے زندہ رہنے کی شکل میں اگر اتنی ہی رقم ملتی ہے جتنی کہ پر بیمہ کے طور پر اس نے کمپنی کو دی تھی، تب تو اس کا لینا شرعاً درست ہے۔ لیکن اگر وہ رقم زیادہ ہے تو اس کا لینا شرعاً درست نہیں، ہاں اگر کمپنی سے وہ (زیادہ رقم) نہ لینے اور کمپنی ہی کے پاس چھوڑ دینے میں اس رقم کے کسی ایسے مصرف میں خرچ کئے جانے کا خطرہ ہو جو شرعی نقطہ نظر سے مضر ہے تو چاہئے کہ کمپنی سے زائد رقم لے کر اسے محتاجوں (صدقہ واجبہ کے مستحق لوگوں) میں تقسیم کر دے، اپنے اخراجات میں نہ لائے، اور اگر کمپنی پر بیمہ کے طور پر جمع

شدہ رقم سے کم دیتی ہے یا بالکل نہیں دیتی (جیسے کہ مال کے بیمہ میں) تو اس کا حکم وہی ہے جو اوپر رہا انشورس کے تقابل کے دوران بیان ہوا، یعنی یہ کہ وہ سود دینے کے حکم میں ہے، ظاہر ہے کہ سود کا لینا اور دینا دونوں ہی شرعاً ممنوع ہیں (اگرچہ لینا زیادہ بڑا گناہ ہے، بہ نسبت دینے کے)۔

### پریمیم کی رقم کا حکم:

پریمیم کے طور پر جو رقم پالیسی ہولڈر کمپنی کو دیتا ہے وہ قرض دینے کے حکم میں ہے، لہذا اس رقم کا وصول کرنا اس کا شرعی حق ہے، اس رقم کی واپسی قرض کی واپسی کے حکم میں ہے، پالیسی ہولڈر کی (پریمیم دینے والے کی) موت کی صورت میں اگر کمپنی یہ رقم واپس کرتی ہے تو اس میں وراثت جاری ہوگی، البتہ پریمیم سے زیادہ وصول ہونے والی رقم کو مرنے والے کے ورثہ فقراء پر صدقہ کر دیں، اپنے خرچ میں نہ لائیں (اللہ یہ کہ وہ خود زکوٰۃ کے مستحق ہوں)۔

### سود کی شناعیت قرآن و حدیث میں:

رہا (سود) شرعی نقطہ نظر سے کس درجہ ناپسندیدہ اور آخرت کے لئے کتنا خطرناک ہے اس کا اندازہ ان آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے ہو جاتا ہے جو اس بارے میں وار ہوئی ہیں، مثلاً قرآن مجید کی ایک آیت (سورہ بقرہ نمبر ۲۸۷) میں سودی رقمیں واپس نہ کرنے والوں کے بارے میں تہدید آمیز انداز اختیار کیا گیا ہے:

”فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ“ (سورہ بقرہ: ۲۷۹)۔

(یعنی سودی رقمیں اگر ان کے اصل مالکوں کو واپس نہ کیں تو اللہ اور اس کے رسول سے

جنگ کے لئے تیار رہو)۔

مزید برآں کہ سود خواروں کو وہ سزا (آخرت میں) دیئے جانے کی وعید سنائی گئی ہے جو

کافروں کو ملے گی۔ ”وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ“ (سورہ آل عمران/۱۳۱)۔

اس آیت کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ نے بجاطور پرفرمایا ہے:

”إن هذه الآية هي أخوف آية في القرآن حيث أوعد الله المؤمنين بالنار المعدة للكافرين إن لم يتقوه“ (تفسیر مدارک التزویل)۔

(یعنی یہ آیت سب سے زیادہ خوفناک ہے، کیونکہ اس میں مسلمان سودخواروں کو اس سزا کی دھمکی دی گئی ہے جو کافروں کو آخرت میں ملے گی) بہ کثرت احادیث نبویہ (علیٰ صاحبہا التحیة) میں بھی سودخواروں کی شدید مذمت آئی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے: ”درهم ربا يأكله الرجل وهو يعلم أشد من ستة وثلاثين زنية“ اور ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے: ”من نبت لحمه من السحت فالنار أولى به“ (مشکوٰۃ ۲۳۶)۔

سود کا ایک درہم جان بوجھ کر کھانا چھینس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ شدید ہے اور جس کا جسم سود کی غذا کھا کر پلا ہو اس کا اصل ٹھکانا جہنم ہے)۔  
اسی لئے سود ہی نہیں، سود کے شبہ تک کو ممنوع قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے: ”دعوا الربا والربية“ (مشکوٰۃ بحوالہ ابن ماجہ) اور اسی بنیاد پر معتبر فقہی کتابوں میں یہ اصل بتایا گیا ہے: ”شبهة الربا وهي ما نعة كالحقيقة“ (ہدایہ ۶۳/۳)۔

یعنی جس طرح سود ناجائز ہے اسی طرح اس کا شبہ بھی ناجائز ہے، بنا بریں آخرت پر ایمان اور قرآن و سنت کی صداقت پر یقین رکھنے والے کسی شخص کا سود ہی سے نہیں اس کی پرچھائیں (شبہ) سے بھی چنا ضروری ہے، اس لئے انشورنس جیسے معاملات سے کامل پرہیز کرنا ہی ایمان و یقین کا تقاضا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اوپر کی تفصیل و تجزیہ کے مطابق اس میں سود کا نہ صرف شبہ ہے، بلکہ اس سے پوری مشابہت موجود ہے۔

### انشورنس اور قمار:

انشورنس کے معاہدہ پر غور کرنے سے اس کے ایک دوسرے معاملہ، یعنی قمار (جوائے)

سے مشابہ ہونے کا بھی پتہ چلتا ہے، کیونکہ معتبر کتب شریعت میں قمار اور اس سے مشابہت رکھنے والے معاملات کی حرمت کا سبب بیان کرتے ہوئے اس کی حقیقت و بنیاد ”تعلیق التملیک بالخطر“ (المبسوط للسرخسی ۵۹/۱۲، ہدایہ ۲۷۶/۳، عنایہ مع الفتح ۱۹۶/۵) بتائی گئی ہے، یعنی کسی چیز کا ایک شخص کی ملکیت سے دوسرے شخص کی ملکیت میں منتقل ہونا کسی ایسی شرط پر موقوف کر دیا جائے جس کا وجود میں آنا یا نہ آنا دونوں محتمل اور غیر یقینی ہوں، صحیح احادیث میں ”بیع ملامسہ، منابذہ“ وغیرہ کی جو ممانعت آئی ہے اس ممانعت کی وجہ شرح حدیث نے یہی بیان کی ہے، مثلاً بخاری شریف کے مشہور شارح حافظ ابن حجر عسقلانی نے صحیح بخاری میں آمدہ ”بیع ملامسہ و منابذہ“ سے ممانعت والی روایات کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

”فہذا من ابواب القمار“ (نیل الاوطار ۲۴۷/۵، بخاری مع فتح الباری ۳۵۹/۴) کیونکہ ان معاملات (بیع ملامسہ و منابذہ وغیرہ) میں بیع کی تکمیل اور اسکے نتیجہ میں ملکیت بیع کا باعث سے مشتری کی طرف منتقل ہونا۔ ایسی شرط پر موقوف ہوتا ہے کہ جس کا وجود میں آنا اور نہ آنا دونوں محتمل اور غیر یقینی ہیں، غور کیجئے کہ انشورنس میں بھی، کمپنی کی طرف سے بڑی رقم کا پالیسی ہولڈر کی طرف منتقل ہونا اس خطرہ کے وجود میں آنے پر موقوف ہوتا ہے جس سے بچنے یا اس کی تلافی کے لئے انشورنس کرایا جاتا ہے، مثلاً جان کے بیمہ کی شکل میں جان کا ختم ہو جانا اور مال کے بیمہ کی شکل میں مال کا نقصان یا اس کا تلف ہو جانا، ظاہر ہے کہ اس خطرہ کا پیش آنا نہ آنا دونوں محتمل اور غیر یقینی ہیں کہ جس پر کمپنی کا پالیسی ہولڈر کو مقررہ رقم دینا مشروط رکھا گیا ہے، اس طرح انشورنس اور قمار میں پوری مماثلت نظر آتی ہے۔

بعض حضرات نے اسے باہمی تعاون کی ایک شکل قرار دے کر جواز کی راہ نکالی ہے، لیکن محض نام کے بدل جانے سے حقیقت شرعی نہیں بدلا کرتی، اگر اس جیسی شکل کے معاملہ کو (کہ جس میں سود اور جوئے دونوں سے مشابہت ہے) کسی جگہ یا کچھ اشخاص تعاون کا نام دیدیں تو محض نام کی تبدیلی سے حکم و حقیقت کا تبدیل ہو جانا صحیح نہیں ہوگا۔

بعض لوگوں نے اسے دیت کے مشابہ قرار دے کر جواز کی گنجائش نکالنے کی کوشش کی ہے، لیکن دیت کی شرعی حقیقت اور انشورس میں زمین و آسمان کا سافرق ہے، راقم نے اپنے مقالہ (شائع شدہ البعث الاسلامی، رمضان ۱۴۰۸ھ) میں اچھی طرح تحلیل و تجزیہ کرنے کے بعد دونوں انشورس اور دیت کا فرق ظاہر کر دیا ہے، اس کے بعد کسی منصف شخص کے لئے دونوں کے حکم میں مماثلت بتانے کی کوئی گنجائش واقعتاً نہیں رہ جاتی ہے، اختصار کی وجہ سے وہ تفصیلات یہاں پیش نہیں کی جا رہی ہیں (تفصیل کے طالب ”البعث“ ملاحظہ کریں)۔

### ایک اہم اصول:

اسلامی شریعت میں ایک اہم اصول یہ ہے کہ اگر کسی چیز یا معاملہ میں حرمت و حلت دونوں پہلو جمع ہوں، یا دونوں کے جمع ہونے کی گنجائش ہو تو حرمت کے پہلو کو ترجیح دی جائے گی اور اس بنا پر اس چیز یا معاملہ کے حرام ہونے کا فیصلہ و حکم کیا جائے گا، یہ اصول براہ راست قرآن و سنت سے ثابت ہے (تفصیل کے لئے راقم کا مقالہ ”شائع شدہ البعث الاسلامی رجب ۱۴۰۸ھ) دیکھئے، مزید تحقیق ڈاکٹر علی احمد الندوی سلمہ کی محققانہ تصنیف ”القواعد الفقہیہ“ کے باب ”ما اجمع محرم و میح الاغلب المحرم“ میں دیکھئے۔

### ضرورتوں کی بنا پر آسانیاں:

مذکورہ بالا تحقیق و تفصیل کے بعد اس میں شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ انشورس کے معاملہ کی جو شکلیں عموماً دنیا میں رائج ہیں اور جن کی تصویر کشی اس مضمون کی ابتداء میں کی گئی وہ سب شرعی لحاظ سے ممنوع ہیں، کیونکہ ان سب کے اندر سود اور جوئے سے قوی مشابہت پائی جاتی ہے، لہذا ہر مسلمان کا انشورس سے بچنا ضروری ہے، لیکن اسلامی شریعت ہی نے بعض مجبوریوں (مثلاً کسی جگہ حکومت کی طرف سے انشورس کو لازم کر دیا جائے تو یہ بھی مجبوری ہے) اور غیر معمولی حالات (ضرورتوں) میں بعض حرام چیزوں کے استعمال کی اجازت دی ہے اور اس کا

ذکر قرآن مجید کی متعدد آیات اور بکثرت احادیث نبویہ میں ملتا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: علامہ سیوطی کی ”الاشباہ والنظائر“ قاعدہ ثالثہ، نیز راقم کی کتاب بنک کا تمہیدی حصہ)۔

ان آیات و احادیث کی ہی روشنی میں فقہاء نے اس طرح کے اصول اخذ کئے ہیں، مثلاً ”الضرورات تبیح المحظورات“ (ضرورتوں کی وجہ سے بعض حرام چیزیں حلال ہو جاتی ہیں) یا ”المشقة تجلب التيسير“ (کسی حکم پر عمل کرنے میں شدید مشقت ہو تو شریعت کی طرف سے اس میں آسانی دے دی جاتی ہے)، لیکن کون سی مجبوری ”ضرورت“ کہلانے کی شرعاً مستحق ہے اور کس پریشانی کو ”مشقت“ کہا جاسکتا ہے، یہ بحث خاصی تفصیل کی محتاج ہے۔ راقم نے اپنی عربی کتاب ”قضایا فقہیہ معاصرہ“ میں خاصی تفصیل بالذلال پیش کر دی ہے۔ تفصیل کے طالب اسے ملاحظہ فرمائیں (قضایا فقہیہ معاصرہ ۱۳-۲۰ ناشر دارالقلم دمشق)۔

یہ مختصر مقالہ ان تفصیلات کا محل نہیں، البتہ مختصراً اتنی بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اگر دکان، یا جائیداد کا انشورنس کرا لینے کے بعد بلوہ و فساد کے دوران انشورڈ جائیداد کا بلو ایوں کے ہاتھوں سے برباد ہو جانے کا خطرہ ٹل جائے تو جائیداد، دکان وغیرہ کے انشورنس کرا لینے کی شرعاً گنجائش نظر آتی ہے، لیکن انشورنس کے نتیجے میں پریمیم کے طور پر جمع کی جانے والی رقم سے کمپنی کی طرف سے ملنے والی زیادہ رقم کا استعمال انشورنس کرانے والے کے لئے جائز ہوگا یا نہیں؟ یہ بات محل غور ہے، شرعی اصول کا یہ ظاہر تقاضہ تو عدم جواز ہی نظر آتا ہے (شروع مضمون میں علامہ شامی کی ذکر کردہ رائے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، یہاں یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے، علامہ شامی نے عدم جواز ہی کی بات نقل کی ہے)۔

چونکہ حکومت جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے بلووں اور فسادات میں تلف ہو جانے والی جانوں اور مالوں کا معاوضہ دیتی ہے (جان کا معاوضہ تو خطیر رقم دیتی ہے) اس لئے انشورنس کمپنی کی طرف سے ملنے والی رقم کی یہ توجیہ نہیں کی جاسکتی کہ وہ حکومت کی ذمہ داری کو پورا کرتی ہے، نیز یہ کہ حکومت کی یہ ذمہ داری تو تمام شہریوں کے لئے

ہے، نہ صرف ان کے لئے جن کا انشورنس ہو چکا ہے، مزید یہ کہ کسی کمپنی کے نیشنلائزڈ ہونے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس کمپنی کے تمام املاک پر بہمہ وجوہ حکومت کی ملکیت ہوگئی اور شیئر ہولڈر اپنی ملکیت کے استحقاق سے محروم ہو گئے، بلکہ اصلاً انتظامات اور تصرفات حکومت کی طرف منتقل ہوتے ہیں، اسے پراویڈنٹ فنڈ پر بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ پراویڈنٹ فنڈ (مع اضافہ) کی رقم لینے کے جواز کی توجیہ اس رقم کا عمل کا بدل ہونا (یا اجرت مؤخرہ ہونے) سے کی جاتی ہے، ہاں اگر کسی حکومت کی طرف سے جبراً ملازم کی تنخواہ ادا کر دیئے جانے سے پہلے، پریکیم کے نام سے رقم کاٹ لی جاتی ہو اور ایسا کرنا شرائط ملازمت میں سے قرار دے دیا گیا ہو تو اس نام پر پریکیم کے نام سے جمع شدہ رقم کی مقدار سے زیادہ رقم حکومت ملازم کو اختتام ملازمت پر، یا پہلے سے معین کردہ مدت کے بعد دیتی ہو تو اسے عنوان کی تبدیلی قرار دے کر، پراویڈنٹ فنڈ سے مشابہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

جبری سے، خواہ وہ فرد ہو یا کمپنی، نقصان کی تلافی کرانے کی جو شکلیں شرعاً درست ہیں ان میں سے کسی نقل و حمل والی کمپنی سے نقصان کا معاوضہ لینا درست ہوگا ورنہ نہیں۔



## انشورنس اسلامی نقطہ نظر

مفتی عزیز الرحمن ☆

انشورنس اور بینکنگ کوئی موجودہ زمانہ کی دریافت نہیں ہیں، بلکہ ان کی سیدھی سادی شکلیں زمانہ قدیم میں بھی ملتی ہیں۔ موجودہ نام نہاد متمدن اور مہذب دور نے ان کی شکلوں کو سرمایہ داروں کی تحویل میں دے کر ان کے اصل رنگ و روپ کو بگاڑ دیا ہے، دیہات، قصبات اور غیرت مند خاندانوں میں آج بھی ان کی اصل شکل موجود ہے۔

بہت سے خدا ترس اور انسانیت نواز افراد انسانوں کی فلاح بہبود کے لئے مختلف افراد سے تھوڑے تھوڑے پیسے لے کر جمع کر لیتے ہیں اور غرباء کی امداد، تجہیز و تکفین اور کسی آفت زدہ کی امداد پر صرف کرتے رہتے ہیں، مسلمانوں کا تعلیمی نظام اسی طریقہ کار کا مرہون منت ہے، اسی رقم سے لاوارثوں کی پرورش و تربیت کا کام چلتا ہے، ان شکلوں کو ہم امداد باہمی، آپسی تعاون، کفالت عام، سماعی تحفظ اور پیش آمدہ نقصان کی تلافی کی یقین دہانی وغیرہ اسماء اور الفاظ سے یاد کر سکتے ہیں۔ موجودہ مسلم فنڈوں کی بنیاد اسی طریقہ کار پر ہے۔

عرب معاشرہ میں اور جناب رسول اللہ ﷺ کے دور مقدس اور خلفاء راشدین کے پاکیزہ زمانہ میں بھی اس کی شکلیں ملتی ہیں۔ اسلام میں قتل خطاء میں یہی طریقہ پایا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

☆ سابق مفتی، مدنی دارالافتاء، بجنور پوٹی۔



”مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ“ (سورہ

نساء: ۹۲)۔

”جعل رسول اللہ ﷺ دية المقتولة على عصابة القتالة“ (مظہری

از مشکوٰۃ)۔

اس باب میں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے:

”يجب الدية على العاقلة والقاتل كأحدہم - عند ابی حنیفۃ۔“

موجودہ زمانہ میں انشورنس میں بھی اس کے قریب تر شکل بنتی ہے، انشورنس کمپنی اپنے پاس سے اپنے حصہ دار کے مرنے پر ایک رقم دیتی ہے اور فی الفور ادائیگی میں سارے ہی حصہ داروں کی رقمات بھی اس میں شامل ہوتی ہیں، حقیقی اعتبار سے صورت بھلے ہی ایسی ہو، لیکن حقیقت اس کی ”دیت علی العاقلہ“ سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ جس فرد نے زندگی کے بیمہ کی پالیسی خریدی ہے اگر خریدار وقت مقررہ سے پہلے ہی مر گیا تو کمپنی اس کا سرمایہ مع زائد رقم جو سود سے حاصل ہوتی ہے واپس کرتی ہے۔

دیکھنے کی بات یہ ہے، مثلاً بیس سال کے لئے جو زندگی کا بیمہ کرایا گیا ہے اگر بیس سال کی مدت پوری ہو جاتی ہے تو اصل جمع شدہ رقم پر کچھ زائد رقم ملتی ہے یہ زائد رقم اسی جمع شدہ رقم پر حاصل شدہ سود ہوتا ہے، جس کا کچھ حصہ کمپنی رکھتی ہے، اور کچھ حصہ، حصہ دار کو دیتی ہے، لیکن اگر معاہدہ کی مدت سے پہلے ہی حصہ دار کی موت کا حادثہ پیش آ جاتا ہے تب بھی اتنی رقم واپس ملتی ہے جتنی کا معاہدہ ہوتا ہے اس صورت میں شرح سود بڑھا کر دی جاتی ہے، یہ سودی رقم کمپنی اپنے قانون اور اپنی مرضی سے وفات یافتہ کے ورثاء کو دیتی ہے، اور یہ رقم بھی سودی رقم ہوتی ہے اور اس کے سود ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ پالیسی میں شریک حصہ دار پہلے سے اس بات کو جانتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اگر ہم زندہ رہے تو ہمیں ورنہ ہمارے وارثوں کو پوری رقم مع شئی زائد کے حاصل ہو جائے گی۔

اس بات کو دوسری طرح سے دیکھ لیجئے! کہ لائف انشورنس والا کمپنی کے ساتھ ایک بازی لگاتا ہے، اور شرط یہ ہوتی ہے کہ اگر میں مقررہ مدت میں مرا تو میں مالک اور کم مدت میں مرا تو اتنی رقم کے میرے ورثاء مالک۔ بالفاظ دیگر وقت مقررہ پر میری موت میری ہار اور معاہدہ کے وقت سے پہلے ہی میری موت میری جیت اور یہ شکل صراحتاً جوئے کی ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے دو تین عدالتوں کے فیصلے اس طرح نقل فرمائے ہیں:

۱- ”جوئے کی حقیقت یہ ہے کہ ایک فریق کی جیت اور دوسرے فریق کی ہار مستقبل میں ہونے والے ایک ایسے واقعہ پر مبنی ہے جو معاہدہ کے وقت بالکل غیر یقینی نوعیت رکھتا ہے، قانون ایک معاہدہ کو ایسی حالت میں ناپسند کرتا ہے جب اس کی تکمیل، یا اس پر عمل درآمد کو سراسر سخت و اتفاق پر چھوڑ دیا گیا ہو، انشورنس کے معاملہ میں بھی غیر یقینیت کا یہ عنصر بڑی حد تک شامل ہے، اگرچہ ایک شخص کی موت یقینی ہے، مگر یہ بات کہ وہ ٹھیک کس وقت پر مرے گا غیر یقینی ہے اور اس پر لائف انشورنس کی ایک پالیسی ہو سکتا ہے کہ دو قسطوں کی ادائیگی پر قابل وصول ہو جائے اور ہو سکتا ہے بیس قسطوں کی ادائیگی پر ہو، اسی طرح یہ امر بھی یقینی نہیں ہے کہ ایک آتشزنی کا واقعہ، یا ایک حادثہ رونما ہوگا یا نہیں جس کی بنا پر ایک شخص کمپنی سے تلافی کے مطالبہ کا حق دار ہو“ (فیصلہ جسٹس کاٹن)۔

۲- ہر بیمہ زندگی ایک قسم کی جوئے کی شرط ہے، میں ۲۰ پونڈ سالانہ کی بازی جیتے جی اس امید پر لگاتا ہوں کہ اگر میری موت کا واقعہ پیش آ گیا تو کچھ لوگوں کو ایک ہزار پونڈ ملیں گے، اگر میں جلدی مر جاؤں تو جیت گیا، اور اگر دیر میں مروں تو ہار گیا“ (فیصلہ لارڈ بریمول)۔

مذکورہ تصریحات سے ثابت ہے کہ انشورنس میں سود بھی ہے اور قمار بھی ہے، تاہم بعض مفکرین کا یہ ارشاد بھی درست ہے کہ انشورنس کی ضرورت اور افادیت اور اس کی ہمہ گیری سے انکار نہیں کیا جاسکتا، بلاشبہ اس میں بے شمار منافع ہیں، مثلاً اقتصادی حالت بگڑنے نہیں پاتی، خاندان کے خاندان بربادی سے بچ جاتے ہیں، مارکیٹ کا نرخ اور اشیاء کی قیمتوں میں انشورنس کا بہت بڑا دخل ہے۔

بعض مفکرین کا یہ ارشاد بھی بجا اور درست ہے کہ بنیادی اور اصولی طور پر انشورنس میں سود اور جو انہیں ہے، لیکن ہمارے نزدیک سرمایہ داروں کی سرپرستی اور معیشت اور معاش کی گردش نے اس میں سود اور قمار کو داخل کر دیا ہے، گویا کہ حرام، حلال کا لباس پہن کر نمودار ہوا ہے اور اس کی شکل مشتبہ ہوتی ہے اور جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

”الحلال بین والحرام بین وبينهما مشتبھات“ (بخاری و مسلم)۔

”يأتى على الناس زمان لا يبالي المرء ما أخذ منه أمن الحلال أم من

الحرام“ (بخاری)۔

”ليأتين على الناس زمان لا يبقى أحد إلا أكل الربوا فإن لم يأكل أصابه

من بخاره“ (مشکوٰۃ)۔

غرض کہ اسلام جیسا پاکیزہ اور حلال خور معاشرہ تیار کرنا چاہتا ہے، انشورنس سرمایہ دارانہ نظام کی سرپرستی کی وجہ سے اس میں مخل ہے اور حلال روزی کو کم از کم مشتبہ ضرور کر دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انشورنس سے بہت سہولتیں ہیں اور بہت فائدے ہیں اور اس کی عمومیت کی وجہ سے اس سے کلیہ گریز بھی ممکن نہیں، لیکن اس کی خاطر اسلامی قاعدہ: ”دفع مضرت اولیٰ ہے جلب منفعت سے“ سے اعراض کرنا اسلامی قوانین کی عمارت کو منہدم کر دے گا، دوسرا پہلو دفع مضرت اور ضرورت کا ہے، اس اعتبار سے فقہاء کو بہت سے حراموں میں سے ایک استثنائی صورت اباحت کی نکالی پڑتی ہے، اس لئے اس جگہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ حالات، یعنی فسادات کی منظم طور پر کثرت، علاقوں میں دہشت گردی، اس کی وجہ سے ملک کی آبادیوں میں اضطراب ہو رہا ہے، اور آئے دن مسلمانوں کی جان و مال ضائع ہوتے ہیں جس کی وجہ سے مسلم آبادی رو بہ زوال ہے، ان حالات کے پیش نظر جان و مال کا انشورنس کرایا جاسکتا ہے اور بینکوں میں اپنی رقمات کو محفوظ کیا جاسکتا ہے، ظاہر ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، یہ ایک بڑی ضرورت ہے، یاد رہے ضرورت وہی ہے جس میں ضرر ہو لہذا رات دن اسفار رکھنے والے

حضرات اور وہ آبادیاں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کو حفاظت خود اختیاری کے تحت اپنے جان اور املاک کا انشورنس کرا لینا ایک ضرورت ہے۔

جب یہ بات ہے تو جن مفکرین نے انشورنس میں اصولی طور پر سود اور قمار تسلیم نہیں کیا ہے ان کی دلیل پر بھی یہ مشتبہ آمدنی ضرور ہے، اگرچہ اتنی بڑی حرام نہیں، لیکن حرام کی جنس سے ضرور ہے، اس لئے ہم حلال تو قرار نہیں دیتے ہیں اس کے حصول کو جائز قرار دے کر اس کو مفاد عامہ پر خرچ کا مشورہ دیتے ہیں، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مہاجر مدنی صاحب ”بذل“ نے تحریر فرمایا ہے:

۱- اہل کفار سے سود لینا، خواہ ان کے بینکوں میں روپیہ داخل کر کے، یا ان کو قرض دے کر ہندوستان میں طرفین رحمہما اللہ کے نزدیک جائز ہے، پس جو روپیہ گورنمنٹ کو دیا گیا اس کا سود اگر گورنمنٹ دے تو لینا جائز ہوگا۔

۲- حضرت گنگوہیؒ تو ہندوستان میں مسلمان اور کافر کے درمیان سودی کاروبار کو جائز مانتے ہیں، حفظ عوام کی وجہ سے فتویٰ دیئے کو خلاف مصلحت قرار دیتے ہیں (مطبوعہ فتویٰ صفحہ ۹)۔ انشورنس کے کاروبار کو اگر اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس میں مندرجہ ذیل پانچ چیزوں میں سے کوئی نہ کوئی شق ضرور ہے:

نفع احد العاقدین۔ اکراہ۔ اضطراب اور ضرورت سے بے جا فائدہ۔ غش اور غبن۔ غرر فاحش، احد الشیخین میں سے کسی ایک کا مجہول ہونا جو مفضی الی النزاع ہو۔

یہ وہ امور ہیں جن میں سے کوئی ایک چیز بھی اگر پائی جائے تو پاکیزہ معاملہ بھی فاسد ہو جاتا ہے کہ جس سے حاصل شدہ روزی ناجائز ہو جاتی ہے، بایں وجوہات موجودہ حالات کا بگاڑ اتنا یقینی بن گیا ہے کہ جس سے ضرر اور ضرورت اور اضطراب کوئی غیر یقینی کیفیات نہیں رہی ہیں، اس لئے اور علاقائی ضرورت میں محدود رکھتے ہوئے ایک محدود دائرہ میں ضرورت مند لوگوں کے لئے انشورنس کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔

## بیمہ شریعت کی نگاہ میں

مفتی مسرور احمد ☆

مسلمان ہندوستان میں جن حالات سے دوچار ہیں، بلاشبہ وہ باعث افسوس اور قابلِ فکر ہیں، ایسی صورت میں صبر و استقامت کے ساتھ مسلمانوں کو زندگی کی تگ و دو میں حصہ لیتے ہوئے ایسے پُر وقار وسائل کا اختیار کرنا ضروری ہے جو آئین ہند سے مطابقت کے ساتھ شریعتِ حقہ اور کتاب و سنت کی تعلیمات و ہدایات سے متصادم و متعارض نہ ہوں، تاکہ وطن مالوف سے محبت و الفت کے تقاضے بھی مجروح نہ ہوں اور ان کے دین حق کی تعلیمات پر بھی حرف نہ آئے، لیکن بعض اضطراری صورتوں میں بدرجہٴ مجبوری مسلمانوں کو معاشی و مالی مسائل میں ایسے طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں جو شریعت کی نگاہ میں فی نفسہا جائز نہیں ہیں، مثال کے طور پر مسلمانوں کو صرف حفاظتِ اموال کی خاطر بینکوں سے رجوع کرنا پڑتا ہے جن کا سارا نظام سودی کاروبار پر جاری و ساری ہے۔ ”والضرورات تبیح المحظورات“۔

بیمہ (التأمين) جس کا آغاز آج سے کئی سو سال پہلے محض تعاون کے جذبہ سے ہوا تھا، ان عقودِ جدیدہ میں سے ایک ہے جن پر کتاب و سنت میں کوئی نصِ صریح موجود نہیں ہے، لہذا صرف اجتہاد ہی شرعی حکم معلوم کرنے کا ذریعہ رہ جاتا ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی عقدِ شرعی کو بیمہ کا مقیس علیہ بنا کر اس کو عقدِ مقیس علیہ سے ملحق کر دیا جائے، ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا جبکہ

عقدِ بیمہ اور عقدِ ملتق بہ میں کوئی جوہری اور بنیادی فرق پایا جائے۔  
 کافی غور و فکر کے بعد رقم کو اس میں کامیابی نہ ہو سکی، یہ عقدِ جدید کسی عقدِ شرعی سے نہ  
 تو موافقت رکھتا ہے نہ مشابہت کہ اس کو نظیر بنا کر اباحت کا فیصلہ کیا جاسکے۔

بعض حضرات کے حُسنِ ذہانت نے عقدِ بیمہ کو عقدِ مضاربت پر قیاس کرنے کی کوشش  
 کی ہے اور اباحت کے درجہ میں رکھا ہے، حالانکہ دونوں میں فرق کے جوہری و اساسی ہونے پر  
 بداہتِ دال اور مؤید ہے۔ ان حضرات نے صرف جانبین کو دیکھ کر عقدِ بیمہ اور عقدِ مضاربت  
 میں توافق کا حکم دے دیا ہے کہ ایک جانب سے سرمایہ ہوتا ہے اور دوسری جانب سے محنت، گویا  
 بیمہ میں سرمایہ کار کی حیثیت رب المال کی ہوتی ہے اور بیمہ کمپنی مضارب کی حیثیت رکھتی ہے۔  
 مضاربت میں نفع متعین نہیں ہوتا جبکہ بیمہ میں سرمایہ کار کا نفع معین ہو جاتا ہے جو  
 مدتِ بیمہ پوری ہونے پر خطیر رقم کی شکل میں بیمہ کار کو ملنا امر متعین ہے۔

مضاربت میں دوسری شرط یہ بھی ہے کہ جائز امور کے دائرہ میں رہتے ہوئے  
 مضاربت کی جائے جبکہ بیمہ کمپنی سرمایہ کار یا بیمہ دار کی جمع کردہ رقم کو جائز و ناجائز امور میں  
 تجارت یا مادیات کے طور پر استعمال کرنے میں پوری طرح آزادی رہتی ہے، ایسی حالت میں  
 سرمایہ کار اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود اپنے سرمایہ کے ذریعہ موقع فراہم  
 کرتا ہے کہ بیمہ کمپنی جاوے جا اس کا سرمایہ استعمال کرنے کی مجاز ہے اور اس طرح ایک سرمایہ  
 کار ”تعاون علی الاثم والعدوان“ کے نظامِ کار میں ایک اہم پرزہ کا پارٹ ادا کر کے معاون  
 و مددگار بنتا ہے۔

فی زمانہ بیمہ ایک منظم سودی کاروبار ہے جس کی تاسیس غیر مسلم کمپنیوں کے ہاتھوں  
 کمپنیوں کے مصالح کے لئے عمل میں آئی ہے، بیمہ داروں کے مصالح و فوائد کے لئے نہیں، اس  
 کے نظام میں قمار، ربوا اور اضرار وغیرہ کا عمل دخل پوری طرح کار فرما ہے۔

مدتِ بیمہ کے درمیان بیمہ دار کے انتقال کی صورت میں اس کے نامزد کو جمع کردہ رقم

سے کہیں زیادہ دولت کا بغیر حق و بلا عوض ہاتھ لگ جانا قمار ہے اور بیمہ کار کو مدت پوری ہونے پر جمع شدہ رقم سے زائد رقم ملنا سود اور ربوا ہے، امام احمد ابن حنبلؒ نے اسی زائد رقم کے استحلال کو کفر قرار دیا ہے۔ ”کما قال: هو الزيادة في الدين“۔

اگر مدت بیمہ پوری ہونے سے قبل کسی وجہ سے یا بلا وجہ بیمہ دار اقساط کی ادائیگی بند کر دیتا ہے یا بیمہ کو فسخ کرنا چاہتا ہے تو کمپنی اس کی جمع کردہ رقم یا تو بالکل واپس نہیں دیتی، یا اس کی رقم سے کم واپس دیتی ہے، اس طرح باقی ماندہ رقم ضبط ہو جاتی ہے، اس سے جہاں خیر اور فضل اللہ کا ضیاع لازم آتا ہے جو کسی طرح جائز نہیں ہے، وہاں اس رقم سے ”تعاون علی الاثم والعدوان“ میں مدد ملتی ہے جس سے ”سورہ ماندہ“ کی اسی مضمون کی آیت میں روکا گیا ہے۔

بیمہ دار اپنے انتقال کی صورت میں اس رقم کو خطیر رقم کے ساتھ حاصل کرنے کے لئے جس شخص کو نامزد کرتا ہے بسا اوقات وہ اس کے شرعی وارثین میں سے کوئی وارث ہی ہوتا ہے اور اس کی حیثیت وصی یا موصی لہ کی سی ہو جاتی ہے، اس طرح ”لا وصیة لوارث“ کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہ نامزد شخص اس پوری رقم کا مستحق بلا شرکت غیرے اپنے آپ کو تصور کرتے ہوئے سہام شرعیہ کے مطابق دیگر وارثین پر صرف نہ کر کے ان کو محروم کرنے کا مرتکب ہو جائے اس سے شریعت اسلامیہ کے نظام توریث کی خلاف ورزی کے ساتھ ظلم کی ایک مثال قائم ہو جاتی ہے۔

شریعت کی نگاہ میں حرمت عقود کے اسباب میں سے ایک مسلمہ و مشہور سبب متعاقدین کے درمیان امکان نزاع اور احتمال خصومت بھی ہے، محض امکان نزاع کی وجہ سے بعض عقود کو باطل اور فاسد قرار دے دیا جاتا ہے اور بیمہ کے موجودہ نظام کار میں اس سے بھی بڑے مفاسد و شرور کا احتمال ہی نہیں بلکہ بیمہ کی تاریخ میں پیش آمدہ واقعات سے ثابت و متیقن ہے، اور اس دورِ فتن میں ایسے واقعات کی کثرت بھی ہو سکتی ہے، ”والغالب کا لمتیقن“، مثلاً بیمہ کار کا جلد از جلد اپنے وارث کو وہ خطیر رقم دلانے کے لئے خودکشی کا ارتکاب حالانکہ بیمہ کار نے ابھی ایک دو

قسط ہی بیمہ کمپنی کو ادا کی تھیں، یا بیمہ کار کا بیمہ شدہ کا اپنی دکان وغیرہ کو خود ہی آگ لگا لینا تاکہ جلد سے جلد بیمہ کمپنی سے زر بیمہ کا مطالبہ کیا جاسکے، ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے آتشزدگی کو امرِ اتفاقی ثابت کرنے کے لئے بیمہ داررشتوں اور دروغ بیانیوں کو بھی عمل میں لائے گا۔

”وَأَنَّ الْفَجُورَ يُؤَدِّي إِلَى الْفَجُورِ، وَإِنَّ الْكُذْبَ يَهْدِي إِلَى الْفَجُورِ“۔

ہندوستان کے مخصوص حالات میں مسلمانوں کے لئے بیمہ کو جائز قرار دیا جائے:

بعض ماہرین اقتصادیات علماء کرام سے یہ مطالبہ بھی کرتے ہیں، حالانکہ مخصوص حالات بھی محلِ تامل ہیں۔ چودہ سو سالہ تاریخ میں امتِ مسلمہ پر عروج و زوال کا دور رہا ہے اور وہ کشت و خون کے نشیب و فراز سے گزرتی رہی ہے اور ضروری نہیں ہے کہ عقود جدیدہ کی اباحت یا عدم اباحت، دورِ فتن و فساد کو امن و عافیت کے زمانہ سے تبدیل کر دے، دیگر ممالک اسلامیہ وغیرہ اسلامیہ میں بھی مسلمانوں کی باہمی آویزشیں قتل و خون کا بازار گرم رکھتی ہیں، ایسی حالت میں ایک غیر شرعی عقد کی اباحت کا حکم کیسے فیوض و برکات کا ذریعہ بنے گا اور ہندوستان کے مسلمان فلاح کی منزل سے ہم کنار ہو جائیں گے؟

ظاہر ہے کہ اربابِ نظر اس کا جواب نفی ہی میں دیں گے۔

تاہم شریعتِ اسلامیہ نے چونکہ قدم قدم پر انسان کی ضرورتوں اور حاجتوں کا لحاظ رکھا ہے، اس لئے اضطراری طور پر بدرجہ مجبوری اشیاء کے بیمہ کی اجازت دی جاسکتی ہے، مثلاً کسی جگہ موجودہ قانون کی رو سے کسی ایسے تجارتی مال کو قبول کرنے سے فریقِ ثانی انکار کر دیتا ہے جس کا بیمہ تاجر نے نہ کرا لیا ہو، ایسی حالت میں تاجر کو بیمہ اشیاء کی اجازت دی جاسکتی ہے، یا کسی مہتملی بہ کی مجبوری پر پریشانی کے پیش نظر انفرادی طور پر علماء کرام بیمہ زندگی کی بھی اجازت دے سکتے ہیں، لیکن اباحتِ عامہ کسی طرح نہیں ہو سکتی۔

بہر حال بعض حضرات کی رائے جواز کی طرف بھی گئی ہے، ایسی حالت میں محتاط طرز

عمل یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے فرمانِ عالی پر عمل کیا جائے:



”دع ما یریک الی مالا یریک“۔

اور شک و شبہ والی چیزوں سے بھی اجتناب کیا جائے، حدیث پاک میں ہے کہ ”مشتبہات“ سے پرہیز کرنے ہی میں دین و آبرو کے سلامت رہنے کی امید کی جاسکتی ہے۔

”ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ“ (سورہ جمعہ / ۴)۔

آخری بات یہ ہے کہ اس کا کوئی متبادل حل ضرور تلاش کیا جائے، اگر خود مسلمانوں کی سرپرستی اور تعاون سے ایسی کمپنیاں وجود میں آجائیں جو تعاون محض کے جذبہ سے یہ نظام چلائیں اور یہ نظام اسلامی روح کے بالکل مطابق ہو اور یہ کمپنیاں ماہرین شریعت، نیز ماہرین اقتصادیات پر مشتمل ہوں، اس نظام کے اصول شریعتِ حقہ کی ہدایات سے بالکل متصادم نہ ہوں تو یہ ایک بڑا کام ہوگا۔



## انشورس

مولانا معاذ الاسلام ☆

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک دارالحرب میں ربوا، قمار (سود، جوا) اور عقود فاسدہ کے ذریعہ کافر اور مسلم دونوں سے نفع اور مال حاصل کرنا جائز اور درست ہے۔

”لا ربوا بین حربی و مسلم مستأمن ولو بعقد فاسد، ولو بقمار ثمه، لأن ماله مباح فیحل برضاه مطلقا بلاغدر و حکم من أسلم فی دار الحرب ولم یهاجر الینا کحربی فللمسلم الربا معه، لأن ماله غیر معصوم“ (در مختار)۔

(غیر ذمی کافر اور مستأمن مسلمان کے درمیان سود نہیں ہے، اگرچہ وہاں (دارالحرب میں) جوئے کے ساتھ ہو، اس لئے کہ اس کا مال وہاں پر مباح ہے، پس وہ بغیر عہد شکنی کے اس کی رضامندی سے مطلقاً حلال ہوگا، اور جو شخص دارالحرب میں مسلمان ہوا اور اس نے ہماری (دارالاسلام کی) طرف ہجرت نہیں کی اس کا حکم غیر ذمی کافر کی مانند ہے، پس مسلمان کے لئے اس کے ساتھ سود درست ہے، اس لئے کہ اس کا مال غیر معصوم ہے)۔

”سیر کبیر“ اور اس کی شرح میں ہے، اور مسلمان جب دارالحرب میں امان کے ساتھ داخل ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے وہ ان کی رضامندی سے ان کے اموال جس طریقہ سے بھی ہو لے لے، اس لئے کہ اس نے مباح چیز کو ایسے طریقہ سے لیا جو عہد شکنی سے خالی ہے، لہذا وہ

اس کے لئے حلال و طیب ہوگا، اور اسیر اور مستامن دونوں برابر ہیں، یہاں تک کہ اگر اس نے ان سے ایک درہم دو درہم کے بدلے میں بیچا یا درہم کے بدلہ میں میتہ کو بیچا یا جوئے کے ذریعہ مال لیا تو وہ ان کے لئے حلال طیب ہے (درمختار)۔

اور یہی حکم ہے (یعنی رہا نہیں ہے) ان دو آدمیوں میں جو اسلام لائے اور انھوں نے ہجرت نہیں کی، نہر فائق میں اسی طرح ہے اور جب وہ دونوں دارالحرب میں بیع فاسد کریں تو وہ جائز ہے، اور یہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک ہے (۱۴۱/۳)۔

اور اس سے ان دو آدمیوں کا حکم جانا جاتا ہے جو دارالحرب میں اسلام لائے اور ہجرت نہیں کی اور حاصل یہ ہے کہ سود حرام ہے، مگر ان چھ مسائل میں حرام نہیں ہے (درمختار)۔

یعنی مصنف نے جو کچھ ذکر کیا ہے اور اس کی علت بیان کی ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر دو آدمی دارالحرب میں اسلام لائے اور انھوں نے ہجرت نہیں کی تو ان کے درمیان سود کا تحقق نہیں ہوگا (شامی ۴/۱۸۸)۔

فقہاء کی ان تصریحات و عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ امام اعظم کے نزدیک دارالحرب میں ربوا، قمار اور عقود فاسدہ وغیرہ احکامات کا تحقق نہیں ہوتا اور باہمی رضامندی سے نفع اور حصول مال کے لئے دارالحرب میں کافر و مسلم دونوں سے ربوا و قمار کا معاملہ کرنا جائز و درست ہے۔

دارالحرب کی تعریف میں اگرچہ فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، لیکن (فتاویٰ عزیزی ۱۶۱) میں کافی سے جو تعریف نقل کی ہے وہ موجودہ ہندوستان پر صادق آتی ہے۔

کافی میں لکھتے ہیں: دارالاسلام سے مراد وہ بلاد ہیں جہاں مسلمانوں کے امام کا حکم چلتا ہو اور وہ اس کے قہر و غلبہ کے تحت ہوں، اور دارالحرب سے مراد وہ بلاد ہیں جہاں انھیں کے بڑے کا حکم چلتا ہو اور وہ اسی کے قہر و غلبہ کے تحت ہوں۔

دوسری مجبور یوں، حاجت اور ضرورت کی وجہ سے دارالاسلام میں بھی کبھی ممنوعات کا ارتکاب کیا جاسکتا ہے۔

”الضرورات تبيح المحظورات“۔ ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں۔ حاجت مند اور محتاج کو ضرورت کے وقت نفع کے ساتھ قرض لینا جائز ہے جس کو ہر روز معطلی کو ادا کرے (الاشاہ والنظار)۔

ہند یونین میں اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کا نہیں ہے اور سود کی وبا اتنی عام ہے کہ کوئی بڑا یا قابل ذکر کاروبار سود یا سود کے شبہ سے خالی نہیں ہے، مسلمانوں کو مجبوراً ان میں مبتلا ہونا پڑتا ہے، ورنہ زندگی گزارنا ناممکن ہے۔

بیمہ انشورنس جس کے متعلق گفتگو چل رہی ہے اس کی سب شکلوں کے لئے ربوا اور قمار لازم ہے، شریعت کا اصل حکم تو یہی ہے کہ سود سے بچا جائے۔  
”دعوا الربا والریبۃ“۔ (سود اور اس کے شبہ سے بھی بچو)۔

لیکن آج ساری دنیا میں غیر اسلامی نظام قائم ہے اور بیمہ انشورنس ہر شعبہ زندگی میں ایسا ذخیل ہو گیا ہے کہ اس کے بغیر اجتماعی زندگی گزارنا ناممکن ہے۔

انشورنس کی بعض صورتیں تو قانوناً لازم ہیں اور بعض میں قانونی مجبوری تو نہیں ہے، مگر ہند یونین کی شرعی حیثیت اور یہاں کے مخصوص حالات جن کا سوال میں تفصیلی تذکرہ موجود ہے کہ آئے دن عظیم اور تباہ کن جانی و مالی نقصانات سے دو چار ہونا پڑتا ہے، ان کے پیش نظر اگر مسلمان اپنی جان، زندگی، تجارت و صنعت، مکانات و مساجد کا بیمہ کرائیں تو مذکورہ بالا تصریحات کی بنیاد پر اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں معلوم ہوتی، اس لئے کہ فقہاء کی تصریحات کے مطابق یہاں ربوا و قمار عقود فاسدہ وغیرہ سے جس طرح بھی ممکن ہو مالی منفعت حاصل کی جاسکتی ہے اور نقصانات سے بچا جاسکتا ہے۔

انشورنس کے نتیجے میں نفع، سود، بونس یا کسی دوسرے نام سے اصل رقم سے زائد جو رقم حاصل ہوگی بیمہ کرانے والے اور اس کے ورثہ دونوں کے لئے اس کا استعمال بھی جائز ہوگا، اس لئے کہ امام اعظمؒ کے قول کی بنیاد پر رضامندی کے ساتھ ربا، قمار، یا عقود فاسدہ کے ذریعہ بھی جن اموال کو حاصل کیا جائے گا وہ مباح ہوں گے اور یہاں پر ربوا وغیرہ احکامات کا تحقق نہیں ہوگا۔

## انشورنس کے مسائل

مفتی منظور احمد مظاہری، کانپور

۱- آج دنیا کے بیشتر ملکوں میں یہودیوں کا سودی نظام رائج ہے اور وبائی امراض کی طرح ایک بڑی تعداد اس کی لپیٹ میں آچکی ہے اور جو بظاہر محفوظ ہیں وہ بھی بالواسطہ اس میں مبتلا ہیں اور اس کے دھوئیں سے تو شاید ہی اس دور میں کوئی بچا ہو۔ اقتصادیات کا پورا تانا بانا سود اور قمار کے گرد گھوم رہا ہے، بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کے نام سے جگہ جگہ لوٹ کھسوٹ کے اڈے قائم ہیں، لیکن پروپیگنڈہ اتنے خوبصورت اور دل کش عنوان سے ہو رہا ہے اور تسلسل کے ساتھ ہو رہا ہے کہ لوگ اسباب بربادی کو اسباب کامیابی سمجھنے لگے ہیں، اور جان بوجھ کر معاشی کینسر کا شکار ہو رہے ہیں، حتیٰ کہ ارباب دین و دانش بھی اس کے وباء سے قدرے متاثر ہو گئے، یا اس کے عموم و شیوع سے گھبرا گئے، اور کچھ تو اس کے لئے راہِ جواز تلاش کرنے میں لگ گئے، اس سے زیادہ افسوس ناک بات کیا ہوگی، جبکہ کسی مرض کے وبائی شکل اختیار کر لینے اور علاج کے غیر مؤثر ہو جانے سے کوئی عقل مند اسے سبب شفاء نہیں کہہ سکتا، مرض تو بہر حال مرض ہے، اسی طرح سودی جراثیم اگرچہ تمام کاروبار میں سرایت کر چکے ہیں، معیشت اور معاش کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اس کے زہریلے اثرات سے خالی ہو، ان حالات میں مسلمان حیران ہیں کہ وہ کیا کریں، کیا نہ کریں؟ اگر دوسروں کی طرح وہ بھی بینکوں اور انشورنس کمپنیوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو جوئے اور سود کی حرمت ان کا دامن پکڑتی ہے، بصورت دیگر اقتصادی میدان میں وہ برادران

وطن سے کچھڑ جاتے ہیں، اب اس کشمکش اور ابتلائے عام کو دیکھ کر اگر کوئی عالم دین سود کو سبب ترقی سمجھ کر اس کے جواز کا فتویٰ دیتا ہے تو گویا وہ ایک خطرناک وبائی بیماری کو باعثِ شفا قرار دیتا ہے، حرام تو حرام ہے اور ایسا حرام جس کی حرمت قرآن پاک کی سات آیتوں اور چالیس سے زائد حدیثوں اور اجماع امت سے ثابت ہے، جس کی حرمت قطعی اور دائمی ہے۔ اور وہ ایسا گھن ہے کہ جس کا روبرو بار میں لگ جائے اسے برباد کر ڈالے ”يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا“ (سورہ بقرہ: ۲۷۶) اور جس کی کثرت بھی انجام کار قلت سے بدل جاتی ہے۔

”الربوا وان كثر فإن عاقبته تصير الى قل“ (تہنئی ابن ماجہ)۔

اور ایسا حرام جس کا کاتب اور شاہد بھی ملعون ہے اور جس کے مرتکب کو اس جہنم کی وعید سنائی گئی ہے جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے، غرض جو چیز مسلمانوں کی دنیا و آخرت دونوں کو تباہ و برباد کر دے اس کی اجازت وہی دے سکتا ہے جو دین و دانش دونوں سے بیگانہ ہو، مرد و چہ سودی نظام دنیا میں معاشی بحران کا واحد سبب ہے، اس کی نحوست سے مخلوق خدا فقر و فاقہ کا شکار ہو رہی ہے، غریب اس کے چکر میں پھنس کر غریب تر ہوتا جا رہا ہے اور جو بڑے پیمانہ پر بینکوں سے لین دین کر رہے ہیں آئے دن ان کا بھی دیوالیہ نکلتا رہتا ہے، خود بڑے بینکوں کا تو میا لیا جانا، کیا سودی کاروبار کرنے والوں کے لئے تازیا نہ عبرت ثابت نہیں ہوا، یہی دیوالیہ پن وہ خطرہ ہے جس سے بچنے کے لئے انھوں نے بیمہ کمپنیوں کی شیطانی اسکیم چلائی، اور زمینی آفت، یعنی زرخ کی ارزانی سے بچنے کے لئے سٹے کا بازار گرم کیا، ایک سودی لعنت نے سود کے ساتھ قمار اور ظلم و قساوت جیسی بہت سی لعنتوں میں گرفتار کر دیا، بے جاتا ویلات سے کوئی دلائل کا تو انکار کر سکتا ہے، مگر مشاہدات کا انکار کسی طرح ممکن نہیں۔ آج اگر کسی ایک شہر کا سروے کیا جائے اور بینکوں کے ذریعہ کاروبار کرنے والوں کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان میں سے اکثر سود در سود کی دلدل میں پھنس کر اپنا ذاتی سرمایہ بھی گنوا بیٹھے، یا رشوت کے زور پر بار بار اپنے کو دیوالیہ ظاہر کیا اور اس کے نتیجے میں جھوٹ فریب کی عادت پڑی۔ حتیٰ کہ جو ہر ایمانی امانت و دیانت بھی کھو بیٹھے اور انشورس کے نتیجے میں اعتمادِ علمی کی دولت سے محروم ہو گئے۔

سود اور قمار دونوں ایسی عادت بد ہیں کہ آدمی نہ دنیا کا رہتا ہے نہ دین کا۔ بعض درد مند ان ملت ہندی مسلمانوں کی مفلوک الحالی پر ترس کھا کر جواز سود کی راہیں ہموار کر رہے ہیں، ان سے پہلے تو یہ کہنا ہے کہ جس وقت مسلمانوں کو بقایا سود نہ چھوڑنے پر اللہ ورسول کی طرف سے اعلان جنگ سنایا گیا اس وقت مسلمانوں کی معاشی حالت آج سے زیادہ ابتر تھی، آج کتنے ایسے نادار مسلمان ہیں جو کئی کئی روز کے فاقہ کی وجہ سے بے ہوش ہو جاتے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو ایک معمولی سی پھٹی لنگی کے ذریعہ ستر پوشی پر مجبور ہیں، آج غریب سے غریب تر کو بھی دونوں وقت نہ سہی ایک وقت کی روٹی تول ہی جاتی ہے، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آج کا غریب قرن اول کے متوسط طبقہ سے زیادہ حیثیت کا مالک ہے، اگر ضرورت اور حاجت تھی تو اس وقت تھی جب سود کی حرمت نازل ہو رہی تھی، لیکن شدید ضرورت کے وقت بھی زمانہ جاہلیت کے بقایا سود کے وصول کر لینے کی اجازت نہ ملی بلکہ اس کا بالکل ترک شرط ایمان قرار پایا، لہذا آج کس میں ہمت ہے کہ سود قمار کی اجازت دے کر اپنے ایمان کو خطرہ میں ڈال دے۔

ربوا کی دو قسمیں ہیں: ۱- ربوا القرض، ۲- ربوا البیع۔

قسم اول حقیقی ربوا ہے۔ اس کی حرمت استنباطی یا اجتہادی نہیں، بلکہ منصوص قطعی ہے۔ اور دوسری قسم جو بیع و شرا کے ضمن میں پائی جاتی ہے وہ بھی حکماً ربوا ہے، نبی کریم ﷺ نے چھ چیزوں کے بارے میں تو صراحت کے ساتھ فرمادیا کہ ان کی باہمی بیع و شرا میں برابری شرط ہے ان میں کمی بیشی یا ادھار ربوا ہے، ان چھ اشیاء کے علاوہ دیگر چیزوں کی باہمی خرید و فروخت کا ضابطہ ائمہ مجتہدین نے اپنے اپنے قیاس سے بیان کیا ہے، اور یہ ضابطہ چونکہ قیاسی تھا اس لئے مجتہدین کے درمیان علت ربوا کی تعیین میں اختلاف پیدا ہو گیا، اور منصوص نہ ہونے کی بنا پر اس میں اشتباہ رہنے کے سبب سیدنا حضرت عمرؓ نے اس پر اظہار افسوس فرمایا کہ کاش نبی کریم ﷺ خود ہی اس کا ضابطہ بیان فرمادیتے تو مشتبہ حالات میں اطمینان پیدا ہو جاتا، پھر فاروق اعظمؓ نے ارشاد فرمایا: ”جہاں ربوا کا شبہ ہو اس سے بھی بچو۔“

”فدعوا الربوا والريبة“ (مشکوٰۃ)۔

ربوا کی قسم اول کے بارے میں ہرگز کوئی اشتباہ نہ تھا، کیونکہ اس کی حرمت اور علت دونوں منصوص ہے۔

”کل قرض جرنفعا فهو ربوا“ (جامع صغیر)۔

اس کے مفہوم کو سارا عرب جانتا تھا، حضرت عمرؓ کے قول: ”ان آخر ما نزلت آية الربوا“ الخ کی تشریح کرتے ہوئے علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں:

”ان هذه الآية ثابتة غير منسوخة غير مشتبهة فلذلك لم يفسرها النبي ﷺ فاجروها على ما هي عليه ولا تترتابوا واتركوا الحيلة في حل الربوا“ (لمعات، مرقات علی ہاشم المشکوٰۃ)۔

یعنی آیت ربوا ثابت غیر منسوخ ہے اور اس میں کوئی اشتباہ بھی نہیں، اس لئے نبی ﷺ نے اس کی تفسیر نہیں بیان فرمائی، لہذا اس کو ظاہر پر رکھو اور اس کی حرمت میں کوئی شک و شبہ پیدا نہ کرو اور اس کے جواز کا کوئی حیلہ تلاش نہ کرو۔

اب جو لوگ فقہاء کی بعض مجمل عبارات کو دار الحرب میں جواز سود کا بہانہ بناتے ہیں، نصوص قطعیہ کے سامنے اس کی کیا حقیقت ہے۔ سود کا وہ بقایا جس کا چھوڑنا شرط ایمان قرار دیا گیا۔ کیا وہ بقایا ”مکہ مکرمہ“ کے دارالاسلام بن جانے کے بعد کا تھا یا دار الحرب ہونے کے دور کا تھا۔ حضرت تھانویؒ کے الفاظ میں اس کی تحقیق ملاحظہ ہو:

”ظاہر ہے اس بقیہ ربوا کا معاملہ جس وقت حرام ہوا ہے لینے دینے والے سب حربی تھے تو اگر تحریم کے بعد حربی سے ایسا معاملہ جائز ہوتا تو تحریم کے قبل بدرجہ اولیٰ جائز ہوتا اور وہ رقم حلال ہوتی اس کا ترک کرنا کیوں فرض ہے؟“ (بوادرنواد)۔

اسی طرح حضرت ابو بردہ بن ابوموسیٰؓ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے ان سے بہ تاکید فرمایا کہ دیکھو تم ایسے علاقہ کے رہنے والے ہو جہاں سود کا بہت



رواج ہے، لہذا اگر تمہارا کوئی حق کسی پر واجب الاداء ہو اور وہ تمہیں ہدیہ کے طور پر بھوسہ، جو یا گھاس کا معمولی گٹھری بھی دے جب بھی اسے نہ لو، کیونکہ وہ بھی سود ہے، تو کیا وہ علاقہ دار الاسلام تھا جہاں سود کا بہت رواج تھا یا کچھ اور تھا اور مقروض سے معمولی ہدیہ لینے کو سود قرار دیا اور لینے سے روک دیا۔

فقہاء کی جس مجمل عبارت کو دار الحرب میں جواز سود کے لئے پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے:

”لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب۔“

اس سے غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی کہ اس عبارت میں المسلم سے وہ مسلمان مراد لیا گیا جو دار الحرب میں معاہدہ کر کے رہتا ہے، حالانکہ یہ تصریح فقہاء اس سے دار الاسلام میں رہنے والا مسلمان مراد ہے جو امان لے کر وقتی طور پر دار الحرب گیا ہے اور جس کے لئے حربی کا مال دار الاسلام میں رہتے ہوئے ہر طرح سے جائز تھا، خواہ چھاپہ مار کر حاصل کرتا، یا اس کی رضامندی سے دونوں طرح درست تھا، اور جب وہ اجازت لے کر دار الحرب میں داخل ہوا تو اب پابند معاہدہ ہونے کی وجہ سے اس کے لئے غدر جائز نہ ہوگا اور غصب، سرقت وغیرہ سب ممنوع ہوگا، البتہ حربی کی رضامندی سے اس کا مال اس مسلمان کے لئے جائز ہوگا، خواہ بیوع فاسدہ کے ضمن میں ہو، یا بظاہر طریقہ ربوا سے ہو، تو لا ربوا کا مطلب یہ ہے کہ ”لا یتحقق الربوا“ نہ کہ ”لا یحرم الربوا“ جس طرح عبارت مذکورہ سے پہلے ”لا ربوا بین المولیٰ وعبده“ کا جملہ موجود ہے، کیونکہ غلام کا تو درحقیقت کوئی مال ہی نہیں، اس کے ہاتھ میں جو کچھ ہے اس کے مولیٰ کا ہے، تو پھر ایک ہی شخص کے مال میں ربوا کا تحقق کس طرح ہو سکتا ہے، اس طرح پہلی صورت میں ربوا کا وجود ہی نہیں پایا گیا، جیسے امان لے کر دار الحرب میں داخل ہونے سے پہلے خفیہ طور پر دار الحرب میں داخل ہو کر حربی کا مال لاسکتا تھا، کیونکہ اس کے لئے حربی کا مال مباح تھا۔ لہذا اس کے لئے جائز ہے کہ دار الحرب میں داخل ہو کر حربی کا مال لوٹ کر لائے تو جس طرح یہ کہنا درست ہے کہ:

” لا سرقة ولا غصب بين المسلم والحربي في دار الحرب“۔

مال مباح ہونے کی بنا پر سرقت اور غصب کا وجود نہیں پایا گیا اور نہ یہ کہ سرقت اور غصب تو پایا گیا، مگر حرام نہیں، اسی طرح دار الحرب میں امان لے کر جانے کی وجہ سے مال مباح حربی کی فقط رضا مندی سے لے سکتا ہے۔ ”بائی طریق کان“ یہی وجہ ہے بظاہر ربوی اور قمار کی معاملات مسلم اور حربی کے درمیان اس وقت درست ہیں جب مال زائد مسلمان کے حصہ میں آتا ہو، چنانچہ علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں:

”وقد التزم أصحاب الدرس أن مرادهم من حل الربوا والقمار ما إذا

حصلت الزيادة للمسلم نظراً الى العلة“ (فتح القدير)۔

اور علت یہی ہے کہ ”مال الحربی للمسلم مباح لا عكسه“۔

حاصل کلام یہ ہے کہ بینکوں سے سودی قرض لے کر کاروبار کرنے اور بیمہ کمپنیوں کے ذریعہ جان، مال کا بیمہ کرانے کی کوئی گنجائش نہیں الا بحالت الاضطراب۔ یہ دونوں ادارے بالخصوص مسلمانوں کے لئے زہر قاتل ہیں، مسلمانوں کی کامیابی حرام طریقوں میں نہیں ہے۔ مسلمان تو بقول امام مالکؒ کے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ کافروں کی ظاہری چمک دک اور ان کی ترقیات سے مسلمانوں کو مرعوب نہیں ہونا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کے مال و دولت کی طرف نظر اٹھانے کو بھی منع فرما دیا ہے:

” وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ“ (سورہ طہ: ۱۳۱)۔

مال حلال کے سوا رزق رب اور کیا ہو سکتا ہے اور مسلمان کے لئے یقیناً وہی بہتر ہے، اسی میں برکت ہے۔ لہذا علماء کو چاہئے کہ مسلمانوں کو حرام سے بچانے کی کوشش کریں اور کسب حلال کی انھیں ترغیب دیں، اس دور میں علماء سے جائز ناجائز کون پوچھتا ہے، علماء کے علی الرغم مسلمانوں کا بیشتر کاروباری طبقہ بینکوں اور انشورس کمپنیوں کو اپنی کامیابی کی گارنٹی سمجھنے لگا ہے۔ یہ

دوسری بات ہے کہ کامیابی کے بجائے ناکامی ہاتھ آرہی ہے، علماء کا فرض عوام کو حلال اور حرام سے آگاہ کر دینا ہے نہ یہ کہ عوام جس حرام میں مبتلا ہوتے جائیں علماء اس کے لئے سند جواز فراہم کرتے جائیں، پھر کہاں تک ان کے پیچھے چلیں گے اور کس کس حرام کو حلال بنائیں گے۔ لاٹری عام ہو رہی ہے، مسکرات کا استعمال فیشن بنتا جا رہا ہے، تین طلاق سے پہلے کسی کی سانس ہی نہیں رکتی، سنیما بینی اور ٹیلی ویژن تو جزو زندگی بن چکے ہیں، بے پردگی اور مخلوط تعلیم کے نتیجے میں مسلمان لڑکیا تیزی سے غیر مسلموں سے شادی کر رہی ہیں۔ رسومات میں بے جا اسراف بڑے ذوق شوق کے ساتھ جاری ہے، پھر کس کس کو روایا جائے، علماء جب تک کھینچ تان کر دو چار چیزوں میں گنجائش نکالیں گے اس وقت تک عوام دس بیس محرمات کو اختیار کر چکے ہوں گے۔ بنیاد تو خوف خدا اور فکر آخرت ہے۔ اگر علماء سے ہو سکے تو اس کی تحریک چلائیں اس کے بغیر کوئی کام نہیں بننے والا ہے، اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ غیر سودی بیت المال قائم کر کے چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے ذریعہ روزگار کے مواقع فراہم کئے جائیں اور متوسط طبقہ کے کاروباریوں کی مناسب انداز میں مدد کی جائے، لیکن اس شرط کے ساتھ زکوٰۃ کی رقوم جائز طور پر صحیح مصرف میں خرچ ہوں ورنہ شریعت میں دوسروں کی دنیا کے لئے اپنی آخرت بگاڑنے کی اجازت نہیں ہے، اس طولانی تمہید سے انشورنس اور کرنسی کا حکم باسانی معلوم ہو سکتا ہے، انشورنس ربوا اور قمار دونوں کا مجموعہ ہے، لہذا حالت اضطرار کے علاوہ گنجائش نہیں۔ دسمبر ۱۹۶۵ء میں ”مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ“ نے انشورنس کے سلسلے میں اپنا ایک اجتماعی فیصلہ صادر کیا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علماء کا یہ مجمع اسی کی تائید کر کے اس سلسلے کی بحث کو مختصر کر دے۔



## انشورنس

مولانا شفیق احمد مظاہری ☆

انشورنس (بیمہ) کی تنقیح نوعیت کے اعتبار سے سوال میں کردی گئی ہے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں، احکام، کیفیت و حالات کے اعتبار سے متحد ہوں گے یا مختلف؟ یہی بحث مطلوب ہے، اس کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے انشورنس کی تعیین لازم ہے، لہذا انشورنس کی اولاً دو قسمیں کی جاسکتی ہیں۔

۱- جسم و جان کا بیمہ، ۲- مال و اسباب کا بیمہ۔

ان میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں ہوں گی۔

۱- جسم و جان کا بیمہ اختیاری، ۲- جبری۔

اسی طرح مال و اسباب کا بیمہ: ۱- اختیاری، ۲- جبری۔

اس کے بعد بیمہ اختیاری کی حالات کے اعتبار سے دو صورتیں کرنی چاہئے۔

۱- جسم و جان کا بیمہ اختیاری عام سازگار حالات (NORMAL) میں۔

۲- ضرورۃً، یعنی نامساعد حالات سے متاثر ہو کر۔

اسی طرح مال و اسباب کا اختیاری بیمہ کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔

۱- سازگار حالات میں بلا ضرورت، ۲- نامساعد حالات میں ضرورۃً۔

غرضے کہ کل چھ قسمیں ہوں، جس کا اجمالی خاکہ اس طرح ہوا۔

- ۱- مال و اسباب کا بیمہ جبری ۲- جسم و جان کا بیمہ جبری
- ۳- مال و اسباب کا بیمہ اختیاری ۴- جسم و جان کا بیمہ اختیاری
- ۵- مال و اسباب کا بیمہ اختیاری بلا ضرورت (سازگار حالات میں)
- ۶- جسم و جان کا بیمہ اختیاری بلا ضرورت (سازگار حالات میں)
- ۷- مال و اسباب کا بیمہ اختیاری ضرورۃً نامساعد حالات میں (مجبوراً)
- ۸- جسم و جان کا بیمہ اختیاری ضرورۃً نامساعد حالات میں (مجبوراً)

یوں تو مال و اسباب کے بیمہ کی مثالیں اور کچھ تذکرہ ماضی بعید میں ملتا ہے، جیسا کہ سوال میں تذکرہ کیا گیا، نام اس کا ”سوکرہ“ دیا گیا ہے، اگر اس کی سیدھی سادی صورت یہ ہو کہ کسی نقصان خوردہ تاجر کے نقصان کی تلافی بہت سے تجارتل کر برداشت کریں تو یہ معاونت پر مبنی ہوگا، میرے خیال سے اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں، لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ انشورنس (بیمہ) نے اس قدر پیش رفت پائی ہے کہ آج پوری دنیا کی اقتصادیات میں ریڑھ کی حیثیت حاصل کر لی ہے، چونکہ اس کی پرداخت و ترقی میں ہمیشہ اہل مغرب کے ہاتھ رہے ہیں، بایں وجہ انشورنس (بیمہ) کی پوری عمارت اب ربا، سود یا قمار پر قائم کر دی گئی جس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔

انشورنس (بیمہ) اگر معاونت یا مضاربہ کے شرعی اصول پر ہوتا تو یہ حسن لعینہ ہے، لیکن اس کے لازم غیر شرعی شرائط و لوازمات نے فتنج لغیرہ بنا دیا ہے، لہذا تیسری اور چوتھی صورت، یعنی مال و اسباب، یا جسم و جان کا بیمہ اختیاری معتدل حالات میں بلا ضرورت اختیار کرنا، یا اس سے استفادہ کرنا یا جمع شدہ رقم سے زائد رقم بلا معاوضہ حاصل کرنا شرعاً ناجائز ہوگا کہ نص قطعی سے اس کی حرمت واضح ہے، البتہ جبری بیمہ کا حکم اس سے مستثنیٰ ہوگا۔ بہ دو وجہ: نمبر ۱، نمبر ۲ یعنی بیمہ جبری، خواہ مال و اسباب کا ہو یا جسم و جان کا، مثلاً ہندوستان میں بعض محکمہ کے ملازمین کے شہر یہ ادا

کرنے سے قبل ہی کچھ شہریہ کے حساب میں سے کاٹ کر حکومت اپنی تحویل، یعنی بیمہ کمپنی کے حوالہ کر دیتی ہے، اس طرح بعض پرائیویٹ کمپنیاں بھی کرتی ہیں، جس پر ملازمین کا یا یہ کہیں کہ جبری پالیسی ہولڈر کا کوئی اختیار و رضاء کا دخل نہیں ہوتا اور نہ جبری پالیسی ہولڈر کی نیت و ارادہ کارگر ہوتا ہے، نیز ملازمین کی اپنی کلی ملکیت کی رقم بھی داخل نہیں ہوتی، بلکہ کمپنی یا محکمہ کا مالک کا عمل دخل ہوتا ہے، لہذا سود، ربا، قمار کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی، اس لئے ایسے ملازمین حادثات کے شکار ہونے کی صورت میں یا کسی قسم کے جانی و مالی نقصان پہنچے پر حکومت یا کمپنی پالیسی ہولڈر یا اس کے ورثاء کو معاوضہ ادا کرتی ہے تو شرعاً اس رقم کو لینے میں کوئی قباحت نہ ہونی چاہئے، بلکہ یہ حکومت یا کارخانہ کمپنی کی جانب سے معاونت و انعام کی رقم متصور ہوگی، جیسا کہ پرائیویٹ فنڈ کی رقم ہوتی ہے۔

رہ جاتی ہے بات پانچویں اور چھٹی صورت، یعنی جسم و جان یا مال و اسباب کا بیمہ کرانے یا نہ کرانے کا اختیار تو ہے، لیکن حالات ایسے ہیں کہ بیمہ نہ کرانے میں حرج عظیم لازم آتا ہے، جسم و جان، مال و اسباب کے ہلاک کر دیئے جانے کا شدید خطرہ لاحق رہتا ہے، برخلاف جسم و جان و مال و اسباب انشورڈ کر لینے کی صورت میں کافی حد تک حفاظت کا گمان غالب ہو، جیسا کہ ہندوستان کی حالت ہے، جہاں تمام تر انشورنس کمپنیاں قومیاں گئی ہیں (NATIONALISED) گویا کہ انشورنس محکمہ حکومت کی ملکیت ہے اور حکومت کے ذمہ ملک کے ہر باشندہ کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری ہے، لیکن آئے دن کے تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ ہم مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کے بجائے درپے آزار ہے، مسلم کش فسادات کی اسکیمیں بنائی جاتی ہیں، ہماری اقتصادیات تباہ کرنے کے منصوبے تیار کئے جاتے ہیں، ظالموں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور مظلومین بے بس کر دیئے جاتے ہیں، خصوصاً ہم مسلم اس ظلم کی چکی میں پیسے جاتے ہیں۔

دوسری طرف جب کبھی حکومت کا کوئی محکمہ خسارے کا شکار ہوتا ہے تو اس کی تلافی کا بوجھ ہندوستانی ہونے کے ناتے ہمارے کمزور کاندھوں پر بھی آتا ہے، مختلف قسم کے جائز

ونا جائز ٹیکسز ہم پر بھی عائد ہوتے ہیں، لیکن ہمارے نقصانات کی تلافی کی ذمہ داری حکومت انشورنس بیمہ کے ذریعہ قبول کرتی ہے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ اگر تمام تر دکانوں اور مال و اسباب، یا جسم و جان کا بیمہ کرایا جائے تو حکومت یہ سوچنے پر مجبور ہوگی کہ اگر ان دکانوں، مال و اسباب کا نقصان ہو، جائیں ضائع ہوئیں تو حکومت کے خزانے کا خسارہ ہے، ایسی صورت میں حکومت اپنی ذمہ داری کا احساس کرے گی اور ہمارے جان و مال کی حفاظتی مہم تیز کرنے پر مجبور ہوگی، اس طرح ظن غالب یقین کی حد تک ہے کہ جان و مال محفوظ ہوں گے، لہذا جان و مال کی حفاظت اہم فریضہ ہونے کی وجہ کر وہ حاجت جو فتنہ میں بمنزل ضرورت کے ہے، یہاں یہی صورت درپیش ہے۔ شریعت یسر فراہم کرتی ہے عسر نہیں، اس لئے جسم و جان اور اسباب کے بیمہ کرانے کی اجازت ہوگی، لیکن ایسی صورت میں پالیسی ہولڈر کو ملنے والے منافع کا شرعاً کیا حکم ہوگا؟

اس کی، یعنی بیمہ اختیاری ضرورۃً کرایا گیا ہو اس پر حادثہ یا نقصان یا مدت پوری ہونے کے بعد حکومت یا کمپنی سے ملنے والے منافع کی چند صورتیں ہو سکتی ہیں اور احکام بھی مختلف معلوم ہوتے ہیں۔

۱- ایسے انشورڈ جان و مال کا نقصان قدرتی فطری حادثہ سے ہوا ہو۔

۲- یا حکومت کی لاپرواہی اور فسادات کی وجہ کر ہوئے ہوں یا کوئی بھی نقصان مدت پوری ہونے تک نہیں ہوا، ہر سہ صورت میں پالیسی ہولڈر کو اصل رقم کے ساتھ اضافی رقم بھی ملتی ہے، گر نقصان فطری اور قدرتی حادثہ کی بنا پر ہوا ہو یا مدت پوری ہونے پر حکومت معاوضہ رقم یا اضافی جو پالیسی ہولڈر کو دیتی ہے، شرعی اصول کے تحت اس کے جواز کی کوئی صورت نہیں۔ البتہ جان و مال کا نقصان حکومت کی لاپرواہی و کوتاہی، یا سازش سے فسادات میں ہوئے اب حکومت اس کی تلافی انشورنس کی وجہ سے کرتی ہے تو میرے خیال سے یہ ”معاوضہ نقصان“ ہے جس کا حق دار پالیسی ہولڈر ایک ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ہے اور اسے ملا، اس کی مثال ایسی

ہوئی جیسا کہ کسی کو اپنا حق حاصل کرنے کے لئے رشوت ناجائز ہونے کے باوجود حصول حق کی خاطر دینے کی اجازت ہے جبکہ اس کے بغیر چارہ کار نہ ہو، اسی طرح پالیسی ہولڈر کو اپنا حق وصول کرنے کے لئے انشورنس بیمہ کی راہ اختیار کرنا پڑا۔

مذکورہ بالا قسموں کے سوا بھی صورتیں ہیں، مثلاً ٹرانسپورٹ کمپنیاں مال و اسباب کے نقل و حمل کی اجرت کے ساتھ اس کی حفاظت کی ضامن بنتی اور اس کی اجرت، یا معاوضہ وصول کرتی ہے، اور یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ مال و اسباب کا کسی طرح کے حادثات سے نقصان ہو جائے، یا کسی وجہ سے ضائع ہو جائے تو اس کے معاوضہ کی ذمہ دار کمپنی ہے، اگرچہ کمپنی کی نظر اس پر ہوتی ہے، ہزار اور لاکھوں میں کبھی کوئی حادثہ ہوگا، جس کو کمپنی پورا کرے گی، رقم معاوضہ بہتوں سے ملے گی، لیکن پالیسی ہولڈر نے معاوضہ حفاظت ادا کیا اور کمپنی نے ضمانت و گارنٹی لی ہے، لہذا نقصان کی صورت میں تلافی کی یہ ضمانت قبول کرنا شرعاً درست ہے، تو تلافی نقصان کی رقم پالیسی ہولڈر کے لئے درست ہونا چاہئے۔





## انشورنس

قاضی عبدالجلیل قاسمی ☆

بیمہ کے ذریعہ جو فوائد حاصل ہوتے ہیں یا متصور ہیں وہ سب اسلام کے نظام بیت المال میں موجود ہیں، اگر مسلمانوں میں بیت المال کا نظام صحیح طور پر قائم ہو اور عشر و زکوٰۃ کی وصولی اور اخراجات کا صحیح انتظام ہو جائے تو اسلامی معاشرہ میں کوئی تنگ، بھوکا نہیں رہ سکتا اور نہ ایسا کوئی مجبور ہوگا جس کا علاج نہ ہو سکے۔

مال کی حفاظت اور اس میں اضافہ کے لئے غیر سودی بینک کاری ہو سکتی ہے جس میں مال محفوظ بھی ہوگا اور مضاربت اور شرکت کے اصول پر اس میں اضافہ بھی ہوتا رہے گا۔ بیمہ میں ربوا اور قمار دونوں پائے جاتے ہیں اور دونوں کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے، نیز بیمہ میں نظام میراث درہم برہم ہو جاتا ہے، کیونکہ بیمہ دار اپنے مرنے کی صورت میں رقم لینے کے لئے جس شخص یا اشخاص کو نامزد کرتا ہے، دوسرے کو ان روپیوں میں سے کچھ نہیں ملتا ہے، الا یہ کہ وہ راضی ہوں اور اپنی مرضی سے کچھ دے دیں، حالانکہ جمع شدہ رقم کا مالک بیمہ دار ہی ہے۔ نامزدگی ہبہ نہیں، بلکہ وصیت ہے، نامزد شخص اگر وارث ہے تو وصیت باطل ہے اور اگر وارث نہیں ہے تو وصیت ایک تہائی مال میں ہی جاری ہو سکتی ہے اور یہاں صورت حال بالکل مختلف ہے، یہاں تو جمع شدہ کل رقم نامزد شخص ہی کو ملے گی، اور ظاہر ہے کہ یہ نظام میراث کے

سراسر منافی ہے۔

۱- کمپنی جو اضافی رقم بیمہ دار کو دیتی ہے وہ سود ہے، نام کے بدلے سے حقیقت نہیں بدلتی، سود کی جو تعریف فقہاء نے کی ہے وہ پوری طرح اس اضافی رقم پر صادق آتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے لکھا ہے:

”الربا هو القرض علیٰ أن یودی إلیہ أكثر أو أفضل مما أخذ“ (حجۃ اللہ

- (۳۱۷/۲)

۲- منصوص مسائل میں مصالح کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا، سود کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے، اس لئے اس کے جواز کی گنجائش کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳- تینوں قسموں میں سود اور بعض میں قمار بھی پایا جاتا ہے، اس لئے تینوں کا حکم ایک ہوگا، یعنی تینوں حرام ہیں، البتہ زندگی کا بیمہ سرکاری کمپنی کے ذریعہ سرکاری ملازمین کے لئے، اس کا حکم آگے آرہا ہے۔

۴- قمار کی تعریف کی جاتی ہے: ”تعلیق الملک علی الخضر والمال فی الجانیین“ قمار یہ ہے کہ دونوں جانب سے مال ہو اور مال کا حصول ایسی چیز پر موقوف ہو جس کا وجود و عدم وجود مبہم ہو، اگر ایک طرف سے مال ہو اور دوسری طرف سے نہ ہو تو یہ قمار نہیں ہے، زندگی کے بیمہ میں چونکہ بیمہ دار کی پوری رقم اضافہ کے ساتھ بہر صورت واپس ہو جاتی ہے، اگر پہلے مر گیا تو اضافہ غیر معمولی زائد ہوتا ہے اور زندہ رہ گیا تو اضافہ کم ہوتا ہے، اس لئے اس میں صرف ربا ہے۔ البتہ گاڑیوں کے بیمہ میں بیمہ دار ایک رقم جمع کرتا ہے، اگر مقررہ وقت سے پہلے حادثہ ہو جائے تو کمپنی گاڑی کی قیمت ادا کرتی ہے، اور اگر مقررہ وقت گزر جائے اور حادثہ نہ ہو تو کمپنی جمع شدہ رقم کی مالک ہو جاتی ہے، یہ یقیناً قمار ہے۔

۵- غرر اگر فریب کے معنی میں ہے تو یہ بیمہ میں نہیں ہے، اور اگر خطر کے معنی میں ہے، یعنی جس کا انجام معلوم نہ ہو تو یہ غرر ہے، قمار کی حرمت بھی نص قطعی سے ثابت ہے، اس لئے کسی بھی مصلحت کی وجہ سے اسکو جائز قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

۶- اگر بیمہ دار جو اٹھیلنا چاہتا اور سود کی بھی خواہش نہیں ہے تو پھر اس کو بیمہ کرانے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے، اور یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوتا ہے، اگر اس کا مقصد رقم پس انداز کرنا ہے تو غیر سودی بینک میں جمع کر سکتا ہے۔ اگر غیر سودی بینک کا نظام نہ ہو تو سرکاری بینک میں ہی جمع کر سکتا ہے، وہاں صرف سودی کاروبار میں اعانت کی قباحت ہوگی اور یہاں بیمہ میں تو سود اور قمار دونوں ہیں، یہاں روپے جمع کرنے کی صورت میں تو قباحت بڑھ جائے گی، کیونکہ سود و قمار دونوں میں اعانت ہوگی۔

۷- کمپنی جو فاضل رقم ادا کرتی ہے اس پر سود کی تعریف پوری طرح صادق آتی ہے، جیسا کہ پہلے بتایا گیا اس کو تبرع و احسان کہنا شراب کے بوتل پر شربت کا لیبل لگانا ہے اور اس سے حکم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

۸- آج کی دنیا میں ”دارالحرب“ کی تعریف ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ دارالحرب میں عقود فاسدہ کے بارے میں فقہاء کا اختلاف معروف اور فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، لیکن سود و قمار کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے اور ان دونوں پر سخت وعیدیں ہیں، اس لئے حتی الامکان ان دونوں سے احتراز انتہائی ضروری ہے۔

۹- حکومت ہند نے اپنے ملازمین کے لئے لائف انشورنس (بیمہ زندگی) کو لازم قرار دے دیا ہے اور ان کی تنخواہ کا ایک حصہ اس نام پر وضع ہو کر جمع ہو جاتا ہے، حادثہ کی صورت میں حکومت ملازم کے ورثہ کو اضافہ کے ساتھ وہ رقم ادا کرتی ہے اور اگر ملازم زندہ رہ جائے تو ملازمت سے سبکدوش ہوتے وقت وہ پوری رقم اضافہ کے ساتھ اس کو مل جاتی ہے، یہ صورت جائز ہے، کیونکہ یہاں نہ تو سود ہے اور نہ قمار ہے، دونوں کی تعریف جو اوپر مذکور ہوئی اس میں دونوں جانب سے مال کا ہونا ضروری ہے، جبکہ حکومت یہاں ایک طرف سے مال ہے اور دوسری طرف سے عمل ہے، اس لئے حکومت کے کھاتہ میں اس کو سود ہی کیوں نہ کہا جائے، حقیقت میں نہ سود ہے اور نہ قمار ہے، اس لئے یہ جائز ہے، لیکن سرکاری ملازمین کے لئے بھی املاک اور ذمہ داریوں کا

بیمہ جائز نہیں ہوگا اور غیر ملازمین کے لئے تینوں حرام ہوں گے، اور اگر کمپنی غیر سرکاری ہے تو سرکاری ملازمین اور غیر سرکاری ملازمین سب کے لئے یکساں حکم ہوگا، یعنی تینوں قسم کے بیمے ناجائز و حرام ہوں گے، البتہ گاڑیوں کے بیمہ کو حکومت ہند نے لازم قرار دے دیا ہے، اس لئے دل سے ناپسند کرتے ہوئے بیمہ کرانے کی اجازت دی جاسکتی ہے، البتہ جو فاضل رقم ملے گی وہ سود ہوگا اور اس کا صدقہ کرنا ثواب کی نیت کے بغیر لازم ہوگا۔

۱۰- ملک اور حق ملک میں فرق ہے۔ ملک اگر ایک ہو تو سود نہیں ہوگا، مثلاً شرعی غلام اور آقا اگر کوئی سودی معاملہ کریں تو وہ سود نہیں ہوگا، کیونکہ یہاں ملک ایک ہے اور صرف آقا مالک ہے، اسی طرح جن دو آدمیوں کے درمیان شرکت کا معاملہ ہو اور وہ اس مال مشترک میں آپس میں کوئی سودی معاملہ کریں تو وہ بھی سود نہیں ہوگا، اس لئے کہ شرکت کی وجہ سے ملک ایک ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: بدائع الصنائع ۵/۱۹۳)۔

اور حق ملک بالکل دوسری چیز ہے اور حق ملک کی وجہ سے سودی معاملہ جائز نہیں ہوتا، مثلاً بیٹے کے مال میں باپ کا حق ہے۔ ”انت و مالک لابییک“ لیکن اگر باپ اور بیٹا آپس میں سود کا معاملہ کریں تو سود ہوگا اور ناجائز ہوگا، کیونکہ ملک ایک نہیں ہے، حالانکہ حق ملک ہے۔

ملک اور حق ملک کا فرق ایک دوسرے مسئلہ سے بھی واضح ہوگا، بائع نے مشتری سے کہا کہ میں نے یہ مال اتنے میں تجھ سے فروخت کیا تو یہ ایجاب ہے اور خریدار کو اس مجلس میں قبول کرنے یا رد کرنے کا اختیار ہے، لیکن اگر مشتری کے قبول سے پہلے بائع اپنے ایجاب سے رجوع کر لے تو کر سکتا ہے۔ صاحب ”ہدایہ“ نے اس کی وجہ بتایا ہے۔ ”لخلوہ عن ابطال حق الغیر“ محشی نے ”عنایہ“ سے نقل کیا ہے کہ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ صرف ایجاب سے اگرچہ ملکیت نہیں ہوتی ہے، لیکن مشتری کو حق ملک تو حاصل ہو جاتا ہے اور بائع کے رجوع سے اس کا یہ حق باطل ہو جائے گا، پھر خود ہی جواب دیا ہے کہ جب ایجاب مفید ملک نہیں ہوا تو ملک بائع کو حاصل ہے اور مشتری کو حق ملک حاصل ہے اور ملک حق ملک سے قوی تر ہے۔

”فالجواب أن الإيجاب إذا لم يكن مفيداً للحكم وهو الملك كان الملك حقيقة للبائع، وحق التملك للمشتري إن سلم ثبوته بإيجاب البائع لا يمنع الحقيقة لكونها أقوى من ذا الحق لا محالة“ (حاشیہ ہدایہ ۱۹۳)۔

اس لئے اگر خزانہ حکومت میں رعایا کو حق ملک ہو تو بھی سودی معاملہ جائز نہیں ہوگا۔

۱۱- جو شخص بیمہ پالیسی خریدتا ہے ضروری نہیں ہے کہ کمپنی سے رقم خود اسی کو ملے وہ تو بیمہ اس لئے کراتا ہے کہ اس نامزد شخص یا اشخاص یا ورثہ کو اس کے مرنے کے بعد اچھی خاصی رقم ملے، ایسی صورت میں اس کو کہاں موقع ہوگا کہ سود کی رقم بہ صورت ٹیکس حکومت کو واپس کرے یا ان کاموں میں خرچ کرے جن کی انجام دہی حکومت کی ذمہ داری ہے، اس لئے اس مقصد کے لئے بیمہ پالیسی خریدنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، البتہ اگر کسی نے غلطی سے بیمہ پالیسی خرید لیا تھا اور اب اس کو سود کی رقم حاصل ہو گئی ہے تو اس طرح وہ رقم حکومت کو واپس کر سکتا ہے۔

۱۲- اگر بیمہ دار سود کی رقم کسی دوسرے کو بہ طور امداد دے گا تو پھر اس کو بیمہ کرانے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ پھر یہ کیا ضروری ہے کہ یہ اضافی رقم اسی کو ملے گی؟ وہ بیمہ تو اس لئے کراتا ہے کہ اس کے پسماندگان کو اچھی خاصی رقم ملے، صدقہ کرنا تو کسبِ حرام کا کفارہ ہے، گھر میں مرہم اس لئے ہوتا ہے کہ اگر انگلی کٹ جائے تو مرہم کے ذریعہ اس کا علاج کیا جائے۔ مرہم رکھنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ چونکہ مرہم موجود ہے اس لئے انگلی کاٹی جائے۔ جس طرح صدقہ کرنے کے لئے چوری اور ڈاکہ زنی کی اجازت نہیں ہو سکتی، اسی طرح صدقہ کرنے کے لئے سود لینے اور جو ا کھیلنے کی بھی اجازت نہیں دی جاسکتی اور بیمہ میں چونکہ سود اور قمار دونوں ہیں، اس لئے صدقہ کرنے کے لئے بیمہ کی اجازت نہیں ہو سکتی ہے۔

۱۳- علماء ماہرین اور ماہرین معاشیات کی مشترکہ مجلس اگر غور کرے تو انشورس کی مروجہ شکل میں ترمیم بھی ہو سکتی ہے اور اس کا بدل بھی تجویز کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں اپنے پیش رو بزرگوں کے مضامین سے بھی رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

## انشورس کا شرعی حکم

مولانا شبیر احمد صاحب ☆

حرمتِ ربا اور اس پر وعید:

نزولِ قرآن سے پہلے ربا ایک معروف و متعارف چیز تھی، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سود اور سودی کاروبار کی سخت مذمت فرمائی ہے اور سود کھانے والے قیامت کے روز حیران و مدہوشی کی حالت میں خبطی بنا کر اٹھائے جائیں گے:-

”الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ

مِنَ الْمَسِّ“ (سورۃ بقرہ: ۲۷۵)۔

ایک جگہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیج کو حلال اور سود کو حرام فرمایا ہے:

”أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا“ (سورۃ بقرہ: ۲۷۵)۔

دوسری جگہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ سود اور سودی کاروبار کو ملیا میٹ کر دیتا ہے اور صدقات

و خیرات کو فروغ دیتا ہے:

”يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيلُ الصَّدَقَاتِ“ (سورۃ بقرہ: ۲۷۶)۔

تیسری جگہ سودی کاروبار کو چھوڑنے اور اس سے باز رہنے کو ایمان کی شرط قرار دیا ہے

اور سودی لین دین میں جھے رہنے اور اس سے باز نہ آنے والوں کو خدا اور رسول سے اعلانِ جنگ

کا چیلنج بتلایا ہے اور فرمایا کہ اے ایمان والو! اگر تم حقیقی معنی میں مومن ہو تو سودی کاروبار ترک کرو اور جو رہ باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو، اگر تم کو یہ منظور نہیں ہے تو اللہ اور رسول سے جنگ کا اعلان کر دو اور خدائی طاقت کے مقابلہ کے لئے تیار ہو جاؤ۔

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ“ (سورۃ بقرہ: ۲۷۹)۔

اور حضور ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، سودی حساب و کتاب کرنے والے اور سودی معاہدہ لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی ہے۔

”عن جابرؓ قال لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم اكل الربوا وموكله و كاتبه و شاهده“ (ابوداؤد ۱۱۷۲/۲، مسلم ۲۷۲/۲، مشکوٰۃ ۲۴۴/۱)۔

ایک اور جگہ حضور ﷺ نے مزید شدت کے ساتھ یہ فرمایا کہ ایک درہم کے بہ قدر سود کھانا چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ بدتر ہے۔

”قال رسول الله ﷺ درهم ياكله الرجل وهو يعلم اشد من ستة وثلاثين زنية“ (مشکوٰۃ ۲۴۶/۱)۔

اور اسی حدیث شریف کے ذیل میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ ربوا کو چھتیس مرتبہ زنا سے زیادہ برا اس لئے کہا گیا کہ سودی کاروبار اللہ و رسول سے اعلان محاربہ اور مقابلہ آرائی ہے، اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے مقابلہ آرائی چھتیس مرتبہ زنا سے زیادہ برا اور باعث بربادی ہے (حاشیہ مشکوٰۃ ۲۴۶/۱، احیاء المعانی ۲۳/۳)۔

ربا کا لفظ سودی معاملہ کے لئے زمانہ جاہلیت سے معروف و مشہور طریقے سے مستعمل ہوتا چلا آیا ہے اور موجودہ دور میں ربا نظام تجارت کے رکن اعظم کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، نصوص قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے جب اس کی حرمت سامنے آتی ہے تو عام طبائع ان کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کے وقت اس کی حرمت سے ہچکچاتی ہیں اور حیلہ جوئی کی طرف مائل ہوتی ہیں، چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جس میں کوئی شخص سود کھائے بغیر محفوظ

نہیں رہ سکتا یہاں تک کہ اگر کوئی بے انتہا احتیاط کرتا رہے اور سو سے دور بھاگتا رہے تو پھر سو کا کچھ نہ کچھ حصہ اور اس کا اثر اس کو پہنچے گا اور کوئی بچ نہیں سکے گا۔

”عن ابی ہریرۃؓ أن رسول اللہ ﷺ قال لیأتین علی الناس زمان لا یبقی أحد إلا أکل الربوا فإن لم يأكله أصابه من بخاره، قال ابن عیسیٰ أصابه من غباره“ (ابوداؤد ۲/۱۱۷، مشکوٰۃ ۲۳۵)۔

### حرمت قمار اور وعید:

زمانہ اسلام سے پہلے قمار اور جو ایک مشہور اور قابل فخر چیز تھی اور جاہلیت عرب میں مختلف قسم کے قمار اور جوئے رائج تھے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں قمار اور قمار بازی کی سخت مذمت فرمائی ہے اور یہ شیطانی حرکت ہے کہ شیطان قمار کے ذریعہ انسانی معاشرے میں عداوت اور بغض و عناد اور نفرت کی بیج بوتا ہے اور اللہ کے ذکر اور نماز جیسی بنیادی عبادت سے غافل کر دیتا ہے:

”إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ“ (سورۃ مائدہ: ۹۱)۔

ایک جگہ فرمایا ہے کہ قمار اور جوئے میں عظیم ترین گناہ ہے اور اس میں بہ ظاہر لوگوں کے لئے کچھ فائدہ بھی ہے، لیکن اس کا گناہ فائدہ سے کہیں زیادہ ہے:

”يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنْفَعٌ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا“ (سورۃ بقرہ: ۲۱۹)۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے قمار کو شیطان کا ناپاک عمل قرار دیا ہے اور قمار سے دور رہنا اور اپنے آپ کو قمار سے محفوظ رکھنا دنیا و آخرت کی کامیابی کی شرط قرار دیا ہے:

”إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ“ (سورۃ مائدہ: ۹۰)۔



اور قمار اور جوئے سے انسانی زندگی درہم برہم ہو جاتی ہے اور بہت سے گھر برباد ہو جاتے ہیں اور لکھ پتی آدمی فقیر بن جاتا ہے (معارف القرآن ۱/۴۸۰) اس لئے قمار کی کوئی بھی شکل قطعاً حدود جواز میں نہیں آسکتی۔

### بیمہ کی حقیقت اور اس کا مقصد:

اس کو اردو میں ”بیمہ“ اور انگریزی میں ”انشورنس“ اور عربی میں ”سوکرہ“ کہا جاتا ہے (جواہر الفقہ ۱۶۹/۲، شامی ۱۷۰/۳)۔ اس کے معنی لغت میں یقین دہانی کے ہیں اور اصطلاح اور محاورہ میں بھی قریب قریب یہی معنی ہیں، اس لئے کہ کمپنی کی طرف سے بیمہ کرانے والے کو بعض خطرات سے حفاظت اور بعض نقصانات کی تلافی کی یقین دہانی کرا دی جاتی ہے، اور کمپنی طالب بیمہ سے ایک معینہ رقم بالا قسط وصول کرتی رہتی ہے اور ایک معینہ مدت کے بعد وہ رقم اسے یا اس کے پسماندگان کو حسب شرائط واپس کر دی جاتی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ فی صد کے حساب سے کچھ مزید رقم بھی بہ طور سود دیتی ہے اس میں کمپنی کا مقصد دوسروں کو دے کر اعلیٰ شرح پر سود حاصل کرنا ہوتا ہے یا تجارت میں لگا کر منافع حاصل کرنا ہوتا ہے۔

### بیمہ کے اقسام:

بیمہ کی چار قسمیں ہیں:

زندگی کا بیمہ، املاک کا بیمہ، ذمہ داری کا بیمہ، سندات و کاغذات اور نوٹوں کا بیمہ۔

### زندگی کا بیمہ:

اس کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ طالب بیمہ کا ڈاکٹری معائنہ کرایا جاتا ہے اور ڈاکٹر یہ رپورٹ پیش کرے کہ یہ شخص اگر ناگہانی آفت کا شکار نہ ہو تو، مثلاً بیس سال زندہ رہ سکتا ہے تو ڈاکٹر رپورٹ کے مطابق بیس سال کے لئے بیمہ کمپنی حسب شرائط اس کی زندگی کا بیمہ کر لیتی

ہے۔ اور حسب شرائط طالب بیمہ رقم جمع کرتا رہتا ہے اور جب مدت پوری ہو جاتی ہے تو عقد بیمہ مکمل ہو جاتا ہے اور اس میں تین شکلیں ہو سکتی ہیں۔

۱- طالب بیمہ مدت پوری ہونے کے بعد بھی زندہ رہے تو خود اس کو جمع شدہ رقم مع سود کے مل جاتی ہے۔

۲- مدت مذکورہ سے پہلے مر جائے تو کمپنی اس کے پسماندگان کو حسب شرائط جمع شدہ رقم مع سود کے دے دیتی ہے۔

۳- ڈاکٹر کے اندازہ کے مطابق مدت متعینہ کے مکمل ہو جانے پر طالب بیمہ کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کے پسماندگان کو جمع شدہ رقم حسب شرائط مع سود کے مل جاتی ہے (جو اہر الفقہ ۱۷۰۲)۔

### املاک کا بیمہ:

مالیت کے بیمہ کی شکل یہ ہوتی ہے کہ عمارت، کارخانہ، موٹر، جہاز وغیرہ اشیاء کے تین ماہ چھ ماہ، یا سال بھر کا اس طرح بیمہ کرایا جاتا ہے کہ حسب شرائط طالب بیمہ رقم جمع کرے گا اور مدت معینہ کے اندر اندر اگر بیمہ شدہ املاک ہلاک ہو جائے تو کمپنی صرف نقصان کی تلافی کرتی ہے اور اس میں فیصد کے حساب سے کوئی رقم بہ طور سود مزید نہیں ملتی ہے، اور اگر مدت کے اندر املاک صحیح سالم رہ جائیں اور کسی قسم کا نقصان املاک کو نہ پہنچے تو کمپنی کوئی رقم دین دار نہیں ہوتی ہے، اور طالب بیمہ کو جمع شدہ اصل رقم بھی نہیں ملتی ہے، بلکہ کمپنی املاک کی حفاظت کی ضامن ہوتی ہے اور کمپنی اسی ضمانت کے نام سے طالب بیمہ سے حسب شرائط رقم وصول کرتی ہے اور املاک کے بیمہ میں سود کی کوئی شکل نہیں آتی ہے، بلکہ ایک قسم کے قمار میں داخل ہو سکتا ہے، اس لئے کہ ہلاک ہونے اور نہ ہونے میں تردد ہے اور ”تعلیق الملک علی الخطر“ کو قمار کہا جاتا ہے۔

### ذمہ داری کا بیمہ:

اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ بچوں کی تعلیم اور شادی وغیرہ کے لئے کمپنی ذمہ داری لیتی



جوا کی قطعی حرمت قرآنی دلائل سے ثابت ہو چکی ہے (سورہ مائدہ: ۹۱، سورہ بقرہ: ۲۱۹، معارف القرآن ۱/۴۸۰)۔

۳- انسان کی جان اور اعضاء اشیاء منتقوہ میں سے نہیں ہیں اور شئی غیر منتقوہ کا کوئی عوض نہیں ہوا کرتا ہے اور اگر بالفرض عوض مقرر کیا جائے تو وہ عوض نہیں ہوتا ہے، بلکہ صورت رشوت ہوتی ہے اور رشوت بھی بہ حکم خبر حرام اور باعث عذاب ہے۔

”لعن رسول اللہ ﷺ الراشی والمرتشی“ (ابوداؤد ۲/۱۴۸، ترمذی ۱/۱۵۹، ابن ماجہ ۶۸)۔

لہذا ان وجوہ حرمت کی بنا پر جیون بیمہ قطعی ناجائز اور حرام ہے (امداد الفتاویٰ ۱۶۱/۳، فتاویٰ رحیمیہ ۲/۲۰۰، فتاویٰ محمودیہ ۲/۳۰۸، کفایۃ المفتی ۸/۷۶، ۷۷)۔ اور اس کے لئے اسلامی شریعت میں کسی طرح کی کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

### ایک اہم اشکال اور جیون بیمہ کی سخت ضرورت:

ہندوستان جیسے ممالک میں مسلمانوں کو اپنی جان کا ہر وقت سخت خطرہ رہتا ہے، آئے دن فسادات میں سیکڑوں مسلمان جان سے مار دیئے جاتے ہیں اور اگر مسلمان اپنی جان کا بیمہ کرائیں گے تو آبرو اور جان کی حفاظت یقینی ہے، تو اس نازک ترین صورت حال میں تباہی اور ہلاکت سے حفاظت کے لئے مسلمانوں کا اپنی جان کا بیمہ کرانا جائز کیوں نہیں ہے؟ اور کیا یہ ”الضرورات تبیح المحظورات“ (الاشباہ والنظائر ۱۴۰) کے تحت داخل ہو کر ایسی شدید ضرورت نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے بیمہ جیسی حرام چیز کو اختیار کر کے اپنی جان جیسی عظیم ترین چیز کی حفاظت کی جائے؟

تو اس کے دو جواب دیئے جاسکتے ہیں:

جواب نمبر ۱:

حضرات فقہاء نے ایسی حرام اور ناجائز چیز کا استعمال مباح ہونے کے لئے اصول و

ضابطہ ”الضرورات تبیح المحظورات“ (الاشاہہ ۱۴۰/۱) مقرر فرمایا ہے اور ضرورت کے پانچ درجات ہیں:

- ۱- ضرورت بمعنی اضطرار
- ۲- ضرورت بمعنی حاجت
- ۳- ضرورت بمعنی منفعت
- ۴- ضرورت بمعنی زینت
- ۵- ضرورت بمعنی فضول

اور ضرورت بمعنی اضطرار سے ایسی ضرورت اور پریشانی مراد ہے کہ اگر حرام کا ارتکاب نہ کیا جائے تو ہلاکت اور جان کا سخت خطرہ ہے تو ایسی پریشانی کی حالت میں بقدر ضرورت حرام کا ارتکاب کر کے جان بچانے کی اجازت اور حکم ہے، اور مذکورہ اصول و ضابطہ میں یہی ضرورت مراد ہے۔

اور ضرورت بمعنی حاجت اور اس سے نیچے درجات کی وجہ سے حرام کا ارتکاب جائز نہیں ہے، اور انڈین فسادات میں عام طور پر وہی لوگ مارے جاتے ہیں جو خودبتلا ہوتے ہیں اور جو لوگ دور رہتے ہیں وہ عام طور پر فساد کی زد میں نہیں آتے، ہاں البتہ اگر ایسے لوگ فساد کی زد میں آتے بھی ہیں تو وہ یا تو رکشہ والے، ٹھیلے والے اور پھل والے ہوتے ہیں جو روز کی کمائی سے روز کی ضرورت پوری کرتے ہیں، جو بیمہ کرانے پر قدرت نہیں رکھتے اور یا زد میں آنے والے اجنبی مسافر ہوتے ہیں جو درحقیقت فساد یوں کا نشانہ نہیں ہوتے ہیں، نیز فساد کی بوقت بلوئی یہ امتیاز ہرگز نہیں کرتے کہ فلاں بیمہ شدہ ہے اور فلاں بیمہ شدہ نہیں ہے، نیز اگر یہ کہا جائے کہ بیمہ کرانے سے حکومت فساد یوں پر سخت ترین کنٹرول کرے گی تو یہ ایک امر موہوم اور مترد فیہ ہے، کیونکہ حکومت پہلے ہی سے کنٹرول کرنے کی ذمہ دار ہے اور جہاں حکومت کو فساد کرانا ہوتا ہے وہاں عمومی بیمہ کے باوجود فساد ہوا ہے اور پچھلے دنوں جہاں جہاں فساد ہوا ہے وہاں اکثر دکانیں بیمہ شدہ تھیں جن کو فساد یوں نے جلا دیا ہے، تو اسی طرح اگر جان کا بیمہ کرایا جائے تو بھی انسداد فساد کا تیقن نہیں ہو سکتا، اور حکومت کی طرف سے سختی اور کنٹرول ایک مترد فیہ امر ہے، امر واقعی نہیں ہے، اس لئے اگر ”الضرورات تبیح المحظورات“ کے تحت جیون بیمہ کی اجازت دی

جائے تو فسادات اپنی جگہ ہوتے رہیں گے اور مسلمانوں میں بلاوجہ ایک قطعی حرام چیز کا ارتکاب عام ہو جائے گا جس کے ذمہ دار علماء ہوں گے۔

### جواب نمبر ۲:

اگر زبردستی جیون بیمہ کو ”الضرورات تبیح المحظورات“ (الاشباہہ/۱۴۰۰) کے تحت داخل کر کے گنجائش نکالی جائے تو عام مسلمانوں کے دلوں میں اس کی جو نفرت اور گندگی اور حرمت کا تصور جما ہوا ہے وہ بالکل ختم ہو جائے گا اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ مسلمان اس کو بالکل حلال اور جائز سمجھ کر کرنے لگیں گے، اس لئے جیون بیمہ موجودہ حالات میں کسی طرح جواز کے دائرے میں داخل نہیں ہو سکتا۔

### املاک کے بیمہ کا شرعی حکم:

املاک کے بیمہ میں سود کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے، کیونکہ اس میں جمع شدہ رقم واپس نہیں ملتی، بلکہ اگر املاک ہلاک ہو جائے یا اس میں نقصان ہو جائے تو کمپنی صرف ہلاکت اور نقصان کی تلافی کرتی ہے اور اگر مدت مقررہ میں املاک کو کوئی نقصان نہ پہنچے تو کمپنی جمع شدہ رقم کی مالک ہو جاتی ہے اور طالب بیمہ کو اس کے عوض میں کچھ بھی نہیں ملتا اور چونکہ املاک کو نقصان پہنچنا اور کمپنی کا اس کی تلافی کرنا ایک امر متردد فیہ اور ”تعلیق الملک علی الخطر“ ہے، اس لئے اس میں قمار کا شائبہ موجود ہے، لیکن ہندوستان کے موجودہ نازک ترین صورت حال میں ”الضرر یزال“ (الاشباہہ/۱۳۹) اور ”الضرورات تبیح المحظورات“ کے تحت اس کو داخل کر کے دائرہ جواز میں لایا جاسکتا ہے، اور اگر کمپنی کا جہاز ہو، یا دکان و عمارت کی کمپنی از خود حفاظت کرتی ہو تو قمار کا شائبہ بھی نہیں رہے گا اور جمع شدہ رقم اجرت کے حکم میں ہوگی اور نقصانات کی تلافی کمپنی کی طرف سے امداد و اعانت ثابت ہوگی۔

ذمہ داری کے بیمہ کا شرعی حکم:

بچوں کی تعلیم اور شادی وغیرہ کی ذمہ داری کا بیمہ کرایا جاتا ہے اور اس میں حیون بیمہ کی طرح سود اور قمار دونوں موجود ہوتے ہیں اور اس میں جان وغیرہ کا کوئی خطرہ کسی بھی حال میں نہیں ہے، اس لئے یہ قطعی حرام اور ناجائز ہوگا۔

سندی کاغذات اور نوٹوں کے بیمہ کا شرعی حکم:

محکمہ ڈاک وغیرہ میں جو سندی کاغذات اور رجسٹری رقم وغیرہ کا بیمہ کرایا جاتا ہے وہ شرعاً جائز اور مباح ہے، اس لئے کہ محکمہ ان کاغذات اور نوٹوں کی حفاظت کا خود ذمہ دار ہوتا ہے اور وہ اپنی ضمانت میں وہ اشیاء قبضہ میں لیتا ہے اور اس طرح کا معاملہ شرعاً جائز اور مباح ہے (امداد الفتاویٰ ۱۶۱/۳، جواہر الفقہ ۱۸۲/۲)۔

وإن كان صاحب السوكره هو صاحب المركب يكون أجيراً مشتركاً  
(الی قولہ) ولو قال: إن كان مخوفاً وأخذ مالك فأنا ضامن ضمن الخ“  
(شامی ۱۷۰/۲)۔



## ملک کے موجودہ سنگین حالات میں انشورنس

شاہ قادری سید مصطفیٰ رفاعی ندوی ☆

زیر بحث مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انشورنس کرانا جائز ہے، یا ناجائز، اس وقت قابلِ بحث و توجہ صرف یہ بات ہے کہ اسے ناجائز تصور کرتے ہوئے، فقہی ضرورت یا حاجتِ شدیدہ کی بنیاد پر اس کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں، موجودہ حالات میں جبکہ مسلمانوں کی جان و مال اور تجارت کو ہر دم خطرہ ہے، اس صورتِ حال کو فقہی ضرورت و حاجت کے ضمن میں داخل سمجھا جاسکتا ہے یا نہیں؟۔

ملک میں جو سنگین صورت حال پیدا ہوگئی ہے اور فرقہ پرست متعصب قوتوں نے جس طرح پورے ملک میں نفرت کا زہر پھیلا دیا ہے اور اس کے نتیجے میں جس طرح مسلمانوں کی نسل کشی کی جا رہی ہے، ان کی جان و مال اور عزت و آبرو ہر جگہ ہر وقت خطرات میں گھری ہوئی ہے، خاص کر ان کی صنعت و تجارت کو تباہ کر کے معاشی طور پر ان کی کمر توڑنے کی جو منصوبہ بند بھرپور کوشش کی جا رہی ہے، اس ماحول میں اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ جان و مال کے انشورنس پر تمام علمائے کرام کی طرف سے ایک متفقہ رائے عامۃ المسلمین کے سامنے آجائے تاکہ وہ احتیاطی تدابیر و تدارک کا پیشگی انتظام کر سکیں۔

دستورِ ہند میں مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت، حکومت کے ذمہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ



حکومت کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ہر اعتبار سے انھیں محفوظ و مامون رکھے، لیکن حکومت اس فریضہ کو پورا نہیں کر پارہی ہے بلکہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس کی غفلت، اس کے تجاہل اور اس کی جانب دارانہ رویہ کی وجہ سے آئے دن ملک میں تسلسل کے ساتھ سینکڑوں فسادات ہوتے ہیں، مگر صورت حال تو یہ ہے کہ ان مسلمانوں کے لئے جو فسادات میں کسی طرح زندہ تو رہ گئے ہیں، مگر ان کی املاک تباہ ہو چکی ہیں، ان کی تجارتیں اور صنعتیں برباد ہو چکی ہیں، نئے سرے سے زندگی شروع کرنا بہت دشوار اور کٹھن ہو گیا ہے، چونکہ بیمہ کمپنیاں سرکاری ہوتی ہیں، اس لئے ان کے نفع و نقصان کی ذمہ داری سرکار کی طرف ہی لوٹی ہے، یہ سرکاری انشورنس کمپنیاں بیمہ شدہ املاک کی تباہی پر پوری رقم ادا کرنے کی پابند ہوتی ہیں، اگر مسلمان جان، جائیداد وغیرہ کو احتیاطاً بیمہ کر رکھیں اور فسادات سے جو کسی وقت بھی ہو سکتے ہیں، انہیں نقصانات ہوں تو حسب قاعدہ ان کمپنیوں کو انشورنس کی پوری رقم دینی پڑے گی، اور یقیناً ادائیگیوں سے انہیں بہت زیادہ گھاٹا اور نقصان برداشت کرنا پڑے گا جو دراصل حکومت کا نقصان عظیم ہے، سرکار کے سامنے ان نقصانات سے بچنے کی ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ وہ ملک میں امن و امان کی فضا بنائے اور برقرار رکھے، اس کے لئے وہ اپنی پوری انتظامیہ اور مشنری کو بروئے کار لاکر شریکیند عناصر کی تختی کے ساتھ سرکوبی کرے اور فسادات کے سلسلہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے۔

جانی و مالی بیمہ سے مسلمانوں کو دو فائدے حاصل ہو سکتے ہیں، ایک فسادات کی روک تھام پر حکومت مجبور ہو جائے گی، اور دوسرا فسادات میں جو نقصانات ہوتے ہیں، سرکار خود اپنی بیمہ کمپنیوں کے ذریعہ ان کی تلافی پر مجبور ہو جائے گی، نیز اس تدبیر سے شریکیند قوتوں کا وہ بُرا مقصد بھی فوت ہو جائے گا کہ فسادات کے ذریعہ مسلمانوں کو پسماندہ و زبوں حال کر دیا جائے اور انھیں دست نگر اور ماتحت بنا کر رکھا جائے اور ذہنی طور پر مرعوب کر کے غلامی کی زندگی پر مجبور کر دیا جائے۔

آج حکومت ملک کے نظم و نسق اور پر امن انتظامیہ میں پوری طرح ناکام ہو چکی ہے،

کوئی دن نہیں گزرتا جس میں ملک کے کسی نہ کسی علاقہ میں فساد نہیں ہوتا اور تباہی نہیں مچتی۔ جنوبی ریاستیں جو عام طور سے محفوظ و مامون سمجھی جاتی تھیں، وہ بھی اب ہنگاموں کی پٹیٹ میں آچکی ہیں، بلکہ پچھلے دنوں بعض مقامات میں بہت بڑے پیمانے پر فساد پھوٹ پڑا، جس کے نتیجے میں کروڑ ہا کروڑ مالیت کی املاک برباد اور سیکیٹروں قیمتی معصوم جانیں ضائع ہوئی ہیں، ان مواقع پر مرکزی و ریاستی حکومتیں صرف امن و امان کی اپیل اور صبر و تحمل کی تلقین ہی کرتی رہیں یا فسادات ہو چکنے کے بعد مگر مچھ کے آنسو رو کر محض خانہ پُری کے لئے ریلیف کا کام برائے نام کی ہیں۔

اس وقت تمام جنوبی ریاستوں میں عام طور سے حیرانی و پریشانی اور اضطراب کی کیفیت ہے، کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا کہ پتہ نہیں کب کیا ہو جائے، جنوبی ریاستوں میں ہو یا ملک کی کسی بھی ریاست میں، یہ سنگین اور ہولناک غیر یقینی حالات، جبری طور پر مسلمانوں پر مسلط کئے گئے ہیں۔ اس احقر فقیر کے نزدیک ان موجودہ غیر یقینی مسلط کردہ حالات پر، ”ضرورت شدیدہ“ جیسی استثنائی فقہی اصطلاح کا اطلاق بھی بہت نرم پہلو ہے، ان تباہ کن حالات میں مسلمانوں کو مزید ”مراعات“ ملنی چاہئیں جو انھیں آپ علماء کرام کے منفقہ فیصلہ ہی سے میسر و مہیا ہو سکتی ہیں۔

جانی و مالی انشورنس کی اجازت تو ان حالات میں انھیں ملنی ہی چاہئے، بلکہ بیمہ میں جمع کی ہوئی رقم سے زائد قومات کو بھی انھیں لینے اور استعمال کرنے کی اجازت دینا چاہئے تاکہ وہ اپنے نقصانات کی کسی حد تک تلافی کر سکیں، انشورنس کی تمام شکلوں کی مسلمانوں کو اجازت دے دینا وقت کا اہم تقاضہ ہے، جان کا بیمہ، جسمانی اعضاء کا بیمہ، مکان و دکان کا بیمہ، تجارتی کمپنیوں کا بیمہ، سواریوں کا بیمہ، تجارتی اشیاء کا بیمہ، ہمہ قسم کی مشینری کا بیمہ اور دستاویزات کا بیمہ وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ فسادات میں شریک عناصر مسلمانوں کی ہر چیز کو عداوت کرتے ہیں، اس لئے ان سبھی چیزوں کا بیمہ کر دینا دانائی و دور اندیشی کی بات ہے۔

”مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ“، اپنے اجتماع (مؤرخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۶۵ء) میں انشورنس کے

مسئلہ پر جس نتیجہ پر پہنچی ہے، یہ احقر فقیر اس کی پوری طرح تائید میں ہے۔  
 عامۃ المسلمین ہر دور میں چاہے وہ کتنے بے عمل و بد عمل ہوں، دینی مسائل میں علمائے  
 کرام کی طرف ہی رجوع ہوتے ہیں اور ان کی رائے کو حتمی سمجھ کر عمل میں لاتے ہیں اور علمائے  
 کرام بھی الحمد للہ ہر موقعہ پر ان کی صحیح رہنمائی کرتے ہیں، آج ملک پر عمومی تباہی و ہلاکت کے جو  
 بادل منڈلا رہے ہیں اور تمام مسلمان پریشان ہیں علمائے کرام کو فوری طور پر ان کی جان و مال کی  
 سلامتی کے لئے فکر مند ہو کر انھیں صحیح تدابیر سے آگاہ کر دینا چاہئے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) جو تمام مکاتب فکر کے مؤقر علماء کرام کا متحدہ پلیٹ فارم  
 ہے اس کی زیر نگرانی، یہ چوتھا فقہی سمینار آج کے اہم ترین مسئلہ انشورنس پر ہی حیدرآباد میں منعقد  
 ہوا ہے، اللہ رب العزت محض اپنے فضل و کرم سے اپنے حبیب پاک ﷺ کی پیاری امت کی  
 حفاظت، راحت اور سلامتی و خوش حالی کے لئے اس سمینار کے ذریعہ علمائے کرام کو ایک صحیح  
 مناسب فیصلہ پر متفق فرمائے۔



## انشورنس، ایک تحقیقی جائزہ

مولانا اختر امام عادل ☆

غور و فکر اور تحقیق و ریسرچ امت مسلمہ کا خاص طرہ امتیاز ہے۔ اور خدا کے نزدیک ہر زمانے میں تحقیقاتی کوششیں مطلوب ہیں، چنانچہ اتنے ذوق و ولولے کے ساتھ نہ سہی، لیکن کچھ نہ کچھ ہر دور میں علماء اور مفکرین نے اس قسم کی کوششیں کی ہیں، اسی سلسلے کی ایک کڑی ماضی قریب میں پاکستان میں ”مجلس تحقیق مسائل حاضرہ“ اور دوسری ہندوستان میں ”مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ“ ہے۔

مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ ہی نے سب سے پہلے انشورنس (بیمہ) کے موضوع پر ہندوستان میں اجتماعی فکر کی کوشش شروع کی تھی۔ اسی مجلس نے اس سلسلے میں سوالنامہ مرتب کیا تھا آج دوبارہ اکابر و اسلاف کی اسی قسم کی کوششوں کا احیاء ”اسلامک فقہ اکیڈمی“ نے کیا ہے، اور انشورنس کے موضوع پر امت کے سوچنے والے دماغوں کو غور و فکر کی دعوت دی ہے، اس موضوع پر قریب کی دہائیوں میں بہت سے اردو اور عربی مقالات و مضامین لکھے جا چکے ہیں، اور بہت سی قیمتی باتیں سامنے آگئی ہیں، ان مضامین کے دیکھنے سے قدر مشترک کے طور پر اتنا ثابت ہوتا ہے کہ موضوع بہر حال اہم ہے اور اس کا سمجھنا اور حل کرنا بہت زیادہ آسان نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام حضرات ایک نتیجہ فکر تک نہیں پہنچ سکے ہیں، بلکہ مختلف مکاتب فکر پیدا ہو گئے ہیں، اس لئے

☆ مہتمم جامعہ ربانی، منورہ شریف سستی پور

اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

میرے اس مضمون کے تین حصے ہوں گے۔

۱۔ پہلے حصے میں انشورنس کی شرعی حیثیت واضح کی جائے گی۔

۲۔ دوسرے حصے میں مروجہ انشورنس کے بارے میں مخالف نقطہ نظر کے دلائل کا جائزہ لیا جائے گا اور اسی کے ذیل میں ان سوالات کے جوابات دیئے جائیں گے جو سوالنامہ میں مذکور ہیں۔

۳۔ اور تیسرے حصے میں اسلامی بیمہ کمپنی کی تشکیل کی جائے گی، اور اس کے بنیادی

اصول و ضوابط کا ذکر کیا جائے گا۔

### انشورنس کی شرعی حیثیت:

انشورنس کی حیثیت سمجھنے کے لئے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ انشورنس کے

بارے میں بنیادی نقطہ نظر دو ہیں:

ایک انشورنس کے جواز کا ہے مطلقاً، اور دوسرے عدم جواز کا مطلقاً۔

مگر میری رائے میں انشورنس مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ناجائز، بلکہ انشورنس اپنے مقصود کے اعتبار سے جائز ہے، جو اس کی تاریخ آغاز سے معلوم ہوتا ہے، البتہ اس کے بعض ضروری اجزاء، شرعی اعتبار سے غلط ہیں، ان کو دور کرنے کے بعد صحیح اسلامی بیمہ کی تشکیل ہو سکتی ہے، لیکن ابھی چونکہ وہ حقیقی بیمہ موجود نہیں ہے، اس لئے اب بحث کے دو ہی رخ رہ جاتے ہیں کہ مروجہ بیمہ، شرعی اعتبار سے صحیح ہے یا غلط؟

مروجہ بیمہ میں بنیادی طور پر تین خطرناک اور مہلک عناصر ہیں: سود، قمار اور ظلم۔

### بیمہ میں سود:

بیمہ کمپنی اپنے ممبروں کو چاہے انھوں نے زندگی کا بیمہ کرایا ہو یا املاک کا یا ذمہ داری کا،

بونس یا منافع کے نام پر مقررہ شرح کے حساب سے مزید رقم دیتی ہے، یہ حقیقت میں سود ہی ہے، اگرچہ نام بدل کر بونس یا منافع رکھ دیا گیا ہے، نام بدل دینے سے کسی چیز کی حقیقت تبدیل نہیں ہو جاتی، عقود و معاملات میں اعتبار الفاظ کا نہیں، مقاصد و معانی کا ہے۔

”انما العبرة في العقود للمعاني لا للالفاظ“ (قواعد الفقہ)۔

”الأمور بمقاصدها“ (الاشباه والنظائر)۔

عقود میں صرف اعتبار معانی کا ہے، الفاظ کا نہیں، امور کا مدار مقاصد پر ہے، اس لئے بونس کے نام پر بیمہ کمپنی کی جانب سے جو مزید رقم ملتی ہے، وہ سود ہے۔ اور سود کو اللہ پاک نے قرآن مجید میں حرام قرار دیا ہے:

”أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا“ (سورہ بقرہ: ۲۷۵)۔

(اللہ نے بیع کو حلال اور ربوا کو حرام قرار دیا ہے)۔

حرمت قطعی کے آجانے کے بعد بھی جو سودی کاروبار میں لگا رہے، اس کے لئے خدا

اور اس کے رسول ﷺ سے اعلان جنگ ہے، قرآن نے کہہ دیا ہے:

”فَاذْنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ“ (سورہ بقرہ: ۲۷۹)۔

(پس اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کا اعلان کر دو)۔

اس لئے سود جب تک بیمہ کمپنی میں موجود ہے اس وقت تک اسے جائز سمجھنے کی کوئی

گنجائش نہیں ہے، مگر اضطرار کی حالت میں یہاں پر عموماً دو باتیں کہی جاتی ہیں:

۱- ایک یہ کہ جس سود کی ممانعت قرآن میں کی گئی ہے، اس میں قرض والا سود داخل نہیں

ہے، جبکہ بیمہ کمپنی ایک طرح سے ممبروں سے قرض لے کر مزید سود کے ساتھ قرض واپس کرتی

ہے، اس لئے بیمہ کمپنی کا سود ”آیت ربوا“ کی حرمت کے تحت داخل نہیں ہے۔

۲- دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ ہر طرح کے سود کی حرمت تسلیم بھی کر لی جائے تو بھی

ہندوستان جیسے ملک میں اس طرح کے سودی کاروبار کی اجازت ملنی چاہئے۔ اس لئے کہ

دارالحرب میں سودی کاروبار کی اجازت دی گئی ہے۔

البتہ دارالحرب ثابت ہو جانے کے بعد اس میں سودی کاروبار کی اجازت دی جاسکتی ہے بشرطیکہ بیمہ کمپنی کے ذمہ داروں میں کوئی مسلمان شریک نہ ہو۔ عام کتابوں میں تو مستامن کی قید لگی ہوئی ہے، جیسا کہ شامی وغیر کتابوں کے ظواہر سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ قید احترازی معلوم نہیں ہوتی، اس لئے کہ شرح السیر الکبیر کی عبارت میں مطلقاً مسلم کا لفظ ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسلمان کے لئے حربی سے سودی کاروبار کی اجازت ہے۔ خواہ وہ مسلمان دارالاسلام کا رہنے والا ہو یا دارالحرب کا۔

”ثم قد علم ان الربا لا یجری بین المسلم والحربی فی دار الحرب“

(شرح السیر الکبیر ۱۱۲/۳)۔

پھر یہ بات معلوم ہے کہ سود مسلم اور حربی کے درمیان دارالحرب میں نہیں جاری ہوتا۔ بہر حال فرق اپنی جگہ پر ہے۔ مگر دارالحرب میں سودی کاروبار اور عقود فاسدہ کے جواز میں دونوں متفق ہیں۔ اس لئے دارالحرب میں اگر بیمہ کا کاروبار کیا جائے بشرطیکہ جن حربیوں سے سود لیا جائے ان میں کوئی مسلمان شامل نہ ہو تو اس کاروبار کی اجازت دی جاسکتی ہے لیکن یہ بھی اس وقت جبکہ بہت مجبوری ہو، خواہ مخواہ اس کو اختیار کرنا تاکہ زیادہ سے زیادہ تمول حاصل ہو سکے، صحیح نہیں ہے، کیونکہ ربا اور قمار کی حرمت قرآن کریم کی نص قطعی سے ثابت ہے اس لئے اس کا احترام کرنا بہت ضروری ہے۔ مگر یہ کہ انسان مجبور ہو جائے۔

بیمہ میں قمار:

دوسرا مہلک اور خطرناک عنصر اس میں قمار کا ہے، کیونکہ اس میں حادثات اور موت پر منافع اور بونس کو معلق کیا جاتا ہے، جبکہ حادثات کا کسی کو علم نہیں کہ کب ہوں گے؟ اور نہ کسی کی موت کا کسی کو علم ہے کہ کب مرے گا؟

اور ایک مجہول چیز پر کسی نفع کو معلق کرنا غرر تو نہیں، البتہ خطر ضرور قرار دیا جاسکتا ہے، اور اسی کا نام قمار ہے، غرر اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ غرر میں ایک فریق کو انجام کا علم ہوتا ہے اور دوسرا فریق اس انجام سے بے خبر ہوتا ہے، اور فریق اول اس کی بے خبری سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کو دھوکے میں رکھ کر اپنے مفادات حاصل کرتا ہے اور یہی غرر ہے، یہ بھی ناجائز ہے، مگر بیمہ میں غرر نہیں پایا جاتا ہے، اس لئے کہ بیمہ کمپنی کا مقصد کسی کو دھوکہ دینا نہیں ہوتا، بلکہ یہ تو ایک تجارت اور کاروبار ہے جو زیادہ سے زیادہ نفع کی امیدوں پر قائم ہے، کمپنی بھی اپنا زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش میں رہتی ہے اور اس کے ممبران بھی طرح طرح کے حیلے اور ذرائع سے زیادہ سے زیادہ بونس وصول کرنے کے چکر میں رہتے ہیں، اور دونوں انجام سے بے خبر ہیں۔ کسی کو کسی کی بے خبری سے فائدہ اٹھانے کا قصد نہیں ہے، البتہ اس میں خطر ضرور موجود ہے، اس لئے کہ خطر اسی کا نام ہے کہ دونوں میں سے کسی کو بھی نقصان ہو سکتا ہے اور کسی کو بھی زیادہ سے زیادہ نفع ہو سکتا ہے، ہر ایک کو خطرہ ہو، کوئی کسی کی بے خبری سے فائدہ اٹھانے کی طاقت نہ رکھتا ہو، اور بیمہ کمپنی میں یہ عنصر موجود ہے، جیسا کہ میں نے عرض کیا اور جو بالکل ظاہر ہے اور کسی خطر پر کسی معاملے کے معلق کرنے کا نام قمار ہے، اور قمار کی حرمت بھی قرآن سے قطعی طور پر ثابت ہے، چاہے اس قمار میں غرر موجود ہو یا خطر، جیسا کہ امام رازی ”آیت میسر“ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ولا خلاف بین اهل العلم فى تحريم القمار وأن المخاطرة من القمار، قال ابن عباس: إن المخاطرة قمار وإن اهل الجاهلية كانوا يخاطرون على العال والزوجة وقد كان ذلك مباحا إلى أن ورد تحريمه“ (احکام القرآن ۱/۵۵۴)۔

(اہل علم کے درمیان قمار کی حرمت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی اختلاف ہے کہ خطر کی تمام شکلیں قمار میں داخل ہیں، حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ



خطر کی تمام صورتیں قمار ہیں، اور جاہلیت میں لوگ مال اور بیوی تک کی بازی لگا دیتے تھے اور یہ شروع میں جائز تھا، یہاں تک کہ اس کی حرمت آگئی۔

اس لئے جب تک قمار بیمہ کمپنی میں موجود ہے اس وقت تک اس کی حرمت قطعی طور پر ثابت ہے، اس کے جواز کے بارے میں سوچنے تک کی گنجائش نہیں ہے۔

### بیمہ میں ظلم کا عنصر:

بیمہ میں تیسرا عنصر ظلم کا ہے، بیمہ کا یہ اصول کہ معینہ مدت تک بلا قسط پوری رقم جمع کرنا ضروری ہے، مقررہ وقت سے قبل تعاون بند کر دینے کی صورت میں وہ ساری رقم جو جمع کی گئی سوخت ہو جاتی ہے، واپس نہیں ملتی، یہ صریح ظلم ہے، جس کی شریعت کبھی اجازت نہیں دے سکتی۔

قرآن کہتا ہے:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً  
عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ“ (سورہ نساء: ۲۹)۔

(اے ایمان والو! اپنے مالوں کو آپس میں غلط طریقے سے نہ کھاؤ، مگر یہ کہ رضامندانہ تجارت کے طور پر ہو)۔

بیمہ کمپنی کا یہ ایسا کھلا ہوا ظلم ہے کہ اس کو گوارا کرنا تو دور کی بات ہے، اسلامی حکومت میں بیمہ دار اگر چاہے تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کر سکتا ہے اور اس کو کوئی مناسب سزا بھی دلوا سکتا ہے اور اپنی رقم واپس لے سکتا ہے، اسلام ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ کسی کے مال کو غلط طریقے پر کوئی ہڑپ لے، کسی بھی ادارے کے ایسے اصول ہرگز نہیں ہونے چاہئیں جو ظلم و زیادتی پر مبنی ہوں یا جس سے کسی نص قطعی کی کھلی مخالفت لازم آتی ہو۔

دوسرے مفاسد کے سوا ان تین بنیادی مفاسد کی بنا پر بیمہ کمپنی کی مروجہ صورت ناجائز ہے، اس کی ممبری بھی صحیح نہیں ہے۔

## ۲- الف: جواز کی دلیلوں کا جائزہ:

مروجہ بیمہ کی شرعی حیثیت واضح ہو جانے کے بعد ان حضرات کے دلائل کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے جنہوں نے انشورنس کو مطلقاً جائز قرار دیا ہے، ان کے پاس بھی اچھے اور مضبوط دلائل ہیں، چونکہ بیمہ بہت بعد کی پیداوار ہے، اس لئے متقدمین سے اس بارے میں کوئی صراحت نہیں مل سکتی ہے، اس وقت ان کے لئے ایک ہی صورت ہے کہ بیمہ کو وہ فقہ کے کسی اصول پر قیاس کریں، اور اس سے جواز کا حکم پیدا کریں، چنانچہ ان لوگوں نے انشورنس کو فقہ حنفی کی مختلف چیزوں پر قیاس کیا ہے۔ ہم ترتیب وار ان دلائل کا جائزہ لیتے ہیں۔

## ۱- عقد مولات پر قیاس:

سب سے پہلی بات تو یہ کہی جاتی ہے کہ یہ امداد باہمی کی ایک صورت ہے، یہ حضرات اس کو عقد مولات پر قیاس کرتے ہیں جس کا جواز حضرت تمیم دارمیؒ کی روایت سے ثابت ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

” عن تمیم الداری أنه قال يا رسول الله! ما السنة في الرجل يسلم على يدي الرجل من المسلمين قال: هو أولى الناس بمحياه ومماته“ (ابوداؤد باب الولاء ۲/۳۸۸)۔

حضرت تمیم دارمیؒ نے حضرت رسول اکرم ﷺ سے پوچھا کہ اس شخص کے بارے میں کیا ضابطہ ہے؟ جو کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ وہ تمام لوگوں میں اس کی زندگی اور موت کے تمام مسائل کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔

اس روایت سے عقد مولات کے جواز پر استدلال کیا گیا ہے، جس میں ایک اجنبی دوسرے اجنبی کے ساتھ محض اسلام کے رشتے کی بنا پر اس طرح جڑ جاتا ہے کہ زندگی میں بھی اس کے ہر رنج و راحت کا شریک ہو جاتا ہے اور مرنے کے بعد اس کے مال میں اس کا حق قائم ہو جاتا

ہے اور باقاعدہ اسے وراثت دی جاتی ہے۔

زندگی میں رنج و راحت کے شریک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے پر خارج سے جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان کی ادائیگی میں ایک دوسرے کا معاون ہو جاتا ہے، مثلاً جنایات وغیرہ صادر ہونے کی صورت میں دیت اور تاوان عقد موالات کرنے والے پر واجب ہوتا ہے۔ بیمہ کے جواز کے قائلین کہتے ہیں کہ جب عقد موالات کی بنا پر دو انجمنی ایک دوسرے کے ضامن ہو سکتے ہیں تو موجودہ دور میں کسی ادارے سے اس طرح کا معاملہ کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟

لیکن میرے خیال میں حضرت تمیم داری کے اس روایت سے بیمہ کے جواز پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اولاً اس روایت میں یہی بحث طلب ہے کہ یہ منسوخ ہے یا محکم؟ محدثین نے اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے اس میں دو طرح کے احتمالات پیدا کئے ہیں۔

۱- پہلا احتمال تو یہ ہے کہ یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا اور بعد میں یہ حکم منسوخ کر دیا گیا تھا۔  
۲- اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ زندگی میں اس کے حقدار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے ناطے اس پر یہ حق آتا ہے کہ وہ اس کی مدد کرے، اور اس کی مصیبتوں میں کام آئے، اور مرنے کے بعد حقدار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نماز جنازہ ادا کرے، اس کی تجہیز و تکفین میں ہاتھ بٹائے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے لئے زندگی میں خاندانی حقوق اور مرنے کے بعد حقوق وراثت ثابت ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ملا علی القاری الحنفی مرقاۃ میں لکھتے ہیں:

”وحدیث تمیم الداری یحتمل أنه کان فی بدء الاسلام لأنهم کانوا بتوارثون بالاسلام والنصرة ثم نسخ ذلك، ویحتمل ان یکون قوله علیه السلام هو أولى الناس بمحیاه ومماتہ یعنی بالنصرة فی حال الحیوة وبالصلوة بعد الموت فلا یکون حجة“ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ۳/۳۹۶)۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

”وگفتہ اند کہ موالی وارث یک دیگر می شدند در ابتدائے اسلام، پس ازاں منسوخ شد و بعضے گفتہ اند کہ مراد آنست کہ اولی است بہ نصرت اور حال حیات و نماز گزاردن بروے بعد از ممات“ (اشعۃ اللمعات ۹۶/۲)۔

اور اسی طرح کی بات حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری نے بھی لکھی ہے (بذل الجہود ۱۱۳/۲)۔

محدثین کی ان توضیحات کے بعد یہ حدیث یا تو منسوخ قرار پاتی ہے یا موؤل ہو جاتی ہے اور دونوں صورتوں میں یہ حجت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی (ہدایہ کتاب الولاء)۔ اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس حدیث سے ”عقد موالات“ کا ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ حنفیہ نے ”عقد موالات“ کے ثبوت کے طور پر اسی حدیث سے استدلال کیا ہے، تو بھی بیمہ کے جواز کے حق میں یہ مفید نہیں ہے، کیونکہ ”عقد موالات“ جو کہ بیمہ کے لئے مقنن علیہ کی حیثیت رکھتا ہے اور جو حنفیہ کے نزدیک جائز اور ثابت ہے، اس کے لئے حنفیہ نے جو شرائط قائم کی ہیں ان میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ ”عقد موالات“ اسی وقت صحیح اور نافذ ہو سکتا ہے، جبکہ ولاء کرنے والے میت کا کوئی وارث زندہ نہ ہو۔ اگر کوئی بھی وارث زندہ ہے تو یہ عقد باطل قرار پائے گا، اس سے صرف زوجین کا استثناء ہے، یعنی ولاء کرنے والے کا کوئی وارث سوائے بیوی کے یا سوائے شوہر کے زندہ نہ ہو، تو یہ عقد صحیح ہوگا اور مولی کے مرنے کے بعد ان دونوں (زوجین) کا مقررہ حق دینے کے بعد جو بیچ جائے گا، اس میں ولاء جاری ہوگا، جیسا کہ ”ہدایہ“ میں ہے:

”إن كان له وارث فهو أولى منه، وإن كانت عمة أو خالة أو غيرهما من ذوی الأرحام“ (ہدایہ کتاب الولاء، علامہ ابو بکر رازی الجصاص نے بھی اس پر اچھی خاصی بحث کی ہے اور تقریباً اس قسم کی باتیں لکھی ہیں، احکام القرآن ۱۸۶/۲)۔

(اگر اس کا کوئی وارث ہے تو وارث ہی زیادہ حقدار ہے، اگر چہ ذوی الارحام میں سے پھوپھی یا خالہ وغیرہ ہی کیوں نہ ہو)۔

”عالمگیری“ میں ہے:

عقد موالات کے صحیح ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ عاقد کا کوئی وارث موجود نہ ہو، یعنی اس کا کوئی قریبی وارث نہ ہو، ورنہ یہ عقد صحیح نہیں ہوگا، البتہ اگر شوہر، یا بیوی موجود ہے تو عقد صحیح ہو جائے گا، اور ان دونوں کا حصہ دینے کے بعد باقی ماندہ مال ولاء کرنے والے کا ہوگا (فتاویٰ ہندیہ ۳۲/۵)۔

اور علامہ کاسانی نے بھی اس کی صراحت کی ہے (بدائع الصنائع ۱۷۱/۴)۔

ماضی قریب کے ایک حنفی شارح حدیث بھی انہی فقہاء کے ہم زبان ہیں۔ وہ حدیث کی شرح کرتے ہوئے یہ مسئلہ بھی لکھ جاتے ہیں:

میں کہتا ہوں کہ یہ اس وقت ہے جبکہ کوئی آدمی کسی مسلمان کے ہاتھ پر صرف اسلام لے آئے، لیکن اگر اس کے ساتھ معاہدہ اور حلف بھی ہو جائے تو اس وقت ولاء کرنے والا ہم حنفیہ کے نزدیک میراث کا زیادہ حق دار ہوگا، بشرطیکہ اس کے رشتہ دار وارثوں میں سے کوئی موجود نہ ہو (بذل اللہود ۱۱۳/۴)۔

تو جب مقیس علیہ ”عقد موالات“ کی صحت کے لئے وارثوں کا فقدان شرط ہے تو پھر بیمہ کا جواز غیر مشروط طور پر کیوں کر ثابت ہو سکتا ہے جبکہ بیمہ عموماً بال بچوں اور خاندان والوں کی ضروریات کی بنا پر ہی خریداجاتا ہے، اس لئے بیمہ کو ”عقد موالات“ پر قیاس کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں کے درمیان فارق موجود ہے۔

یہاں پر بعض حضرات نے فارق کی تشریح کرتے ہوئے یہ بات بھی کہی ہے کہ یہ عقد موالات صرف نو مسلموں کے لئے ہے، روایتی مسلمانوں کے لئے یہ عقد صحیح نہیں ہے، مگر میری رائے میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ عقد موالات کی صحت کے لئے سرے سے اسلام ہی شرط نہیں ہے، چہ جائیکہ نو مسلم ہونا، اور نہ دونوں کا مذہبی اتحاد شرط ہے، البتہ اجنبیت اور لا وارثیت ہونی چاہئے، جیسا کہ صاحب بدائع الصنائع، درمختار اور عالمگیری وغیرہ میں فقہاء نے صراحت کی ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: بدائع ۱۷۱/۴، درمختار ۱۲۷/۶، عالمگیری ۳۵/۵)۔

اسلام یا نو اسلام کی شرط لگانا مذکورہ فقہاء کی تصریحات کے خلاف ہے، اس شرط کے بغیر بھی عقد موالات پر قیاس کرنا اور حضرت تمیم داری کی روایت سے استدلال کرنا باطل ہو جاتا ہے۔

### امداد باہمی کا حیلہ:

اس کے علاوہ ”عقد موالات“ کا امداد باہمی کا ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن انشورس کو امداد باہمی کہنا سمجھ سے باہر ہے، کیونکہ یہ تو ایک طرح کا کاروبار تجارت ہے، جو اس غلط نظریے پر قائم ہے کہ عادیٰ حوادث کا اوسط کیا رہے گا؟ اور کمائی کا اوسط کیا رہے گا؟ آمدنی کے اوسط کے مقابلے میں حوادث کا اوسط کم ہونے کی بنیاد پر یہ کاروبار چل رہا ہے، جس دن یہ رخ تبدیل ہو جائے اور حوادث کا اوسط آمدنی کے اوسط سے بڑھ جائے، اسی دن یہ تمام کمپنیاں بند کر دی جائیں گی پھر اسے امداد باہمی کہنا ایک دھوکہ کے سوا کیا ہے؟

بلکہ ہمارے بعض بزرگوں کے بیان کے مطابق یہ بیمہ سودی کاروبار کا تہمتہ ہے، سودی کاروبار میں دو طرح کے نقصانات ہو سکتے ہیں یا تو سرے سے پورا مال ہی تباہ ہو جائے یا مال کی قیمت گھٹ جائے ان دونوں نقصانات کی تباہی سودی کاروباریوں نے خود بھگتنے کی بجائے پوری قوم کے سر ڈال دیا ہے، پہلے نقصان کی تلافی بیمہ کے راستے سے کر لی اور دوسرے نقصان کی تلافی سٹہ کے عنوان سے کر لی اور ان دونوں طرح کے کاروبار کو امداد باہمی اور قومی ہمدردی کا نہایت خوبصورت عنوان دے دیا، تاکہ پوری قوم کو دھوکے میں رکھ کر ان کا استحصال آسانی کے ساتھ دیر تک کیا جاسکے۔

### بیع و فاء کی بحث:

بیمہ کے جواز کی دوسری دلیل بیع و فاء پر قیاس ہے کہ جس طرح بیع بالوفا کو باوجود دے کے سود کی آمیزش موجود تھی، اسے علماء نے لوگوں کی ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا، اسی طرح انشورس کاروبار کو بھی موجودہ حالات کی نزاکتوں کی بنا پر جائز قرار دیا جانا چاہئے۔

لیکن اس بیع پر ”بیمہ“ کو قیاس کرنا حیرت انگیز ہے، اس لئے اولاً ہمیں بیع بالوفا کی صورت کو سمجھنا پڑے گا، جس سے اندازہ ہوگا کہ وہ کن حالات اور کن خطوط پر مبنی ہے، کتب فقہ میں اس کی صورت یہ لکھی گئی ہے کہ مثلاً ایک شخص دوسرے شخص سے کہے کہ میں نے تم سے یہ مکان فروخت کر دیا بہ شرطیکہ جب میں تم کو قیمت ادا کر دوں تو تمہیں یہ مکان واپس کرنا ہوگا اور یہ پورا معاملہ مع شرائط دستاویزی شکل میں محفوظ کر لیا جاتا تھا، یہ بیع خواہ مخواہ نہیں شروع ہوگی تھی، بلکہ مجبوریوں کی بنا پر، مقروض اور غریب انسان کی جانب سے کچھ نرمی اور مہلت کی درخواست کے طور پر یہ بیع کی جاتی تھی تاکہ قرض کی ادائیگی کے لئے جس پر تشدد تقاضے کا بار بار مظاہرہ ہو رہا ہے اس میں کچھ کمی پیدا ہو جائے، مقروض کہتا تھا کہ تمہارا مجھ پر جو قرض ہے اس کے عوض میں اپنا مکان تمہارے ہاتھ فروخت کرتا ہوں بشرطیکہ جب میں تمہارا قرض چکا دوں، جس کے عوض میں نے یہ مکان تمہارے ہاتھ بیچا ہے تو تمہیں یہ مکان واپس کرنا ہوگا، جیسا کہ ”محیط“ کے حوالے سے علامہ شامی نے نقل کیا ہے۔

”وہو أن يقول البائع للمشتري بعث منك هذا العين بمالك علي من الدين علي اني متي قضيته فھولي“ (رد المحتار ۲/۵۶۷)۔

(اس کی صورت یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ میں نے تمہارے ہاتھ یہ سامان اس قرض کے عوض بیچا جو تمہارا میرے ذمہ ہے، اس شرط پر کہ جب میں تم کو وہ قرض چکا دوں تو وہ سامان مجھے مل جائے گا)۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک طرح کی بیع ہی تھی، جس میں مبادلۃ المال بالمال پایا جا رہا ہے۔ اب رہا اس میں واپسی کی شرط لگانا۔ تو اگرچہ ضابطے کے مطابق اس کو فاسد ہو جانا چاہئے، لیکن ایک بڑے نقصان کا دروازہ بند کرنے کے لئے یہ چھوٹا سا نقصان گوارا کرنا پڑے گا، اگر اس بیع کو ناجائز قرار دیا جائے تو پھر دائن مدیون کے گلے چڑھ جائے گا، اور اس سے اپنے قرض کی وصولی کی خاطر یا تو ظلم شروع کر دے گا یا سود کے نام پر تاخیر کا ٹیکس باندھ دے گا،

اس لئے سود سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اس بیع کی اجازت دینی ہوگی۔ جیسا کہ علامہ شامی لکھتے ہیں:

”وبعض الفقهاء يسميه البيع الجائز ولعله مبني على أنه بيع صحيح

لحاجة التخلص من الربا حتى يسوغ المشتري أكل ربه“ (رد المحتار ۵/۲۷۶)۔

بعض فقہاء نے اس بیع کا نام بیع جائز رکھا ہے اور شاید یہ اس لئے کہ یہ بیع سود سے خلاصی کی حاجت کی بنا پر صحیح قرار دی گئی ہے تاکہ مشتری اس کے نفع سے بہرہ ور ہو سکے۔

۲- اور اس کے علاوہ اس بیع کے نام فقہاء نے شمار کرائے ہیں، ان سب میں بیع کا نام قدر مشترک ہے، مشہور نام جو بخارا میں رائج تھا، وہ بیع وفا کا ہے۔ مصر میں اس بیع کو بیع امانت کہا جاتا تھا، اور شام میں بیع اطاعت اور بعض مقامات پر بیع منتفع بہ، البتہ شافعیہ، صاحب رازم الفتاویٰ اور امام حسن ماتریدی کے نزدیک یہ بیع نہیں بلکہ رہن ہے، علامہ زلیعی اور صاحب ”نہر“ کے نزدیک یہ بیع ناقص کے ضمن میں آتا ہے، یعنی بعض احکام میں یہ بیع کا فائدہ دیتا ہے مگر بعض میں نہیں، مثلاً اس بیع کے بعد اس سے انتفاع تو مشتری کے لئے جائز ہے، مگر شرط مقررہ کے مطابق اس کو واپس کرنا ہوگا، اس کو مشتری کسی دوسرے آدمی سے فروخت نہیں کر سکتا۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ اگر لفظ بیع کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے تو پھر یہ رہن نہیں ہوگا، پھر ان لوگوں نے یہ تفصیل بھی کی ہے کہ بیع کے فسخ کرنے یا اس کو غیر لازم سمجھنے کی شرط اگر بوقت عقد یا عقد سے قبل لگائی گئی، تو یہ بیع فاسد ہوگی، اور اگر عقد مکمل ہونے کے بعد لگائی گئی تو بیع صحیح ہوگی، اور اس شرط کو پورا کرنا لازم ہوگا، اس لئے کہ بعض وعدے ایسے ہوتے ہیں، جو لوگوں کی عمومی مجبوریوں کی بنا پر لازم ہو جاتے ہیں (رد المحتار ۵/۲۷۷)۔

یہ تمام تفصیلات اس لئے میں ذکر کر رہا ہوں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ بیع وفا بیع ہے، چاہے عنوان جو بھی ہو، بیع کے ارکان اس میں پائے جا رہے ہیں اور اسی بنا پر لوگوں کی حاجت کے پیش نظر اس کی بعض خرابیوں کو نظر انداز کر دیا گیا، جبکہ بیمہ کا کاروبار بیع نہیں ہے، اور قیاس



کے لئے وجہ اشتراک ہونا ضروری ہے، اس کے بعد کیا گنجائش رہ جاتی ہے کہ اس کو انشورنس پر قیاس کیا جائے، جو کہ سراسر سود، قمار اور ظلم کا مجموعہ ہے۔ جس کی بنیاد سرمایہ داری اور غریبوں کے استحصال پر ہے، اس کو بیچ و فاسے کیا مناسبت ہو سکتی ہے جس کی بنیاد سود سے خلاصی اور لوگوں کی ضرورتوں کے حل پر ہے۔

### کفالت کی بحث:

انشورنس کے مجوزین تیسری بات یہ کہتے ہیں کہ انشورنس باب الكفالة کے تحت آتا ہے، اس لئے کہ انشورنس کمپنی یہ ذمہ داری قبول کرتی ہے کہ کسی جانی یا مالی حادثہ پیش آجانے کی صورت میں جمع شدہ رقم پر اضافہ کر کے پورے نقصان کی وہ تلافی کر دے گا، جس طرح کہ کوئی کفیل کسی کی جان یا مال کا ضامن ہوتا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ یہ کفیل ایک فرد ہے اور وہ ادارہ ہے، فرد ایک یا دو آدمی کی کفالت کا بوجھ اٹھا سکتا ہے، مگر ادارہ اپنے ہر اس ممبر کی کفالت کا بوجھ اٹھا سکتا ہے جو اس کے مشن میں تھوڑا بہت تعاون کر کے اس کا شریک ہو جاتا ہے۔

ہمارے مجوزین کی یہ ایک نہایت خوب صورت دلیل ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ کفالت کے ذیل میں بھی نہیں آ سکتا ہے، اس لئے کہ کفالت کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مکفول عنہ، یعنی جس کی جانب سے کسی کے لئے کفالت لی گئی ہے وہ معلوم ہو، مثلاً کسی کا کسی آدمی پر دس ہزار روپے قرض تھا اور مقروض وقت مقررہ پر قرض نہیں ادا کر سکا، تو دائن اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کا حق رکھتا ہے، مگر کوئی تیسرا آدمی دائن کو کسی قسم کی کارروائی سے باز رکھ کر ایک خاص وقت مقررہ تک کے لئے اس کی ضمانت قبول کر لے کہ فلاں مہینے کی فلاں تاریخ تک یہ شخص تمہیں قرض ادا کرے گا، ورنہ اس کا ذمہ دار میں ہوں گا، یہ ”کفالت بالمال“ ہے، بالذات کا بھی یہی مسئلہ ہے، کفالت خواہ مالی ہو یا جانی بہر دو صورت مکفول عنہ، یعنی جس پر اصل حق ضمان یا حق دیت واجب ہوتا ہے، اس کا معلوم ہونا ضروری ہے، مجہول کی جانب سے کفالت صحیح

نہیں ہے، اور اس سلسلے میں فقہاء کی صاف تصریحات موجود ہیں، چنانچہ فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

”اور اگر کہا کہ لوگوں میں سے جو بھی تم کو قتل کر دے یا غصب کر لے یا زخمی کرے یا خرید و فروخت کا معاملہ کرے تو میں کفیل ہوں، تو یہ عقد کفالت جائز نہیں ہے، اس لئے نہیں کہ شرط پر معلق کیا گیا ہے، بلکہ اس لئے کہ مضمون عنہ مجہول ہے۔ جبکہ مضمون عنہ کا مجہول ہونا کفالت کے صحیح ہونے کے لئے مانع ہے (عالمگیری ۳۲/۵)۔“

اور بیمہ کمپنی جن لوگوں کی جانب سے ضمانت لیتی ہے وہ مجہول ہیں، حادثہ کسی بس یا موٹر سے ہوا، گھر یا دکان میں آگ اجنبی اور مجہول لوگوں نے لگائی، اور ان نقصانات کی تلافی کرنے کے لئے بیمہ کمپنی آگے بڑھی، مگر اسے خود پتہ نہیں ہے کہ میں کن لوگوں کی جانب سے یہ ضمانت ادا کر رہی ہوں اور نہ مکان و دکان والے کو یہ علم ہے کہ ہمارا اصل حق ضمانت کن ظالموں پر عائد ہوتا ہے، پھر اس وقت جبکہ مکفول عنہ، کفیل اور مکفول لہ دونوں کے لئے مجہول ہیں، یہ عقد کفالت کیوں صحیح ہوگی؟ اور اس بنیاد پر انشورنس کیسے صحیح قرار پا جائے گا؟۔

#### ودیعت باجر کا مسئلہ:

جواز کے قائلین کی چوتھی دلیل یہ ہے کہ وہ انشورنس کو ودیعت باجر کے مسئلے پر قیاس کرتے ہیں کہ ”کتاب الودیعتہ“ میں یہ جزئیہ موجود ہے کہ مودع، یعنی جس کے پاس امانت رکھی جائے، وہ اگر امانت کی حفاظت پر اجرت وصول کرے تو امانت ہلاک ہو جانے کی صورت میں امین ضامن ہوگا اور اس امانت کا ضمانت صاحب مال کو ادا کرنا ہوگا، اسی طرح جب سامان کا بیمہ کرایا گیا اور اس کی بیمہ کمپنی نے اجرت وصول کی تو سامان کے ضائع ہو جانے کی صورت میں بیمہ کمپنی کو ضمانت دینا ہوگا۔

۱- اس قیاس کی تردید علامہ شامی نے کر دی ہے، علامہ شامی نے اولاً یہ فتویٰ دیا ہے کہ بیمہ کرانا صحیح نہیں ہے اور مال ضائع ہو جانے کی صورت میں اس کا ضمانت لینا جائز نہیں ہے، علامہ شامی کے زمانے میں بھی بیمہ کارواج ہو چکا تھا، مگر وہ بیمہ دوسرے انداز کا تھا، وہ سود اور قمار سے

پاک تھا، اس کی صورت یہ تھی کہ مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر لینے کے لئے پانی جہاز کرایہ پر لیتے تھے، لیکن راستے کے خطرے کی بنا پر بیمہ کمپنی ”سوکرہ“ کے نام پر ضمان کی اجرت وصول کرتی تھی کہ راستے میں جہاز ڈوب جائے یا جل جائے تو ضائع شدہ مال کا ضمان میں دوں گی، علامہ شامی فرماتے ہیں کہ مال ضائع ہو جانے کے بعد بیمہ کمپنی سے اس کے بدل کا مطالبہ کرنا جائز نہیں ہے، اور اس کو ”ودیعتہ باجر“ پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ وديعت باجر میں مال امین کی تحویل میں ہوتا ہے جبکہ یہاں مال یا دکان اور مکان بیمہ کمپنی کی تحویل میں نہیں ہے، بلکہ جہاز والے کی تحویل میں ہے، اس لئے ”ودیعت باجر“ سے یہ جداگانہ معاملہ ہے۔

۲- اور اگر فرض کرو کہ جہاز بھی بیمہ کمپنی کا ہے تو پھر بیمہ کمپنی اجیر مشترک ہو جائے گی جس نے ایک حفاظت کی اجرت اور دوسرے بار برداری کی اجرت وصول کی ہے، اور اجیر مشترک کے بارے میں یہ مسئلہ ہے کہ وہ ان نقصانات کا ضامن ہوتا ہے جن سے بچنا اس کے اختیار میں نہ ہو، مثلاً جہاز کا ڈوب جانا، جل جانا وغیرہ، غرض دونوں صورتوں میں بیمہ کمپنی سے اس چیز کا بدل وصول کرنا علامہ شامی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

علامہ شامی فرماتے ہیں:

”میرے نزدیک صاف بات یہ ہے کہ تاجر کے لئے ہلاک شدہ مال کا عوض لینا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ التزام مالا یلزم ہے، اگر تم کہو کہ جب امانت قبول کرنے والا امانت کی حفاظت کی اجرت لے تو امانت ضائع ہو جانے کی صورت میں وہ ضامن ہوتا ہے، تو میں کہتا ہوں کہ بیمہ کا مسئلہ وديعتہ باجر کی قبیل کا نہیں ہے، اس لئے کہ بیمہ کمپنی کی تحویل میں نہیں ہے، بلکہ جہاز والے کے قبضے میں ہے اور اگر جہاز کمپنی ہی کا ہو تو وہ کمپنی کا مالک اجیر مشترک قرار پائے گا، جس نے حفاظت اور بار برداری کی جداگانہ اجرت لی ہے اور امین اور اجیر مشترک کوئی بھی ان خطرات کا ضامن ہوتا جن سے بچنا اس کے اختیار میں نہیں ہے، جیسے موت اور غرق وغیرہ“

(رد المحتار ۱۷۰۴/۱)۔

پہلے زمانہ کے بارے میں تو اس قیاس کے متعلق تھوڑا سوچا بھی جاسکتا تھا، لیکن ہمارے زمانے میں جس بیمہ کارواج ہے اس میں سود، قمار اور قانونی ظلم جو ہے وہ تو ہے ہی، اس کے علاوہ اس کو ”ودیعتہ باحر“ پر قیاس کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لئے کہ دکان، مکان، ذاتی فنڈ یا انسان کی زندگی کی کوئی بھی چیز بیمہ کمپنی کے قبضے میں نہیں ہوتی اور نہ بیمہ کمپنی ان چیزوں کی حفاظت کی ذمہ داری لیتی ہے اور نہ کوئی حفاظتی انتظامات کرتی ہے، اس لئے اس کو ودیعتہ باجر کے مسئلے پر قیاس کرنا، قیاس مع الفارق ہے۔

### ضمان خطر الطریق کا مسئلہ:

مجوزین کے پاس پانچویں دلیل یہ ہے کہ انشورنس کو ضمان خطر الطریق کے مسئلے پر قیاس کیا جائے، صورت مسئلہ یہ ہے، جیسا کہ علامہ شامی نے ”باب کفالة المرجلین“ میں بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص سے کہا کہ اس راستے پر سفر کرو، راستہ قابل اطمینان ہے، اس شخص نے سفر کیا اور راستے میں اس کا مال لوٹ لیا گیا تو اطمینان دلانے والا شخص ضامن نہیں ہوگا، اور اگر اس نے یوں کہا کہ راستے میں اگر کوئی خطرہ پیش آیا اور مال ضائع ہوا تو اس کا ضامن میں ہوں، اس وقت مال ضائع ہو جانے کی صورت میں وہ ضامن ہوگا۔ دونوں مسئلوں میں فرق کی وجہ صاحب دّر مختار نے یہ بیان کی ہے کہ دوسری صورت میں اطمینان دلانے والے شخص نے دھوکہ اور غرر کا معاملہ کیا ہے، اس طور پر کہ اس نے سلامتی کی ضمانت لے لی، اور کہا کہ اگر مال محفوظ نہ رہا تو میں ضامن ہوں گا، بخلاف پہلی صورت کے کہ اس نے صرف اطمینان دلا یا ہے، سلامتی کی ضمانت نہیں لی ہے، اس لئے دھوکہ دینے والا نہیں قرار دیا جائے گا۔

مجوزین کہتے ہیں کہ بیمہ کا معاملہ بھی اسی قسم کا ہے کہ وہ کمپنی ان حادثات کی ضمانت لیتی ہے جو زندگی کے میدان میں انسان کو پیش آسکتے ہیں، لیکن علامہ شامی اس قیاس کی سختی کے ساتھ مخالفت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ”خطر الطریق“ کے دونوں مسئلوں میں سب سے بڑی بنیاد غرر

ہے، اور غرر کے بارے میں ”جامع الفصولین“ میں قاعدہ کلیہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ فریب خوردہ شخص فریب دینے والے سے ضمان اس وقت وصول کر سکتا ہے جبکہ یہ غرر اور فریب عقد معاوضہ کے ضمن میں دیا گیا ہو، یا دھوکہ دینے والا شخص فریب خوردہ شخص کے لئے سلامتی کی ضمانت لی ہو، یہی دو صورتیں ہیں جن میں غرر دینے والا ضامن ہوتا ہے، دوسری صورت کی مثال تو وہی ہے جو خطر طریق کی صورت مسئلہ ہے۔ اور پہلی صورت کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص کسی چکی والے کے پاس گےہوں لے کر آٹا پسانے کے لئے آیا، چکی والے نے ایک برتن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گےہوں والے سے کہا کہ اس میں ڈال دو، جبکہ اس برتن میں سوراخ تھا اور چکی والے کو اس کا علم بھی تھا، مگر گےہوں والا بے خبر تھا، اس طرح گےہوں سب ضائع ہو گئے، تو چکی والا اس کا ضامن ہوگا، کیونکہ یہ دھوکہ عقد اجارہ کے ضمن میں پایا گیا۔ اس قاعدہ کلیہ کے سمجھنے کے بعد کوئی وجہ نہیں ہے کہ بیمہ کو اس پر قیاس کیا جائے۔ اس لئے کہ بیمہ کمپنی کا مقصد کسی کو دھوکہ دینا نہیں ہوتا، اور نہ ان کو حادثات کے ہونے کا علم ہوتا ہے، یہ تو ایک کاروبار ہے جو زیادہ سے زیادہ نفع کی امیدوں پر قائم ہے، رہا حادثہ کا خطرہ تو یہ ہر ایک کو ہے، بیمہ کمپنی والے کو جس طرح یہ خطرہ ہے اسی طرح یہ خطرہ بیمہ کمپنی کے ممبروں کو بھی ہے، اور اگر یہ خطرہ نہ ہوتا تو بیمہ کرانے کی ضرورت ہی کیا تھی، اگر حادثات کا بالکل ہی وقوع نہیں ہوتا، تو بیمہ کمپنی کا قیام عمل میں آتا اور نہ کوئی اس جانب توجہ کرتا (ردالمحتار، باب المستامن ۱۷۰/۴)۔

تو جب بیمہ کمپنی کی جانب سے غرر کا تحقق نہیں ہو رہا ہے اور نہ بیمہ کمپنی صفت سلامتی کی ضمانت لیتی ہے کہ آپ کو کبھی بھی کوئی حادثہ پیش نہیں آئے گا اور نہ موت آپ کو دبوچے گی اور نہ اس طرح کی ضمانت کوئی لے سکتا ہے تو آخر بیمہ کمپنی سے ضمان وصول کرنے کے کیا معنی ہیں؟ اور کس ضابطے کے تحت اس کو حادثات کا ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے؟ اگر نہیں قرار دیا جاسکتا تو ضمان خطر طریق پر اس کو قیاس کرنا بھی غلط ٹھہرتا ہے، کیونکہ بنیاد ضمان ہی ہے اور بنیاد کے اکھڑ جانے کے بعد عمارت کب برقرار رہ سکتی ہے؟۔

### بیمہ پر مصالحو کا اثر:

بیمہ کے مجوزین کبھی مصالحو کی بات بھی شروع کر دیتے ہیں کہ بیمہ اگر چہ کسی جائز اصول کے تحت نہیں آتا، لیکن بہت ساری مصلحتیں اس سے وابستہ ہیں، اس لئے ان مصالحو کی بنا پر اس کی اجازت ملنی چاہئے کیونکہ اسلام میں مصالحو کا اعتبار کیا گیا ہے اور مصلحتوں کی بنا پر بہت سی چیزیں گوارا کر لی جاتی ہیں، لیکن مصالحو کی بات بھی ان کے حق میں مفید نہیں ہے، کیونکہ تمام مصالحو یکساں حیثیت نہیں رکھتے اور ہر مصلحت کی بنیاد پر ہمیں قانون میں ترمیم کا حق حاصل نہیں ہے، بلکہ جن مصالحو کی بنا پر شریعت لوگوں کی رعایت کرتی ہے، اس کے لئے کچھ اصول مقرر کئے گئے ہیں جن کو علماء اور فقہاء نے بڑے شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے، مثال کے طور پر ایک علامہ شاطبی ہی کو لے لیجئے! ان کی کتاب ”الاعتصام“ اور دوسری کتاب ”الموافقات“ اٹھا کر دیکھ لیجئے، ان میں بڑی تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر بحث کی گئی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جن مصالحو کی بنا پر شریعت کچھ نرمی اور لچک پیدا کرتی ہے اور رخصت دیتی ہے، اس کے لئے بنیادی طور پر تین اہم شرطیں ہیں۔

۱- پہلی شرط تو یہ ہے کہ مصالحو کے پیش نظر جو قانون بنایا جائے وہ شریعت کی روح اور مقاصد کے خلاف نہ ہو۔

۲- دوسری شرط یہ ہے کہ جب وہ قانون بنا کر لوگوں کی عدالت میں پیش کیا جائے تو عام عقلمیں اسے قبول کر لیں۔

۳- تیسری شرط یہ ہے کہ وہ قانون کسی واقعی اور حقیقی ضرورت کی تکمیل کے لئے بنایا گیا ہو، حیلے کے طور پر استعمال نہ کیا گیا ہو۔

بیمہ کمپنی میں ان تین شرطوں میں سے کوئی شرط موجود نہیں ہے، بیمہ کمپنی سود اور قمار پر قائم ہے جو اسلام میں قطعاً حرام ہیں، مسلمان ذہن اس کو قبول کرنے کے لئے کبھی بھی تیار نہیں ہو سکتا ہے، چاہے وہ اذہان اسے قبول کر لیں جو یورپ کے صنعتی انقلاب اور جدید تمدن سے متاثر

ہیں، اور یہ محض سودی کاروبار کو فروغ دینے کے لئے اور ذاتی نقصانات کو پوری قوم کے سر ڈالنے کے لئے ایک حیلے کے طور پر قائم کیا گیا ہے، نہ کہ کسی واقعی ضرورت کی تکمیل کے لئے، پھر بیمہ کو آخر کن مصالح کی بنا پر جائز قرار دیا جائے؟

### خزانہ حکومت میں رعیت کا حق:

جواز کی آخری مضبوط ترین دلیل یہ ہے کہ تمام چیزوں سے قطع نظر کمپنی اگر حکومت کے ہاتھ میں ہے تو اس کی ممبری اور اس سے ضمان وصول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، کیوں حکومت کے خزانے میں رعیت کے ہر فرد کا حق ہوتا ہے، اس طرح بیمہ کمپنی سے بونس کے نام پر جو رقم ملتی ہے وہ عطیہ حکومت قرار پا کر سود کے حدود سے خارج ہو جاتی ہے۔

یہ آخری دلیل بھی انشورنس کے خلاف ہی جاتی نظر آرہی ہے، اس لئے کہ اولاً یہی غور طلب ہے کہ حکومت کے خزانے میں رعیت کے ہر فرد کا حق ہونے کا مطلب کیا ہے، اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ رعیت کے ہر فرد کا حق خزانہ حکومت سے متعلق ہے تو بھی سوال یہ سامنے آجاتا ہے کہ کیا حق ملک کی بنا پر سود کے دائرے سے کوئی سودی معاملہ خارج ہو سکتا ہے؟ غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ کتب فقہ میں یہ چیز نہ لکھا ہوا ہے کہ ملک کی صورت میں سود کا اطلاق نہیں ہوگا، اگرچہ بظاہر سود معلوم ہو، مثلاً شرعی غلام (بشرطیکہ مازون التجارۃ یا مکاتب نہ ہو) اور آقا آپس میں سودی معاملہ کریں تو اسے سود نہیں کہا جاسکتا ہے، کیوں دونوں مال جو بظاہر دو جگہوں میں پائے جارہے ہیں ایک ہی شخص کی ملک ہیں، غلام کے پاس اپنا کوئی مال نہیں ہے، اس کے پاس جو کچھ ہے وہ آقا ہی کا ہے، اس لئے ملک ہونے کے بعد سود کا تحقق نہیں ہوگا، اگرچہ صورتاً سود نظر آ رہا ہے، یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص اپنے مال کو مختلف مدوں میں تقسیم کر کے الگ الگ رکھ لے اور پھر ایک مد کے لئے دوسرے مد سے قرض لیتے وقت سودی لگان لگا دے، تو اسے سود نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ دونوں مال پر ایک ہی شخص کی ملک قائم ہے (بدائع الصنائع ۱۹۲/۵، عنایہ مع الفتح ۵/۸،

ان تفصیلات کے بعد اس کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے کہ ملک اور حق ملک دونوں کو ایک ہی پلڑے میں رکھ کر تول دیا جائے اور دونوں کے احکام بلا امتیاز ایک دوسرے پر لگا دیئے جائیں۔

### ب۔ تفصیلات کی روشنی میں اجمالی جوابات:

۱۔ انشورنس کمپنی منافع کے عنوان سے جو کچھ دیتی ہے وہ بلاشبہ سود ہی ہے، اس لئے کہ نام بدل دینے سے حقیقت تبدیل نہیں ہو جاتی، اعتبار معانی کا ہے نہ کہ الفاظ کا، جیسا کہ اس کی تحقیق پیچھے گزر چکی ہے۔

۲۔ مصالحوں کی بنا پر ربوا اور قمار کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے، اس لئے کہ پیچھے گزر چکا ہے کہ کن مصالحوں کا شریعت میں اعتبار ہے اور مصالحوں کے قابل لحاظ ہونے کے لئے کیا شرطیں ہیں؟ منجملہ ان شرائط میں سے ایک یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ جو مصالحوں ایسے اسباب سے مستفاد ہوں جو مشروع اور جائز ہیں وہی صرف قابل اعتبار ہیں، اسباب غیر مشروع سے حاصل شدہ مصالحوں کا شریعت کی نگاہ میں کوئی اعتبار نہیں ہے (الموافقات ۱/۲۴۳)۔

۳۔ زندگی کا بیمہ، املاک کا بیمہ اور ذمہ داری کا بیمہ تینوں میں ربوا اور قمار کا عنصر موجود ہے۔ اس لئے یہ تینوں حکم کے اعتبار سے برابر ہیں۔

۴۔ یہ بلاشبہ قمار ہے، اس لئے کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ قمار نام ہے معاملہ کو کسی خطر پر معلق کرنے کا اور بیمہ میں وہ صورت موجود ہے۔

۵۔ جن مصالحوں کی بنا پر قانون میں ترمیم ہو سکتی ہے وہ مصالحوں یہاں پر موجود نہیں ہیں، اور نہ ان کی شرطیں یہاں پائی جاتی ہیں، اس لئے بیمہ کو ان مصالحوں کی بنا پر حلال قرار نہیں دیا جاسکتا جو اس میں موجود ہیں، مصالحوں کی تفصیلات بھی پیچھے گزر چکی ہیں، مگر یہ کہ کوئی مسلمان ایسی جگہ پر ہو



جہاں بغیر بیمہ کرائے جان و مال کی حفاظت ہی نہ ہو سکتی ہو تو بیمہ کرانا درست ہے، اس لئے کہ جان و مال کی حفاظت کے لئے شریعت اتنی اجازت دیتی ہے۔

۶- اگر بیمہ دار (خواہ اس نے کسی بھی قسم کا بیمہ کرایا ہو) اگر وہ سود نہ لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اس میں سود کا تعاون سبب بعید کے طور پر اگر چہ کر رہا ہے، جس کی بنا پر ہمارے بعض بزرگوں نے اسے حرام سے اتار کر مکروہ تنزیہی قرار دیا ہے، لیکن میری رائے میں ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے حالات و مصالحوں کے اعتبار سے اس میں کوئی کراہت نہیں ہے، اگر وہ سود کمپنی میں نہ چھوڑے تو زیادہ اچھا ہے، بلکہ وہ سود لے کر مسلمان غرباء میں بلائیتِ ثواب تقسیم کر دے، تو اس میں مسلمان مساکین کا فائدہ ہو جائے، بیمہ میں ساری خرابی سود اور قمار کی ہے، لیکن اگر صرف اپنی رقم سے اس کو مطلب ہو اور زائد رقم سے اس کو کوئی مطلب نہ ہو، اس لئے کہ وہ رقم فقیروں میں جانے والی ہو تو بلاشبہ مصالحوں کے تقاضے سے اسے جائز قرار دینا چاہئے، اس لئے کہ اس وقت یہ کمپنی ایک طرح کا بینک قرار پائے گی، جس میں انسان اپنا روپیہ حفاظت کے لئے رکھتا ہے، جس کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہے، بشرطیکہ سود سے پاک ہو۔

۷- بیمہ کمپنی اصل رقم سے زائد جو رقم دیتی ہے وہ سود ہی ہے، اسے اعانت و امداد اور تبرع و احسان قرار دینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لئے کہ بیمہ کمپنی کے طریق کار اور اس کے شرکاء کے معاملات سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس پر تفصیلی گفتگو پہلے ہو چکی ہے۔

۸- اس صورت میں جبکہ بیمہ کاروبار نجی کمپنیاں کر رہی ہوں اور اس صورت میں جبکہ یہ خود حکومت کر رہی ہو، کوئی فرق نہیں ہے، اس لئے کہ ربو اور قمار دونوں صورتوں میں موجود ہیں۔ البتہ جس علاقہ میں حکومت حادثات کے پیش آجانے کے بعد اتنی دلچسپی نہیں لیتی ہو جتنی لینا چاہئے، جبکہ وہاں حادثات پیش آتے رہتے ہوں، تو وہاں اس بونس کی رقم اس بیمہ کمپنی سے جو خود حکومت چلا رہی ہے یہ سمجھ کر لینا صحیح ہے کہ ان حادثات کے وقت حکومت جس ذمہ داری کو ادا نہیں کر رہی ہے اور میرا مطلوبہ حق جو نہیں دے رہی ہے اس ذریعہ سے میں نے اپنا حق وصول

کر لیا ہے۔ جس طرح کہ کسی انسان کا کسی پہ قرض ہے اور مقروض وقت پورا ہونے کے بعد بھی قرض ادا نہیں کر رہا ہے، ٹال مٹول کر رہا ہے، جبکہ وہ مالدار ہے اور قرض ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس وقت کسی صورت سے دائن اپنا قرض وصول کر لے، مثلاً اس کا کوئی مال چھین لے، چھیننے کی طاقت نہ رکھنے کے وقت اس کا اتنا مال چوری کر لے جتنے سے اس کا قرض ادا ہو سکتا ہے، تو اس کی گنجائش ہے اور وہ حاصل کردہ مال اس کے حق میں حلال ہے۔

اسی طرح وہ واقعہ کہ حضرت ابوسفیان کی بیوی حضرت ہندہ نے حضرت رسول اکرم ﷺ سے یہ شکایت کی کہ وہ انکو نفقہ پورا نہیں دیتے، وہ بخیل آدمی ہیں، تو کیا میں ان کے مال سے بغیر پوچھے ہوئے لے سکتی ہوں، اس پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اپنے بچوں کے نفقہ کے بقدر تم اس کے مال سے لے سکتی ہو۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:

” عن عائشة قالت: إن هنداً بنت عتبة قالت: يا رسول الله إن أبا

سفيان رجل شحيح وليس يعطيني ما يكفيني وولدي إلا ما أخذت منه وهو لا يعلم فقال خذي ما يكفيك وولدك بالمعروف. متفق عليه“ (تواعد الفقہ لفتی مکہ)۔  
ان جزئیات سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ اگر حکومت حق تلفی کر رہی ہو اور حادثات کی تلافی نہیں کر رہی ہو، جبکہ غیر مسلموں کے حادثات میں وہ پورا تعاون کرتی ہو، اس وقت مسلمانوں کے لئے یہ گنجائش ملنی چاہئے کہ حکومت کا مال کسی بھی عنوان سے حاصل کر لیں جس سے وہ اپنا حق وصول کر سکیں، خصوصاً اس وقت جبکہ حکومت کی رضامندی سے وہ مال حاصل ہو، جب حق دار اپنا حق بغیر اجازت و رضامندی کے حاصل کر سکتا ہے، تو جب رضامندی کی صورت سے اگر وہ مال مل جائے، تو اس کے جائز اور حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

اس لئے میری رائے میں اگر بیمہ کمپنی خود حکومت چلا رہی ہے تو ان شہروں کے مسلمانوں کے لئے جہاں حادثات ہوتے ہیں اور ان کو امداد نہیں ملتی ہے، بیمہ کمپنی سے بونس کے نام پر جو رقم ملتی ہے وہ لینا جائز ہے۔

۹- خزانہ حکومت میں محض حق کی بنا پر سود کی حرمت سے نہیں بچ سکتا، پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ حق ملک اور ملک میں فرق ہے، ملک ہونے کی صورت میں سود نہیں ہوگا، لیکن محض حق ملک سے سود ختم نہیں ہو جائے گا، بلکہ وہاں سود جاری ہوگا، البتہ وہی صورت ہے کہ حکومت کی جانب سے دو نظری سلوک ہونے کے وقت اس کو اپنا لازمی حق سمجھ کر وصول کرنا صحیح ہوگا، یہ نہیں کہ حق ہونے کی بنا پر یہ سودی کاروبار جائز ہے، ورنہ یہ ہر جگہ جائز ہوتا، لیکن ہم اس کو عام نہیں کرتے، بلکہ ظلم اور حق تلفی کی شرط کے ساتھ مشروط کرتے ہیں۔

۱۰- الف: اور اگر بیمہ کاروبار حکومت کے ہاتھ میں ہے، ایک شخص بیمہ پالیسی خریدتا ہے اور میعاد معین کے بعد اصل مع سود کے وصول کرتا ہے، لیکن سود کی پوری رقم ٹیکس، یا چندہ کی صورت میں حکومت کو واپس کر دیتا ہے اور اپنی جائز رقم محفوظ کر لیتا ہے تو جائز ہے، اس لئے کہ حکومت نے ایسے بے جائیکس لگا رکھے ہیں، اگر ان تمام ٹیکسوں کو واقعہً ادا کیا جائے تو کوئی کاروبار ہی نہ چل سکے، اس لئے اس مجبوری میں وہ سود کی رقم حکومت کو دے کر اپنی جائز آمدنی بچا سکتا ہے۔

ب: یا ان کاموں میں لگا دیتا ہے جو حکومت کی ذمہ داری ہے، مگر حکومت تساہلی برت رہی ہے، تو یہ بھی جائز ہے، مثلاً رفاہ عام کا کوئی کام کر دینا، پل یا راستہ بنادینا، کنواں کھودو ادینا، کسی تعلیمی ادارے کو بطور امداد وہ رقم دے دینا وغیرہ، یہ سب حکومت کی ذمہ داری ہے، لیکن اگر حکومت نہیں کر رہی ہے تو حکومت ہی کے پیسے سے پبلک کے ان حقوق کی ادائیگی کی جائے گی، جن حقوق کی ادائیگی میں وہ سستی کر رہی ہے یا مجبور ہے۔ گویا حق داروں کے لئے ایک شخص نے حکومت سے حق وصول کر کے حق داروں تک پہنچا دیا۔ یہ بھی وہی صورت ہے جو نمبر ۹ کے تحت میں عرض کر چکا ہوں۔

ج: البتہ اس کے لئے حقوق لازمہ حقوق عادیہ ہونا ضروری ہے، ورنہ وہ کام جو حقوق حکومت کے تحت نہیں آتے اس میں چونکہ حق کی وصولی کی علت پیدا نہیں ہوگی، اس لئے ان مصارف میں خرچ کرنے کے لئے حکومت سے بیمہ خریدنا صحیح نہیں ہوگا، مثلاً کتب خانہ کھولنا،

نائٹ سینٹر کا قیام وغیرہ جو لوازمات حکومت و انتظام میں سے نہیں ہیں۔

۱۱- بیمہ کمپنی سے جو زائد رقم بونس کے نام پر ملتی ہے وہ سراسر سود ہے اس کو ثواب کی نیت سے صدقہ کرنا بھی جائز نہیں ہے، چہ جائیکہ باقاعدہ بیمہ کا خریدار ہی اسی لئے بنا جائے کہ اس سے رقم لے کر فقراء و مساکین کی امداد و تعاون کے ذریعہ ثواب حاصل کریں گے، کسی مالِ خبیث سے ثواب حاصل نہیں ہوتا اور اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ مالِ خبیث کو صدقہ کر کے ثواب ملتا ہے تو بھی اس کے لئے فعلِ خبیث کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے، اس لئے کہ فقہ کا یہ مشہور اصول ہے:

” دفع المضرة أولى من جلب المنفعة“ (تواعد الفقہ)۔

کہ جلبِ منفعت سے دفعِ مضرت مقدم ہے۔

” درأ المفسد أولى من جلب المصالح، فإذا تعارضت مفسدة

ومصلحة قدم دفع المفسدة غالباً“ (الاشاہ والنظار ۱/۲۹۰)۔

مفسد کو دور کرنا مصالح کے حاصل کرنے سے بہتر ہے، اس لئے کہ جس مفسدہ اور

مصلحت کا تعارض ہو جائے تو مفسدہ عموماً مقدم ہوتا ہے۔

اس لئے یہاں پر اگر حصولِ ثواب فرض بھی کر لیا جائے تو بھی اس کے لئے ارتکابِ

حرام کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔

۳- صحیح اسلامی بیمہ:

لیکن اس جگہ یہ سوال بجا طور پر اٹھتا ہے کہ جب مروجہ بیمہ جائز نہیں ہے تو موجودہ مصالح اور حالات کے پیش نظر ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے اس کا بدل کیا ہونا چاہئے؟ کیا مسلمانوں کو بالکل بے سہارا چھوڑ دیا جائے، اور ان کو جو کچھ تھوڑا بہت تعاون مل جاتا ہے اور زندگی کے نقصانات کی کچھ تلافی ہو جاتی ہے اس سے بھی ان کو محروم کر دیا جائے؟ اور مسلمانوں کا

اقتصادی ڈھانچہ جو ویسے ہی بہت کمزور ہے اس کو بالکل ہی فنا کر دیا جائے؟  
مگر اسلام وقت کے اس اہم سوال کا جواب دینے کو بھی تیار ہے اور صحیح اسلامی بیمہ کے  
بھی اصول رکھتا ہے، صحیح اسلامی بیمہ یا مروجہ بیمہ کے نعم البدل تک پہنچنے کے لئے اولاً بیمہ کے  
مقاصد اور مصالح کا تجزیہ کرنا ضروری ہے، چند مقاصد ہیں جن کے لئے بیمہ خریدا جاتا ہے وہ  
ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں:

- ۱- سرمایہ کی حفاظت کی غرض سے بیمہ کمپنی میں رقم جمع کی جاتی ہے۔
- ۲- اس سرمایہ میں تجارت یا سود کے ذریعہ برابر اضافہ ہوتا رہے۔
- ۳- جانی و مالی حادثات کے وقت وہ جمع کیا ہوا مال اور حاصل کی ہوئی آمدنی کام آتی ہے۔
- ۴- پسماندگان کی مالی امداد ہو جاتی ہے۔

### اسلام میں حوادث کا حل:

رہا تیسرے نمبر کا مسئلہ کہ حوادث روز بہ روز ہورہے ہیں اور بڑھتے جارہے ہیں جن کی  
بدولت بڑا سے بڑا دولت مند ایک روٹی تک کا محتاج ہو جاتا ہے۔

اس مسئلے کا حل بھی اسلام اپنے نظام زندگی میں رکھتا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ باہمی  
امدادی فنڈ قائم کیا جائے، یہ علاقائی سطح پر بھی قائم کیا جاسکتا ہے، اور ملک گیر سطح پر بھی، اس فنڈ میں  
تعاون اور امداد کے طور پر سرمایہ داروں سے چندہ وصول کیا جائے اور اس کو مقررہ ضابطوں کے  
تحت چلایا جائے، اس سے وقت پڑنے پر سرمایہ دار بھی مستفید ہو سکتے ہیں، جنہوں نے اس  
میں چندہ دیا ہے، یہ حل تو ان ممالک کے لئے جہاں اسلامی حکومت قائم نہیں ہے، لیکن جہاں  
اسلامی حکومت موجود ہے وہاں حکومت اسلامی بیت المال میں ایک مخصوص فنڈ قائم کرے اور اس  
میں لوگوں سے عطیات اور ٹیکس وصول کرے، حکومت اسے قانونی شکل بھی دے سکتی ہے، اس  
لئے کہ حکومت اسلامی کو عشر و زکوٰۃ کے علاوہ بعض صورتوں میں دوسرے ٹیکس بھی قائم کرنے کا حق  
ہے، جیسا کہ اس کی جانب ”ہدایہ باب الکفالتہ“ کا جزئیہ رہنمائی کرتا ہے:

”فإن أريد بها ما يكون بحق ككبرى النهر المشترك وأجر الحارس والموظف لتجهيز الجيش وفداء الأسارى وغيرها جازت الكفالة بها على الاتفاق“ (ہدایہ باب الکفالة ۱۹۰/۳)۔

(اگر اس سے وہ ٹیکس مراد ہیں جو حق اور صحیح ہیں، جیسے مشترک نہر کھودوانا، پولس اور فوجی ٹریننگ دینے والوں کی تنخواہ اور قیدیوں کو چھڑانے کے لئے زرفدیہ وغیرہ تو ان کی کفالت بالاتفاق جائز ہے)۔

اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ حکومت اسلامی عشر و زکوٰۃ کے ماسوا دوسرے ٹیکس بھی مصالح کے پیش نظر وصول کر سکتی ہے، اس لئے حکومت کی ذمہ داری ہے کہ حادثات کے وقت کے لئے پہلے ہی سے انتظامات کرے اور فسادزدگان کو خاطر خواہ تعاون دے۔

۲- ایک دوسری صورت یہ بھی ہے کہ جس پیشے اور جس صنعت والوں کی جانب سے وہ حادثہ پیش آیا ہے انہی صنعت کاروں پر اس حادثہ کے جرمانے کی ذمہ داری ڈال دی جائے، مثلاً بس سے کسی کا حادثہ ہوا اور وہ مر گیا تو جتنے لوگ اس راستے میں بس چلاتے ہیں وہ سب مل کر اس کا جرمانہ ادا کریں، اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ تمام بس یا موٹر یا دوسری گاڑی چلانے والے احتیاط سے گاڑیاں چلائیں گے اور اگر کسی کو بے احتیاطی کرتے ہوئے دیکھیں گے تو فوراً اس پر تکیہ کریں گے، اس لئے کہ حادثہ کے وقت تمام لوگوں کو اسے بھگتنا پڑے گا، جیسا کہ ہدایہ میں ہے:

”ولهذا قالوا لو كان اليوم قوم نناصرهم بالحرف فعاقتهم اهل

الحرفة“ (ہدایہ کتاب المعامل ۶۱۲/۴، ۶۶/۲)۔

(اسی لئے فقہاء نے کہا ہے کہ اگر آج امداد باہمی پیشوں کی بنیاد پر کی جائے تو ان کی

برادری پیشے ہی کے اعتبار سے سمجھی جائے گی)۔

اس وقت تمام پیشے والے اپنی اپنی یونین، یا انجمن قائم کر لیں، جس میں حادثات اور

ناگہانی آفات کے لئے ایک فنڈ جمع کریں اور ان مواقع پر اس سے فائدہ اٹھائیں۔

پیشہ ہی پر انحصار نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک جگہ مختلف پیشہ والے بلکہ مختلف مذاہب والے افراد رہتے ہیں، وہ سب آپس میں معاہدہ کر لیں کہ حادثات کے وقت ایک دوسرے کی مصیبت میں کام آئیں گے اور ایک دوسرے کی جانب سے جرمانہ ادا کریں گے، اس کے لئے باقاعدہ وہ اپنی انجمن اور کمیٹی قائم کر لیں جس میں ضابطہ کے تحت یہ کام چلائیں۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے مدینہ کے مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان معاہدہ کرایا تھا، اس میں یہ تمام شرائط موجود تھے۔ ان سب کو آپ نے ایک برادری قرار دیا تھا اور ایک دوسرے کا جرمانہ ادا کرنے کا پابند بنا دیا تھا۔

### اسلامی بیمہ کے بنیادی اصول:

۱- ایسی بیمہ کمپنی قائم کی جائے جس میں بنیادی طور پر سود کی ممانعت کر دی جائے اور جو رقوم اس پالیسی کے تحت جمع ہوں ان کو مضاربت یا شرکت کے اصول کے تحت تجارت پر لگا دیا جائے اور ان سے جو منافع حاصل ہوں وہ تمام شرکاء کے درمیان تناسب کے ساتھ تقسیم کر دیا جائے۔

۲- یہ تو ایک طرح کا غیر سودی بیکاری نظام ہو جس میں سرمایہ کی حفاظت اور اس میں بڑھوتری ہوگی تو لیکن اس کو حادثات کے وقت کام میں لانے اور امداد باہمی کا ذریعہ بنانا اگر مطلوب ہو تو مضاربت اور شرکت کے اصول پر کی گئی تجارت ہے جو منافع حاصل ہوں ان میں سے ایک مخصوص حصہ اس خاص مد کے لئے الگ کر لیا جائے اور اس کو ایک ریزرو فنڈ کی صورت میں محفوظ کر لیا جائے۔

اور اس کو معاہدہ اور قانون کی صورت دے دی جائے جس کے تمام ہی شرکاء رضا مندی کے ساتھ پابند ہوں۔

۳- یہ ریزرو فنڈ وقف ہوگا، اس کو نہ فروخت کیا جاسکے اور نہ ہبہ، یہ کسی ایک شخص کی

ملک نہ ہوگا، بلکہ ادارہ اس کا مالک ہوگا، البتہ اس کے لئے ایک متولی انتخاب کر لیا جائے جو ان چیزوں کی دیکھ بھال کرے گا۔

۴- اس فنڈ سے حادثات کے پیش نظر آجانے کی صورت میں صرف ان لوگوں کو امداد دی جائے جو اس فنڈ میں شریک ہیں اور ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے، اس لئے کہ مخصوص افراد کے لئے وقف جائز ہے، مثلاً وقف علی الاولاد۔

۵- اس وقف فنڈ سے خاص ان لوگوں کو بھی فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے، جن کی آمدنی سے وضع کر کے موقوفہ فنڈ میں شامل کیا گیا ہے، کیوں کہ اپنے وقف سے خود استفادہ کرنا بھی جائز ہے مثلاً کوئی آدمی مسجد بنا کر وقف کرے تو خود اسے بھی اس مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے، ایک آدمی قبرستان کے لئے زمین وقف کرے تو خود اس کی اور اس کے رشتہ داروں کی قبریں بھی اس میں بنائی جاسکتی ہیں۔

۶- حادثات کے وقت امداد کے لئے کچھ اور قوانین بنا لئے جائیں کہ کس نوعیت کے حادثہ کے وقت امداد کی مقدار کیا ہوگی، جانی حادثہ میں امدادی رقم کی مقدار ہوگی اور مالی میں کیا کیا وغیرہ۔

۷- تعاون کی مدت مقرر کر دی جائے، مثلاً دس سال تک تعاون کرنا لازمی قرار دے دیا جائے۔

۸- اگر کوئی اس سے پہلے اپنی شرکت ختم کرنا چاہے تو اس کا سرمایہ ضائع ہوگا، لیکن دس سال سے پہلے لوٹا یا بھی نہیں جائے گا۔

۹- یا یہ کیا جائے کہ دس سال تک وہ عام ممبروں کی طرح اگر تعاون میں شریک رہتا تو جو شرح منافع اس کو ملتا، اس کا آدھا یا چوتھائی منافع اس کو اس صورت میں دیا جائے، جبکہ وہ مقررہ مدت سے قبل ہی اپنا تعاون منسوخ کرنا چاہے۔

یہ چند بنیادی ضابطے ہیں ان کے تحت بہت سارے ضوابط وضع کئے جاسکتے ہیں۔



## انشورس

مولانا محفوظ الرحمن مفتاحی ☆

انشورس کے بارے میں منفعت و مضرت دونوں صورتیں بیان کی جاتی ہیں اور اس کی بنیاد ربوا و قمار پر ہے اس لئے مضرت کے غالب ہونے اور ربوا پر مبنی ہونے کی وجہ سے انشورس شرعاً حرام ہے۔

انشورس کے متعلق سوالات کے جوابات:

- ۱- بیمہ کی جو حقیقت ذکر کی جاتی ہے اس لحاظ سے منافع کی رقم پر سود کا اطلاق ہوتا ہے، نام بدلنے کی وجہ سے حقیقت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔
- ۲- جواز کی کوئی گنجائش نہیں۔
- ۳- بیمہ کی تینوں صورتوں کا حکم ایک ہی ہے۔
- ۴- یہ صورت قمار کی حد میں داخل ہے۔
- ۵- بیمہ کی موجودہ صورت کے برقرار رہتے ہوئے مصالح کے پیش نظر جواز کی کوئی گنجائش نہیں، لیکن وہ مقامات جہاں کہ بیمہ کی موجودہ صورت میں ترمیم نہیں کی جاسکتی اور بیمہ کے بغیر

- تجارت و ملازمت کرنا قانوناً ممنوع ہو تو بدرجہ مجبوری کرایا جاسکتا ہے۔
- ۶- سودی رقم لینے سے احتراز کے باوجود بیمہ کا معاملہ جائز نہیں ہو سکتا۔
- ۷- حقیقت میں ترمیم کئے بغیر نام میں ترمیم کر لینے سے مسئلے کی صورت جائز نہیں ہوگی۔
- ۸- دارالحرب میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حربی اور مسلمانوں کے درمیان سودی معاملہ جائز ہے، اس لئے دارالحرب میں حربیوں کی کمپنی میں مسلمانوں کے لئے شرکت جائز ہے۔
- ۹- کوئی فرق نہیں۔
- ۱۰- حکومت کے خزانہ میں رعیت کا حق تسلیم کر لینے کے باوجود اضافی رقم سود کی حد سے خارج نہیں ہوتی۔
- ۱۱- بیمہ پالیسی کی بنیاد سود پر ہے سود قطعاً حرام ہے، اس لئے کسی کی بھی ضرورت پوری کرنے کی غرض سے بیمہ پالیسی خریدنا جائز نہیں ہوگا، اور نہ سود حلال ہوگا۔
- ۱۲- کسی شخص کی امداد کی غرض سے بھی بیمہ پالیسی خریدنا جائز نہیں ہوگا۔
- ۱۳- انشورنس کا بدل موجود ہے مزید اس کی مروجہ شکل میں اصلاح کی جاسکتی ہے، لیکن مجبوری یہ ہے کہ جو ممالک اسلامی کہے جاتے ہیں ان میں بھی اسلامی اصولوں پر تجارت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، اور ہندوستان یا وہ ممالک جو جمہوری ہیں یا غیر مسلموں کے تسلط میں ہیں اور تجارتی نظم حکومت کی پالیسی کے تحت مرتب ہوتا ہے تو اسلامی کوئی بھی شکل پیش کرنے سے کیا فائدہ۔ البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم پرسنل لاء کی طرح تجارت میں بھی مسلمانوں کے لئے خصوصی مذہبی طرز پر تجارت کرنے کی مانگ کی جائے۔

## بیمہ پالیسی

مفتی محمد نظام الدین رضوی ☆

بیمہ تین طرح کا ہوتا ہے۔

۱- زندگی کا بیمہ، ۲- مال کا بیمہ، ۳- ذرائع نقل و حمل (گاڑیوں) کا بیمہ۔

بیمہ کی یہ تینوں صورتیں اپنی حقیقت کے لحاظ سے قمار (جوا) ہیں، کیونکہ ”زندگی بیمہ“ کی صورت میں اگر تین سال پورا ہونے سے پہلے قسط بند ہو جائے اور بیمہ کی آخری دونوں صورتوں میں سال بھر کے اندر مال یا گاڑی کے ساتھ کوئی حادثہ نہ پیش آئے تو جمع کی ہوئی ساری رقم سوخت ہو جاتی ہے۔ اور اگر تین سال سے پہلے قسط بند نہ ہوئی اور آخری دونوں صورتوں میں مال و گاڑی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا تو اب بیمہ نافع و سود مند ہوتا ہے تو بیمہ فی الواقع حصول مال کے شرعی اسباب کے علاوہ ایک ایسا عقد ہے جس میں مال اندوزی کی امید موہوم پر ایک فریق روپے کی شکل میں پانسہ ڈالتا ہے، قسمت نے ساتھ دیا تو یہ بازی جیت لے گا، ورنہ ہار جائے گا۔ یہ بلاشبہ قمار ہے جو شرعی نقطہ نگاہ سے قطعی جائز نہیں، مگر یہ حکم مسلم، ذمی اور مستامن کے ساتھ خاص ہے، اور حکومت ہند کا معاملہ اس کے برعکس ہے، جیسا کہ ذیل کے نکات سے واضح ہے:

☆ دارالعلوم اشرفیہ مصباح العلوم، مبارکپور

پہلا نکتہ:

قمار یا دوسرے عقودِ فاسدہ کی حرمت کا تعلق مالِ معصوم و منظور سے ہے، مالِ مباح میں قمار یا کسی بھی عقدِ فاسد کا تحقق نہ ہوگا کہ جب وہ مالِ مباح ہے تو کسی عقد کے لبادہ میں ہونے سے اس کی حقیقت نہ بدل جائے گی اور وہ بہر حال مباح ہی رہے گا، الا یہ کہ غدر و فریب کے ذریعے سے حاصل کیا جائے تو اس عارض کی وجہ سے یہ حصول ناجائز ہوگا۔

دوسرا نکتہ:

مسلم، ذمی اور متامن کا مال معصوم و منظور ہے اور ذمی و متامن کے سوا دوسرے غیر مسلموں کا مال مباح ہے، یہ سب امور کتاب و سنت کی نصوص سے ثابت ہیں۔

تیسرا نکتہ:

فقہی اصطلاح کے مطابق یہاں کے غیر مسلم نہ ذمی ہیں نہ متامن، حضرت ملاً احمد جیون، حضرت سلطان اورنگ زیب کے عہد کے غیر مسلموں کے متعلق تفسیراتِ احمدیہ میں لکھتے ہیں:

”إن ہم الاحریبون وما یعقلها الا العلمون“

اس لئے غدر و فریب کے سوا تمام صورتوں میں ان کا بھی مال مباح ہے، یعنی کسی بھی طرح کے عقد کے ذریعے ان کی اجازت و رضا سے ان کا جو مال ملے اسے لینا جائز ہے، اور یہاں عملی طور پر حکومت بھی انہیں غیر مسلموں کی ہے، گودستوری حیثیت سے اس کی جو بھی نوعیت ہو، اس لئے یہاں کی حکومت سے اور یہاں کے غیر مسلموں سے قمار، ربا یا کسی بھی عقدِ فاسد کی شکل میں جو مال ملے وہ حرام نہیں کہ فی الواقع وہ عقودِ فاسد ہیں، نہ قمار، نہ ربا، بلکہ ان کو عقودِ فاسدہ سے محض ایک صورتی مشابہت ہے، اسی لئے ایک حدیث میں سرے سے جنسِ ربا کی ہی نفی فرمادی گئی:

”عن مكحول قال: قال رسول الله ﷺ: لا ربا بين أهل الحرب أظنه

قال: وأهل الاسلام“ (الدرایہ فی تخریج الہدایہ قبیل کتاب الحقوق)۔

ہاں ان عقود کے جواز کے لئے یہ شرط ہے کہ نفع مسلم کو ملے، ورنہ بہ صورت دیگر یہ عقود

ناجائز ہوں گے کہ یہ بلا عوض مال معصوم کو ضائع کرنا ہوگا۔ امام ابن الہمام فرماتے ہیں:

”قد الزم الاصحاح فی الدرس أن مرادهم من حل الربا والقمار ما إذا

حصلت الزيادة للمسلم وكان الغلب له نظراً إلى العلة اھ“ (رد المحتار عن فتح قبیل

کتاب الحقوق)۔

ان نکات کی روشنی میں بیمہ کا حکم واضح ہو کر سامنے یہ آتا ہے کہ اگر مسلمان کو ظن غالب

ہو کہ اس میں کامیابی اسی کو ہوگی اور نفع اسی کو ملے گا تو اسے بیمہ کرنا جائز ہے، ورنہ نہیں۔

عام حالات میں آدمی کو اپنے محفوظ مال اور ذریعہ آمدنی کے پیش نظر یہ گمان غالب ہو

سکتا ہے کہ وہ ”زندگی بیمہ“ کی قسطیں تین سال تک ادا کر سکتا ہے، لیکن مال اور گاڑی کے بیمہ میں

حادثہ پیش آنے کا گمان غالب نہیں ہو سکتا، بلقظ دیگر زندگی بیمہ میں غلبہ و کامرانی کا گمان غالب

ہو سکتا ہے، مگر دوسرے دو بیویوں میں نہیں ہو سکتا۔ لہذا بہ شرط غلبہ ”زندگی بیمہ“ کی اجازت ہے، مگر

مال اور گاڑی کے بیمہ کی اجازت نہیں کہ وہاں غلبہ کی امید ہی نہیں۔

ہاں اگر ہنگامہ خیز حالات میں مال و گاڑی کے برباد ہو جانے کا گمان غالب ہو جائے تو

خاص اُن حالات میں گاڑی اور مال کے بیمہ کی بھی اجازت ہوگی۔

بیمہ پالیسی کی وجہ سے فسادات پر قابو پانے کا مسئلہ میرے نزدیک حد درجہ مشکوک

ہے، ہو سکتا ہے اس کی وجہ سے فسادات کم ہو جائیں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے

فسادات اور بھیا تک شکل اختیار کر لیں کہ جس گھر پر حملہ ہو اس کا پورا کنبہ ہی صاف کر دیا جائے

تاکہ کوئی وارث باقی ہی نہ رہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ باقی ماندہ افراد پالیسی کی رقم حاصل کر لیں،

پھر دوبارہ، سہ بارہ فسادات برپا کر کے وہ رقم لوٹ لی جائے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کرنیو کے زمانہ

میں لاشوں کو ہی غائب کر دیا جائے اور پھر بیمہ دار کی گم شدگی کی صورت میں مال کے حصول کو مختلف پیچیدگیوں کے ذریعہ دشوار تر کر دیا جائے، جس کی وجہ سے بہت سے لوگ رقم حاصل ہی نہ کر سکیں، یا پھر اس میں متعلقہ عملہ کی لوٹ کھسوٹ سے ہوا رہ ہو جائے تو حکومت کو مجموعی حیثیت سے بیمہ داروں کو کم و بیش اتنی ہی رقم ادا کرنا پڑے جتنی رقم اسے عام حالات میں ادا کرنا پڑتی ہے، یعنی حکومت پر کوئی ناقابل تلافی مالی دباؤ اس کی وجہ سے نہ پڑے، پس ایسے احتمالات کے ہوتے ہوئے فسادات پر قابو پانے کے مسئلے کو بیمہ کے جواز کی دلیل نہیں قرار دیا جاسکتا۔



## انشورنس اسلام کی نظر میں

محمد شعیب اللہ مفتاحی، بنگلور

### انشورنس کی حقیقت:

انشورنس کے احکام پر گفتگو سے پہلے انشورنس کی حقیقت پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ انشورنس انگریزی میں وثوق دلانے اور یقین دہانی کے معنی رکھتا ہے، اسی سے انشورنس ایک ایسے معاملہ کو کہا جاتا ہے جس میں بعض شرائط پر ایک شخص کو دوسرے کی طرف سے مستقبل میں پیش آنے والے امکانی خطرات سے حفاظت اور بعض نقصانات کی تلافی کی یقین دہانی کی جاتی ہے، اور وہ شرط یہ ہے کہ وہ شخص جس کے لئے خطرات سے حفاظت اور نقصانات کی تلافی کی یقین دہانی کی گئی ہے، وہ ایک معینہ مدت تک ایک مقررہ رقم قسط وار دوسرے شخص کو ادا کرتا رہے، اگر اس مقررہ مدت کے درمیان اس کے جان و مال و املاک کو کوئی خطرہ لاحق ہو گیا تو یہ دوسرا شخص اس کو اس خطرہ سے بچائے گا اور اس کے نقصان کی تلافی کرے گا اور اگر اس مقررہ مدت میں کوئی خطرہ پیش نہ آیا تو بالاقساط ادا کردہ پوری رقم سود کے ساتھ واپس کر دی جائے گی۔ پھر اس قسط اور جمع شدہ رقم پر سود دینا اور خطرات کے لاحق ہونے کی صورت میں نقصانات کی تلافی کرنا، ایک دشوار گزار مرحلہ تھا، اس کو اس طرح حل کیا جاتا ہے کہ اس رقم کو سود پر دیا جاتا ہے اور اس سے حاصل ہونے والے سود سے ان ذمہ دار یوں کو پورا کیا جاتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ:

انشورنس ایک ایسا معاملہ ہے جس کی ابتداء قمار (جوئے) سے ہوتی ہے اور انتہا سود پر۔  
گو یا انشورنس قمار اور سود کا مرکب ہے، چنانچہ سوالنامہ کے مرتب نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے کہ:

حقیقت کے لحاظ سے انشورنس کا معاملہ ایک سودی کاروبار ہے جو بینک کے کاروبار کے مثل ہے، دونوں میں جو فرق ہے وہ شکل کا ہے، حقیقت کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے حقیقت میں اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ اس میں ربوا کے ساتھ ”غرر“ بھی پایا جاتا ہے۔

### انشورنس کی مختلف صورتیں:

اس کے بعد واضح رہے کہ آج انشورنس کی مختلف قسمیں اور صورتیں رائج ہیں اور بنیادی طور پر اس کی تین صورتیں ہیں ایک زندگی کا انشورنس، دوسرے املاک کا انشورنس اور تیسرے ذمہ داریوں کا انشورنس۔ ان تینوں انشورنس کی قسموں میں جو بات مشترک طور پر پائی جاتی ہے وہ وہی ہے جو اوپر ذکر کی گئی کہ اس کی ابتداء قمار اور جوئے سے ہوتی ہے اور اس کا اختتام سود پر ہوتا ہے، لہذا ان اقسام پر الگ الگ بحث کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک کا جو حکم ہوگا وہی دوسری صورتوں کا بھی ہوگا۔

### انشورنس میں سود اور سود کی شرعی تعریف:

اب ہم اصل سوالات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، انشورنس کا یہ معاملہ جس کی وضاحت کی گئی ہے، سود اور قمار پر مشتمل ہے، مگر بعض لوگ یہ عجیب اور دل چسپ جھگڑا پیدا کرتے ہیں کہ انشورنس کے معاملہ میں جس کو انٹرسٹ (INTEREST) کہا جاتا ہے، یہ شرعی سود نہیں ہے، اور ان کی دلیل یہ ہے کہ اسلام میں جس کو سود کہا گیا ہے وہ اس سے مختلف دوسری چیز ہے، وہ یہ کہ خرید و فروخت میں ہم جنس اشیاء کو کمی بیشی کے ساتھ دینا لینا جبکہ وہ مقداری ہوں سود ہے، قرض میں زیادتی سود نہیں ہے، لہذا انشورنس کا معاملہ چونکہ قرض کی ایک شکل ہے، اس میں زیادتی شرعی



ربو انہیں ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں جس طرح خرید و فروخت میں سود اور ربو ہوتا ہے اور وہ ناجائز ہے، اسی طرح قرض میں بھی اس کا تحقق ہوتا ہے، بلکہ زمانہ جاہلیت سے ربو کی جو شکل رائج تھی وہ یہی قرض پر زیادتی والی تھی، امام طحاویؒ نے (شرح معانی الآثار ۲/۱۹۱، امام قرطبی نے اپنی تفسیر احکام القرآن ۳/۳۳۸، اور امام رازی نے تفسیر ۲/۳۵۱) اس کی صراحت فرمائی ہے، تفصیل کے لئے مجولہ مقامات دیکھے جاسکتے ہیں۔

انشورنس میں دو طرح سودی معاملہ ہے:

پھر انشورنس میں سودی معاملہ دو طرح ہے، ایک تو انشورنس کمپنی، انشورنس کے طالب سے رقم وصول کر کے دوسرے حاجت مندوں کو سود پر قرض دیتی ہے، لہذا یہ طالب انشورنس کمپنی کا سودی کاروبار میں معاون ہوگا اور سودی کاروبار کے تعاون کا حرام ہونا محتاج بیان نہیں، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

”رسول اللہ ﷺ سود کھانے والے، سود دینے والے، سودی حساب لکھنے والے اور اس معاملے پر گواہ بننے والے پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا کہ یہ سب (گناہ میں) برابر ہیں“ (مسلم ۲/۲۷۲)۔

علامہ نوویؒ شارح مسلم نے اس حدیث پر لکھا ہے کہ:

”فیہ تحریم الإعانة علی الباطل“ (نووی شرح مسلم ۲/۲۸۲)۔

دوسرے یہ کہ انشورنس کمپنی ان طالبین کو ان کی جمع کردہ رقم پر سود دیتی ہے اور یہ صریح حرام ہے، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔

انشورنس کے مصالح اور حکم شرعی میں ترمیم کا مسئلہ:

اب رہا یہ سوال کہ انشورنس کے معاملہ میں بڑی مصلحتیں ہیں، لہذا ان مصالح کے پیش

نظر کیا اس کی اجازت نہ ہوگی؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مصالِح کا اعتبار وہاں کیا جاتا ہے جہاں مقاصد شریعت فوت نہ ہوتے ہوں، اور جہاں مقاصد شریعت فوت ہوتے ہوں وہاں مصالِح کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا، پھر مصالِح کے اعتبار کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں حکم منصوص نہ ہو، اور یہاں ایک تو حکم منصوص ہے اور وہ ہے سود کا حرام ہونا، اسی طرح قمار کا حرام ہونا، دوسرے ان مصالِح کے اعتبار کرنے سے مقاصد شریعت (جو سود کی حرمت سے متعلق ہیں) فوت ہو جاتے ہیں، لہذا ان مصالِح کا اعتبار کر کے انشورنس کے جواز کا فتویٰ کسی طرح نہیں دیا جاسکتا۔

پھر وہ مصالِح جن کا ذکر کیا جاتا ہے ان کی تحصیل کچھ اسی معاملہ پر منحصر نہیں ہے کہ اس میں جواز تلاش کیا جائے، بلکہ شریعت نے ان مصالِح کی تحصیل کے لئے دوسری صورتیں تجویز فرمائی ہیں، جیسا کہ اس کا ذکر آئے گا۔

انشورنس میں مفاسد:

پھر مصالِح پر نظر کرنے والوں کو چاہئے کہ وہ اس کے مفاسد پر بھی نظر کریں، کیونکہ اگر صرف مصالِح کو دیکھا جائے تو بلاشبہ ہر اچھی اور بری چیز میں کچھ نہ کچھ مصالِح نظر آئیں گے، حتیٰ کہ قرآن نے شراب اور جوئے میں بھی کچھ منافع و مصالِح کا ہونا تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

”يَسْتَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَ مَنَافِعٌ لِلنَّاسِ“

(سورہ بقرہ: ۲۱۹)۔

مگر منافع و مصالِح کو تسلیم کرنے کے باوجود اس کو حلال اس لئے نہیں قرار دیا گیا کہ اس میں مفاسد بھی ہیں اور انہی مفاسد کی طرف اِثْمٌ کبیر سے اشارہ کیا گیا ہے (فی روح المعانی: ”الِاثْمُ بِمَعْنَى الْمُسَدَّةِ“ فی قول ۲/۲۱۵)۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف مصالِح پر نظر کرنا کافی نہیں، بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ اس میں کچھ مفاسد بھی ہیں یا نہیں؟ اور یہ ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں بڑے مفاسد بھی ہیں جن

کا ذکر سوال میں بھی کیا گیا ہے، مثلاً بیمہ اور انشورس کی رقم وصول کرنے کے لئے وارث نے بیمہ دار کو قتل کر دیا، یہ کتنا بڑا مفسدہ ہے۔

غور کیجئے کہ اس سے پیدا ہونے والے مفاسد صرف جان یا مال سے متعلق نہیں ہیں، بلکہ روح سے بھی تعلق رکھتے ہیں، مثلاً دشمنی، حسد و بغض، جھوٹ، مکر و فریب وغیرہ، ان روحانی مفاسد کے ہوتے ہوئے انشورس کے مصالح کے پیش نظر اس کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا، اسلام میں جانی و مالی مصالح سے زیادہ روحانی مصالح قابلِ اعتناء ہوا کرتے ہیں۔

### انشورس کی مختلف صورتوں میں فرق ہے یا نہیں؟

اس پر میں نے پہلے ہی روشنی ڈالی ہے کہ انشورس کی مختلف صورتیں ہیں، مگر ان میں حکم کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں، کیونکہ ہر صورت و شکل میں سود اور قمار پایا جاتا ہے، لہذا یہ شکل کا تفاوت ہے، معاملہ کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں ہے، یہ کل صورتیں جن کے بارے میں عدم جواز کا حکم لگایا گیا ہے، تین ہیں، جیسا کہ سوالنامہ کے مرتب نے لکھا ہے:

۱- زندگی کا انشورس ۲- املاک کا انشورس ۳- ذمہ داریوں کا انشورس۔

البتہ ایک اور صورت بھی ہے جس کا سوالنامہ میں ذکر نہیں ہے، وہ ہے ”سندات

و کاغذات کا انشورس“، اس بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے لکھا ہے:

”اس کا رواج کچھ قدیم ہے، اسی لئے علامہ ابن عابدین شامی جو متاخرین میں افضل الفقہاء مانے گئے ہیں، انھوں نے اس کا ذکر ”کتاب الجہاد باب المستامن“ میں بنام ”سوکرہ“ کیا ہے، مگر اس کی جو صورت لکھی ہے وہ موجودہ بیمہ سندات و کاغذات سے کسی قدر مختلف ہے، علامہ شامی نے اس کو بھی ناجائز قرار دیا ہے، مگر انھیں کی تحریر سے ”بیمہ سندات و کاغذات“ کی مروجہ صورت کا جواز معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس میں نقل کیا ہے:

”إن المودع إذا أخذ الأجرة على الوديعة يضمنها إذا هلكت“ (شامی)۔

(یعنی جس شخص کو کوئی سامان بغرض حفاظت دیا جائے اگر وہ اس کی حفاظت کا معاوضہ لیتا ہے تو ضائع ہو جانے کی صورت میں اس پر ضمان واجب ہوگا)۔  
ظاہر ہے محکمہ ڈاک وغیرہ جو سندات و کاغذات وغیرہ سر بمہر کر کے حفاظت کے وعدہ پر لیتا ہے اور اس کی حفاظت کی فیس بھی لیتا ہے تو ضائع ہو جانے کی صورت میں مذکورہ روایت کی بنا پر ضائع شدہ کاغذات کا ضمان اس پر لازم آئے گا (رسالہ بیر زندگی مندرجہ جواہر الفقہ ۱۸۲/۲-۱۸۳)۔

### انشورس میں قمار:

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، انشورس کی ابتداء قمار (جوائے) سے ہوتی ہے، کیونکہ اس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ بیمہ شدہ شخص یا شئی وقت معین سے پہلے تلف ہو جائے تو اتنی رقم ملے گی، اور اس وقت کے بعد تلف ہو تو اتنی، جبکہ تلف ہونے کا وقت متعین نہیں اور نہ ہو سکتا ہے، اور اسلام میں جس کو قمار (جوا) کہا گیا ہے اس کی حقیقت بس یہ ہے کہ کسی معاملہ میں نفع و نقصان کو غیر معین و نامعلوم بات پر معلق و موقوف کیا جائے کہ اگر وہ واقع ہو جائے تو نفع ہو اور اگر نہ واقع ہو تو نقصان۔ علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

”لأن القمار من القمَر الذي يزداد تارة وينقص أخرى وسمى القمار قماراً، لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه، ويجوز أن يستفيد مال صاحبه وهو حرام بالنص“ (رد المحتار ۶/۴۰۳)۔

اور ”التعريفات الفقہیہ“ کے مؤلف علامہ عمیم الاحسان صاحب فرماتے ہیں:

”القمار مصدر قامر هو كل لعب يشترط فيه غالباً أن يأخذ الغالب شيئاً من المغلوب وأصله أن يأخذ الواحد من صاحبه شيئاً فشيئاً في اللعب، ثم عرفوه بأنه تعليق الملك على الخطر والمال في الجانبيين“ (التعريفات الفقہیہ مندرجہ

غرض یہ کہ انشورنس میں یہ جو شرط ہوتی ہے کہ فلاں شخص (جس کی زندگی کا بیمہ ہوا ہے) یا فلاں شی (جس کا بیمہ ہوا ہے) اگر مقررہ مدت کے اندر مرے یا ہلاک ہو جائے تو اتنی رقم ملے گی، یعنی نفع ہوگا اور اگر اس مدت کے بعد مرے یا ہلاک ہو تو اتنی رقم ملے گی، یعنی پہلے کی بہ نسبت نقصان ہوگا، یہ ایسی شرط ہے جس کا وجود و عدم غیر معین و مبہم ہے، ایسی شرط پر معاملہ کو دائر کرنا صریح قرار ہے۔

حدیث میں اسی بنا پر ”رقعی“ کی ممانعت آئی ہے۔ ”ابوداؤد“ میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ”رقعی نہ کرو“ (ابوداؤد مع بزل الجہود ۳۰۱/۵)۔

اور ”رقعی“ کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو یوں کہے کہ یہ مکان اگر تو پہلے مرجائے تو میرا ہے اور اگر میں پہلے مرجاؤں تو تیرا ہے (بزل الجہود ۳۰۱/۵، تفسیر القرطبی ۲۹۹/۱)۔ علامہ قرطبی، امام مالک اور کوفیین (امام ابوحنیفہؒ و محمدؒ) کی جانب سے اس کے ممنوع ہونے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں:

”لأن كل واحد منهم يقصد إلى عوض لا يدري هل يحصل له ويتمنى كل واحد منهما موت صاحبه“ (تفسیر قرطبی ۲۹۹/۱)۔

ایک شبہ کا جواب:

یہاں یہ ممکن ہے کہ یہ شبہ پیدا ہو کہ رقی اگر قرار پر مشتمل ہے تو اس کو تمام ائمہ نے حرام کیوں نہیں قرار دیا؟ امام ابو یوسفؒ، امام شافعیؒ وغیرہ اس کے جواز کے قائل ہیں، یا خود قرار میں کوئی گنجائش ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جن ائمہ نے اس کو ناجائز قرار دیا ہے انھوں نے اس کی تفسیر وہی کی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ ملک کو موت پر معلق رکھا گیا ہو، اور جن حضرات نے اس کو جائز کہا ہے وہ رقی کی مذکورہ تعریف و صورت ہی کو تسلیم نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ ”رقعی“ کی صورت یہ

ہے کہ ایک مکان کسی کو ہبہ کر دیا جائے اور ساتھ ہی یہ شرط کی جائے کہ اگر تو پہلے مرا تو یہ مکان مجھے واپس مل جائے ورنہ نہیں، اس صورت میں ملک کو موت پر معلق نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ واپسی کو موت پر معلق رکھا گیا ہے۔ یہ ہبہ بشرط فاسد ہے۔ علامہ خلیل احمد محدث سہارنپوری فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی تقریر میں ہے:

”لان تعليق التملیک علی شرط هو علی خطر الوجود قمار فکان

الخلافا لفظیا مبنیا علی اختلاف تفسیر الرقبی“ (بذل المحمود ۵/۳۰۱، ۳۰۲)۔

حاصل یہ کہ قمار کا حرام ہونا اپنی جگہ مسلمہ حقیقت ہے، اس میں کوئی گنجائش نہیں، ہاں رقمی کی صورت میں اختلاف ہے، جنہوں نے اس کو قمار کی شکل دی وہ ناجائز قرار دیتے ہیں اور جنہوں نے دوسری صورت دی وہ جواز کے قائل ہیں۔

بہر حال انشورنس میں چونکہ قمار صاف طور پر موجود ہے، اس لئے یہ ناجائز ہوگا اور اس میں مصالح مذکورہ کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔

انشورنس میں سود لئے بغیر شرکت کا حکم:

سوال میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص انشورنس کے معاملے میں سود سے محترز رہے اور صرف اپنی اصل رقم کی واپسی چاہتا ہو تو کیا یہ معاملہ جائز ہو سکتا ہے؟

اس بارے میں ایک تو اس پر غور کرنا ہے کہ اگر کوئی شخص اس معاملہ میں سود لینے سے محترز رہا تو وہ اس برائی و مفسدہ سے بچ تو گیا، لیکن جبکہ اس کو یہ معلوم ہے کہ اس کا اس معاملہ میں لگایا ہوا روپیہ سودی کاروبار میں تعاون ہوا، اور یہ بھی تو ناجائز ہے، کیونکہ اسلام میں حرام کام کا تعاون بھی حرام ہے، درمختار میں ہے:

”ویکره بیع السلاح من اهل الفتنة ان علم، لانه اعانة علی المعصية

وبیع ما یتخذ منه كالحدید ونحوه یکره لأهل الحرب لا لأهل البغی لعدم

تفرغهم لعمله سلاحاً“ (درمختار ۳/۲۶۸)۔

اور اوپر وہ حدیث گذر چکی ہے جس میں سود لینے، سود دینے اور اس پر گواہ بننے اور اس کا حساب لکھنے کو ایک ہی درجہ کا گناہ قرار دیا گیا ہے۔

جب گواہ بنا اور حساب لکھنا بھی تعاونِ حرام میں داخل ہو جاتا ہے تو جانتے بوجھتے اپنا روپیہ ایسے لوگوں کے حوالہ کرنا جو اس کو سود پر لگاتے ہوں، کیوں کر تعاونِ حرام نہ ہوگا؟ اس لئے سود لئے بغیر بھی اس معاملہ میں شرکت ناجائز ہوگی۔

اس کے علاوہ یہ بھی غور کرنا ہے کہ اس معاملہ میں قمار بازی بھی ہے، اگر سود نہ لیا جائے تو ایک گناہ ختم ہوا، مگر قمار بازی بھی خود ایک مستقل گناہ ہے اس کا کیا ہوگا؟ بخاری کی ایک حدیث میں ہے:

”من قال لصاحبه تعال اقامرک فليتصدق“ (بحوالہ کتاب الکبائر للذہبی/۸۹)۔

جب کسی سے صرف یہ کہنا کہ چلو، جو اکھیلیں موجب تصدق ہے تو خود قمار بازی کا کیا

حال ہوگا؟

لہذا سود لئے بغیر بھی اس میں شرکت دو وجہ سے ناجائز ہوگی، ایک تو اس لئے کہ اس میں شرکت سودی کاروبار کے تعاون کا ذریعہ ہے، دوسرے اس لئے کہ اس میں قمار بازی کا گناہ ہے۔

ربوایا امداد؟

اور یہ کہنا کہ انشورنس کے معاملے میں کمپنی جو رقم سود کے نام سے ادا کرتی ہے وہ ربوایا اور سود نہیں ہے، بلکہ وہ بیمہ داروں کی امداد و اعانت اور تبرع و احسان ہے، یہ سراسر غلط ہے۔

کیونکہ ہر چیز کا حکم اس کی حقیقت سے متعلق ہوا کرتا ہے نام سے نہیں، اگر کوئی شخص شراب کو شربت کا نام دے دے تو صرف نام کے بدل جانے سے اس پر حلت کا حکم نہیں کیا جائے گا، بلکہ دیکھا جائے گا کہ اس مسمیٰ بہ شربت شئی میں نشہ ہے یا نہیں، اگر ہے تو بلاشبہ حرمت کا حکم لگایا جائے گا، اگرچہ نام اس کا شربت ہی ہو جائے۔ اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ انشورنس کے معاملے میں جو رقم زائد دی جاتی ہے، حقیقت کے لحاظ سے ربوایا شرعی ہے، اس کو امداد و اعانت یا تبرع و احسان کا نام دینے سے اس کے حکم حرمت میں کوئی فرق نہ آئے گا، وہ حرام ہی ہوگا۔

پھر جس کو یہاں امداد و احسان کہا جا رہا ہے اس پر امداد و احسان کی تعریف بھی صادق نہیں آتی، کیوں کہ امداد و احسان میں جبر نہیں ہوتا، اور انشورنس کی اس زائد رقم میں جبر ہوتا ہے، خود کمپنی بھی اور بیمہ دار بھی اس بات کو سمجھتے ہیں کہ یہ زائد رقم قانونی چارہ جوئی سے بھی وصول کی جاسکتی ہے، اگر کمپنی نہ ادا کرے۔ بتائیے یہ کیسا احسان ہے جس میں جبر بھی ہو سکتا ہے۔

غرض یہ کہ یہ ربوا، ربوا ہی ہے اور حرام ہے۔ تاویلوں اور ناموں کی تبدیلی سے اس کے اصل حکم میں کچھ بھی فرق نہیں آتا۔

### دارالحرب میں سود کا مسئلہ:

انشورنس اور اس میں سود ہونے کی بحث اٹھتی ہے تو عام طور پر دارالحرب میں سود کا مسئلہ بھی زیر بحث لایا جاتا ہے، چنانچہ سوالنامہ میں اس کو اٹھایا گیا ہے۔

دارالحرب میں حربی سے اس کی رضامندی کے ساتھ سود لینے کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ جواز کے قائل ہیں اور امام ابو یوسفؒ اور ائمہ ثلاثہ (امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ) عدم جواز کے قائل ہیں۔ علامہ حکفنیؒ فرماتے ہیں:

” (ولا بین حربی و مسلم) مستامن ولو بعقد فاسد أو قمار (ثمہ) لأن مالہ ثمة مباح فیحل برضاه مطلقا بلا عذر خلافا للثانی والثالثہ“ (در مختار مع الرد ۱۸۶/۵، بحر الرائق ۱۳۵/۶)۔

امام اعظم جو جواز کے قائل ہیں ان کے نزدیک اس کے جواز کی چند شرطیں ہیں ان پر بھی نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

۱- حربی سے سود لینے والا ایسا مسلمان ہو جو دارالحرب میں دارالاسلام سے امن لے کر آیا ہو، جسے فقہاء کی زبان میں ”مستامن“ کہتے ہیں، ”در مختار“ کی مذکورہ بالا عبارت میں مسلم کے ساتھ ”مستامن“ ہونے کی قید مصرح ہے، لہذا جو مسلمان دارالحرب ہی میں رہتا ہو، مستامن نہ ہو، وہ حربی سے سود نہیں لے سکتا۔



۲- یا یہ سود لینے والا مسلمان اسیر (قیدی) ہو:۔ قال ابن عابدین (قولہ و مسلم مستامن) مثله الالاسیر“ (شامی مع الدرہ ۱۸۶/۵) اور اسیر کے سود لینے کے جواز میں ابو یوسفؒ بھی امام اعظمؒ کے ساتھ متفق ہیں (شامی ۱۸۶/۵)۔

۳- یا یہ سود لینے والا ایسا مسلمان ہو جو دارالہرب ہی میں اسلام لایا ہو اور ہجرت نہ کیا ہو (حوالہ سابق)۔

۴- یہ معاملہ حربی سے ہو، مسلم اصلی یا ذمی سے نہ ہو۔

”فی الشامیة: احترز بالحربی عن المسلم الاصلی والذمی“ (ایضاً)۔

یا اس مسلمان سے ہو جو دارالہرب میں اسلام لایا ہو اور ہجرت نہ کیا ہو۔

”وحکم من اسلم فی دار الحرب لم یہاجر کحربی فللمسلم الربا معہ

خلافاً لہما“ (المصدر السابق)۔

یہ تو اصل مسئلہ ہوا۔ اب سب سے اہم بات اس کو ہندوستان پر منطبق کرنے کی ہے۔ بعض حضرات اگرچہ اس سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان میں انشورنس اور سود کے جواز پر فتویٰ دیتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان پر اس کو منطبق کرنا سخت ترین دشوار بات ہے۔ حضرات فقہاء کرام کی ان تصریحات سے یہ واضح ہو گیا کہ دارالہرب میں عقود فاسدہ مثل ربا و قمار اسی وقت جائز ہیں جبکہ ان کا نفع مسلمان کو حاصل ہو، ورنہ جائز نہیں۔ اب اس پر غور کیجئے کہ انشورنس میں جو قمار ہوتا ہے اس کا نفع کبھی مسلمان کو ہوتا ہے جو اس میں شریک ہے، جبکہ مدت مقررہ سے پہلے بیمہ شدہ شخص وشی ہلاک ہو جائے، اور کمپنی کو نفع ہوتا ہے جبکہ مدت مقررہ کے بعد ہلاک ہو۔

ایسی صورت میں انشورنس کی اجازت دارالہرب میں عقود فاسدہ کے جواز کی صورت میں بھی نہیں مل سکتی۔ الغرض ہندوستان میں امام اعظمؒ کے مسلک پر بھی اس کے جواز کا مسئلہ نہایت مشکل ہے۔ اس کے علاوہ احتیاط کے بھی خلاف ہے۔ لہذا جمہور کی رائے کے مطابق عدم جواز پر ہی فتویٰ دینا چاہئے۔

### نجی کمپنیوں اور حکومتی اداروں میں فرق:

سودی کاروبار یا قمار، نجی کمپنیاں کرتی ہوں یا حکومتی ادارے، مسئلہ دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوگا۔ اس میں کوئی فرق نہیں ہے، لہذا ہر صورت میں انشورس کا معاملہ ناجائز ہوگا۔ حادثہ کی صورت میں جو رقم حکومت کا یہ ادارہ دے گا، اس کو امداد کہا جاسکتا ہے، حضرت مولانا محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں:

”ایک فرق (حکومتی ادارے اور نجی کمپنیوں میں) سامنے رکھنا ضروری ہوگا کہ حادثہ کی صورت میں جو رقم حکومت سے ملے گی اس کو حکومت کا عطیہ قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ ایسے حالات میں امداد کرنا عموماً حکومتوں کی ذمہ داری سمجھا جاتا ہے“ (جواہر الفقہ ۱۸۶/۲)۔

مگر ربوا کا جو معاملہ، اسی طرح قمار کا جو معاملہ انشورس میں ہے وہ بہر حال ناجائز ہوگا، لہذا اس میں شرکت جائز نہیں ہوگی اور نہ ہی سود کی وہ رقم جائز ہوگی جو حکومتی ادارہ اس معاملہ میں دے گا۔

### ایک علمی مغالطہ:

سوالنامہ میں پوچھا گیا ہے کہ اگر یہ کاروبار حکومت کے ہاتھ میں ہو تو کیا اس بنیاد پر کہ خزانہ حکومت میں رعیت کے ہر فرد کا حق ہوتا ہے، زیر بحث معاملہ میں سود کی رقم عطیہ قرار پا کر ربوا کے حدود سے خارج ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اور کیا اس صورت میں یہ معاملہ جائز ہو سکتا ہے؟

میں کہتا ہوں کہ غالباً یہ مسئلہ اس بنیاد پر اٹھایا گیا ہے کہ کتب فقہ میں تحقق ربوا کی جو شرائط بیان کی گئی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ بدلیں مال مشترک نہ ہو، جس میں یہ معاملہ کرنے والے ”بشرکت عنان“ یا ”بشرکت مفاوضہ“ شریک ہوں۔ علامہ شامی نے لکھا ہے:

”قال فی الشرنبلالیة ومن شرائط الربا عصمة البدلین وکونہما مضمونین بالاتلاف۔ الیٰ ان قال۔ ومنها ان لا یكون البدلان مملوکیں لأحد

المتبايعين كالسيد مع عبده ولا مشتركين منهما بشركة عنان أو مفاوضة كما  
فی البدائع“ (شامی ۱۶۸/۵)۔

تو جیسے عنان و مفاوضہ کے دو شریک کے درمیان ربوا تحقق نہیں ہوتا، اسی طرح  
یہاں بھی چونکہ حکومت کا خزانہ مشترک ہے، اس لئے یہاں بھی ربوا کا تحقق نہ ہونا چاہئے۔  
مگر یہ ایک مغالطہ ہے، اولاً: اس لئے کہ خزانہ حکومت میں رعیت کی شرکت پر، شرکت  
عنان اور مفاوضہ کی تعریف صادق نہیں آتی اور یہ عدم تحقق ربوا اسی صورت میں ہے جبکہ ”شرکت  
مفاوضہ و عنان“ ہو۔

شرکت مفاوضہ کی تعریف ”ہدایہ“ میں یہ کی گئی ہے:

” أما شركة المفاوضة فهي أن يشترك الرجلان في تساويها في مالهما  
وتصرفهما ودينهما. ولا يجوز بين المسلم والكافر ولا بين الصبي والبالغ“  
(ہدایہ ۶۰۵/۲)۔

غور کر لیا جائے کہ یہ تعریف خزانہ حکومت میں رعیت کی شرکت پر صادق بھی آتی ہے یا  
نہیں، اور شرکت عنان یہ ہے کہ:

” أما شركة العنان فتعقد على الوكالة دون الكفالة وهي أن يشترك  
اثنان في نوع بزأوطعام ويشتركان في عموم التجارات ولا يذكران الكفالة“  
(ہدایہ ۶۰۹/۲)۔

ظاہر ہے کہ یہ تعریف بھی اس پر صادق نہیں آتی، پھر اس سے قطع نظر مال شرکت میں  
عدم تحقق ربوا کا مسئلہ اس وقت ہے جبکہ ربوا کا معاملہ کرنے والے صرف اسی مال سے معاملہ کریں  
اور اگر ایک طرف مال شرکت ہو، اور دوسری طرف مال شرکت نہ ہو تو یہ مسئلہ نہیں ہے، چنانچہ  
علامہ ابن نجیم مصری نے لکھا ہے:

” وأشار المصنف إلى انه لا ربوا بين المتفاوضين وشريكي العنان اذا

تبايعا من مال الشركة وان كان من غيره جرى بينهما“ (المحرق ۱۳۵/۶، نیز شامی ۱۸۵/۵-۱۸۶)۔

الغرض ”شركت مفاوضه وعنان“ کا سہارا لے کر خزانہ حکومت سے سود لینے، یا اس کو دینے کا مسئلہ پیدا کرنا محض غلط ہے۔

حاصل یہ ہے کہ خزانہ حکومت میں ہر فرد رعیت کا حق تو بلاشبہ ہے، مگر صرف حق کے ثابت ہونے سے مال کا مشترک ہونا ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ ملکیت اس کے لئے ضروری ہے اور یہاں ملکیت ثابت نہیں، لہذا اس میں ربا جاری ہوگا۔

### انشورنس کے سود کے مصارف:

اگر کاروبار حکومت کے ہاتھ میں ہو اور اس سے حاصل ہونے والا سود ٹیکس میں دیا جائے، یا ان کاموں میں لگا دیا جائے جو حکومت کے ذمہ واجب ہیں یا ایسے کاموں پر لگا دیا جائے جو حکومت کے ذمہ تو نہیں ہیں، مگر حکومت سے ان میں امداد لی جاتی ہے اور حکومت ان میں امداد بھی کبھی کر دیتی ہے تو کیا انشورنس کا یہ معاملہ جائز ہوگا؟۔

یہاں دو مسئلے الگ الگ ہیں، ایک یہ کہ ان مصارف کے لئے انشورنس میں حصہ لینا، دوسرے حصہ لینے کے بعد اس سود کو ان مصارف میں خرچ کرنا۔

جہاں تک دوسرے مسئلہ کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ وہ صرف مصارف کا سوال ہے، لہذا اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کسی نے غلطی سے انشورنس کا معاملہ کر لیا اور اس کے نام سود کی رقم آگئی تو یہ شخص اس سود کی رقم کو:

۱- ٹیکس میں (اس ٹیکس میں جو حکومت رعایا سے ظلماً وصول کرتی ہے، جیسے انکم ٹیکس

وغیرہ)۔

۲- اور ان کاموں میں دے سکتا ہے جو حکومت کے ذمہ سمجھے جاتے ہیں۔

اور وہ کام جو حکومت کے ذمہ نہیں ہیں ان میں لگانا درست نہ ہوگا، کیونکہ یہ شخص اپنے

سود کی رقم ایک ایسے کام میں لگا رہا ہے جس کا نفع ہر کس و ناکس کو پہنچتا ہے، خواہ امیر ہو یا غریب، حالانکہ اس رقم کا مصرف امیر لوگ نہیں ہو سکتے، کیونکہ حرام مال کے سلسلے میں فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اس کو صدقہ کرنا واجب ہے، اور صدقہ کی حقیقت ہے ”تملیک المال من الفقیر“ (فتح القدیر ۲۰۱۲)۔

لہذا غیر فقیر کو اس مال سے نفع پہنچایا نہیں جاسکتا، اور پہلی دو صورتوں (ٹیکس اور حکومت کے ذمہ واجب کاموں) میں اس مال کو دینے کا جواز اس پر ہے کہ سود کی رقم میں یہ حکم رکھتی ہے کہ اس کو واپس لوٹا دیا جائے۔ لہذا واپس لوٹانے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اس کے ذمہ جو کام ہے وہ اس سے کر دیا جائے یا وہ ظلماً جو وصول کر رہا ہے اس میں اس کو دے دیا جائے، الغرض ٹیکس میں یا حکومت کے ذمہ واجب کاموں میں خرچ کر دینا اس رقم کا جائز ہوگا۔ اور حکومت کے غیر واجب کاموں میں صرف کرنا جائز نہ ہوگا۔

اسی طرح فقراء پر خرچ کرنا بھی جائز ہوگا کہ وہ اس کا مصرف ہیں۔

”کما هو ظاهر لان الصدقة هی تملیک المال من الفقیر کما مر“۔

مگر اس میں ثواب کی نیت جائز نہ ہوگی، کیونکہ حرام مال کو خرچ کرنے میں ثواب نہیں

ہو سکتا۔

یہ تو دوسرے مسئلہ سے متعلق کلام تھا اور پہلے مسئلہ کے متعلق تفصیل یہ ہے کہ ان

مصارف میں خرچ کرنے کے لئے انشورس کا معاملہ کرنا بعض صورتوں میں جائز ہے۔

۱۔ ٹیکس میں ادا کرنے کے لئے (مراد وہ ٹیکس ہے جو حکومت ظلماً لیتی ہے)

۲۔ حکومت کے ذمہ واجب کاموں میں۔

اور ان صورتوں میں جائز ہے:

۱۔ ایسے کاموں میں خرچ کرنے کے لئے جو حکومت کے ذمہ واجب نہیں ہیں۔

۲۔ فقیروں اور محتاجوں کو دینے کے لئے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ ”رسالہ بیمہ زندگی“ میں لکھتے ہیں:

(الف) یہ صورت جائز ہے کہ حکومت کی طرف سے جو غیر شرعی ٹیکس عائد ہیں ان کو ادا کرنے کے لئے حکومت ہی سے اس کے قانون کے مطابق کوئی رقم حاصل کر لی جائے، خواہ اس کے حصول کا ذریعہ ربوا کے عنوان کے تحت آتا ہو، مگر شرط یہ ہے کہ صرف اتنی ہی رقم وصول کی جائے جتنی حکومت کے غیر شرعی ٹیکسوں میں دینی ہے۔

(ب) از روئے قواعد تو اس کی (یعنی حکومت کے ذمہ واجب کاموں میں خرچ کرنے کے لئے انشورنس کے ذریعہ سود لینا) بھی گنجائش ہے۔ مگر انفرادی طور پر عملاً ایسا ہونا مشکل ہے، اس کا نتیجہ پھر یہی ہوگا کہ اس رقم کو صرف کرنے والے اس سے اپنے مفاد بھی حاصل کریں گے جو ناجائز ہے، ہاں کسی ایسے ادارہ کو یہ رقم سپرد کر دی جائے جو ذمہ داری کے ساتھ انہیں کاموں میں صرف کر دے جن کے پورا کرنے کی ذمہ داری حکومت پر تھی، مگر حکومت کسی وجہ سے اس کو پورا نہیں کر رہی ہے۔ تو اس صورت میں مضائقہ نہیں۔

(ج) جو کام حکومت کی ذمہ داری اور فرائض میں داخل نہیں، کبھی تبرّ عا حکومت بھی کر دیتی ہے، ان کاموں میں صرف کرنے کے لئے حکومت کی بیمہ پالیسی سے کسی ناجائز طریقہ پر رقم حاصل کرنا جائز نہیں ہو سکتا، کیونکہ جواز کی علت اس تاوان سے چننا ہے جو حکومت کی طرف سے غیر شرعی طور پر عائد کیا گیا ہو، وہ علت صورت (ج) میں مفقود ہے۔  
صدقہ کرنے کی نیت سے سود یا قمار کی رقم حاصل کرنا جائز نہیں ہو سکتا۔ الخ (جواہر

الفقہ ۱۸۷/۲)۔

ایک قابل توجہ امر:

یہ تو فی حد ذاتہ مسئلہ کی توضیح ہوئی، مگر یہاں ایک بات نہایت ضروری اور قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ مذکورہ بنیاد پر بعض صورتوں میں انشورنس کے معاملہ کی گنجائش دی جائے گی اور عوام الناس کو اس کے جواز کا فتویٰ دیا جائے گا تو عوام الناس نہ اس کی بنیاد کو دیکھیں گے اور نہ

جواز کے حدود و قیود اور شرائط کو، بلکہ ان سب سے قطع نظر صرف ”جواز“ کے الفاظ کا سہارا لے کر مطلقاً انشورنس کے جواز پر مصر ہوں گے، اور ہر قسم کے انشورنس میں بلا قیود شرط شریک ہو جائیں گے، جیسا کہ عوام کی عادت سے ظاہر ہے۔

اس لئے احتیاط اور عوام کی خیر خواہی کا تقاضا یہی ہے کہ اس معاملے کو مطلقاً ناجائز قرار دیا جائے، تاکہ عوام کسی معصیت میں مبتلا نہ ہوں۔

### انشورنس کی متبادل شرعی شکل:

اب سب سے اہم سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جب انشورنس کی مروجہ صورت ”سود و قمار“ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز ٹھہری تو اس سے منسلکہ مصالح و منافع جو شرعاً بھی ناقابل التفات نہیں ہیں، ان کو حاصل کرنے کے لئے اس کی متبادل صورت کیا ہو سکتی ہے جس میں کوئی شرعی مخطور لازم نہ آئے؟۔

بلاشبہ یہ سوال فی نفسہ بھی اور آج کے ماحول و معاشرے کے اعتبار سے بھی نہایت اہم اور ناقابل فراموش ہے، آج کسی چیز کے بارے میں عدم جواز کا فتویٰ دے دینا کافی نہیں ہے کہ یہ کبھی لوگوں کو بے اطمینانی کی کیفیت سے دوچار کر دیتا ہے اور کبھی ارتداد کی طرف لے جاتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ حضرات علماء اس پر غور کریں:

۱- اسلام میں سرمایہ کے تحفظ اور اس میں اضافہ کے لئے بیع کی شکل موجود ہے جو ربوا کے بالمقابل تجویز کی گئی ہے، پھر اس کی متنوع شکلوں میں سے ”مضاربت اور شرکت“ بڑے منافع و مصالح پر مشتمل ہیں۔

۲- حوادث میں جانی و مالی نقصانات کی تلافی کے لئے اسلام میں تعاون علی الخیر اور امداد باہمی کی مختلف شکلیں شروع ہیں۔

۳- پسماندگان کے تحفظ و بقاء کے لئے وراثت و وصایت کے قوانین موجود ہیں، معاقل کا نظام بھی مقتول کے پسماندگان کے تحفظ و بقاء کا ذریعہ ہے۔

لہذا انشورنس کے جو مصالح ہیں، سرمایہ کا تحفظ، اس میں اضافہ، امداد باہمی، حوادث میں نقصان کی تلافی اور پسماندگان کا تحفظ و بقاء وہ سب اسلامی نظام کے مطابق مذکورہ شکلوں کو رائج کر کے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

اور ان میں سے بعض چیزوں کو انشورنس کمپنی میں شامل کر کے بھی، ان مصالح کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً:

۱- انشورنس کمپنی بیمہ کے طالبوں سے جو رقم قسط وار وصول کرتی ہے اس کو مضاربت و شرکت کے اسلامی اصولوں پر تجارت میں لگائے اور اس سے نفع لے کر کمپنی اور طالب بیمہ قواعد کے مطابق تقسیم کر لیں اور نقصان سے بچنے کے لئے اس کی نگرانی اچھی طرح کی جائے۔

۲- نیز طالب بیمہ سے ایک معتد بہ رقم باہمی امداد و تعاون اور حوادث میں نقصان کی تلافی کے وعدہ پر الگ سے وصول کرے اور یہ رضا مندی سے ہو اور اس رقم سے صرف ان کی امداد کی جائے جو کمپنی کے حصہ دار ہیں اور اس معاہدہ کے پابند بھی۔

اور اس کے لئے مناسب قواعد و قوانین ماہرین معاشیات و علماء شریعت کو جوڑ کر بنائے جائیں اور پوری درد مندی و دل سوزی کا جذبہ لے کر کام کیا جائے، صرف تجارت مقصود نہ ہو، تو کوئی وجہ نہیں کہ اس طرح کا نظام نہ بن سکے۔

### خلاصہ بحث:

سہولت کے لئے اوپر کے تمام مباحث کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے کہ انشورنس کی مروجہ شکل دو منوعات کا مجموعہ ہے کہ اس کی ابتداء قمار سے ہوتی ہے اور انتہا سود پر، اور ان میں سے ہر گناہ بجائے خود اس کے ناجائز ہونے کے لئے کافی ہے تو دو گناہوں کا مجموعہ ہونے کی بنا پر اس کی حرمت مزید ہو جاتی ہے، لہذا یہ ناجائز ہے۔

اور اس میں انٹرسٹ کے نام سے جو اضافی رقم دی جاتی ہے وہ بلاشبہ شرعی ربوا ہے اور یہ کہنا کہ ربوا شرعی وہ ہے جو بیع میں ہوتا ہے، اور قرض میں زیادتی شرعی ربوا نہیں، یہ صریح دھوکہ



ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں جس طرح بیع کی بعض صورتوں میں ربوا کا تحقق ہوتا ہے اسی طرح قرض پر زیادتی میں بھی ربوا کا تحقق ہوتا ہے، بلکہ جاہلیت میں قرض پر زیادتی والا سود ہی رائج تھا، جیسا کہ ائمہ تفسیر و حدیث نے صراحت کی ہے، لہذا انشورنس میں قرض پر جو زیادتی ملتی ہے وہ شرعی ربوا ہے۔

اسی طرح یہ کہنا کہ شخصی ضروریات پر قرض لینے کی صورت میں اس پر جو زیادتی ہوتی ہے وہ حرام ہے اور کاروباری قرضوں میں فرق نہیں کیا ہے، پھر کہنے والوں نے جس بات کو اس کی بنیاد بنایا ہے وہ بھی غلط و بے بنیاد ہے، وہ یہ کہ جاہلیت میں صرف شخصی حاجات کے لئے قرض کا رواج تھا اور قرآن نے اسی سے منع کیا ہے، حالانکہ قرآن و شواہد پوری صفائی کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ خود عرب جاہلیت میں بھی اور اس کے بعد بھی کاروباری و تجارتی اغراض کے لئے قرض لیتے اور دیتے تھے، لہذا ان دونوں میں فرق کرنا نرا جہل ہے جس کا قرآن و حدیث سے کوئی واسطہ نہیں، الغرض انشورنس کے معاملے میں ضرور ربوا شرعی موجود ہے۔

پھر اس میں ربوا دو طرح پایا جاتا ہے، ایک طالب بیمہ اور بیمہ کمپنی کے درمیان کہ کمپنی طالب بیمہ کو اس کی جمع شدہ رقم پر سود دیتی ہے، دوسرے کمپنی اس طالب بیمہ کی جمع کردہ رقم کو دوسرے حاجت مندوں کو دے کر ان سے سود لیتی ہے اور یہ دونوں صورتیں ناجائز و ممنوع ہیں۔

رہے اس کے مصالح تو ان مصالح کی وجہ سے اس حرام و ناجائز چیز کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ مصالح کا اعتبار وہاں ہوتا ہے جہاں شریعت کے مقاصد و مصالح فوت نہ ہوتے ہوں اور یہاں بلاشبہ ان مصالح کے اعتبار کرنے اور اس معاملے کو جائز قرار دینے سے مقاصد شریعت اور مصالح شریعت فوت ہوتے ہیں، پھر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اس میں کچھ مصلحتیں ہیں تو مفاسد بھی موجود ہیں اور صرف ظاہری و جسمانی نہیں، روحانی و باطنی بھی، حسد، کینہ، بغض و عداوت جیسی مہلک بیماریاں اس سے جنم لیتی ہیں اور پھر قتل و غارتگری، لوٹ، مارا اور دھوکہ و فریب دہی پر ختم ہوتی ہیں، ایسے حالات میں اس کے مصالح پر نظر کر کے اس کے جواز کا حکم کسی طرح نہیں کیا جاسکتا۔

اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اس معاملے کے ناجائز ہونے کی ایک وجہ تو سود پر اس کا مشتمل ہونا ہے، دوسرے قمار (جوئے) کا ہونا ہے، کیونکہ اس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ فلاں شخص یا مشی (جس کا بیمہ ہوا) اگر مدت مقررہ کے اندر ہلاک ہو جائے تو اتنی رقم ملے گی اور اگر مدت مقررہ کے بعد ہلاک ہو تو اتنی رقم ملے گی اور شریعت میں کسی معاملے میں نفع و نقصان کو غیر معین اور مبہم بات پر معلق کرنے کو ہی قمار کہتے ہیں، لہذا یہ شرط چونکہ غیر معین بات کی ہے جس پر نفع و نقصان کو معلق رکھا گیا ہے، اس لئے یہ قمار کی حدود میں اس کو داخل کر دیتی ہے اور قمار بھی بہ نص قطعی حرام ہے۔ اور چونکہ انشورنس کی مروجہ شکلوں میں سے زندگی کے اور املاک کے اور ذمہ داریوں کے بیمہ میں یہ دونوں حرام و ممنوع امور موجود ہیں، اس لئے ان سب شکلوں کا ایک ہی حکم ہوگا، یعنی یہ سب صورتیں حرام ہوں گی، البتہ کاغذات و سندات کا بیمہ چونکہ ان ممنوعات سے خالی ہے اس لئے اس کی اجازت ہوگی اور یہ ”ودیعتہ بالاجرة“ کے حکم میں ہوگی۔

اور چونکہ یہ معاملہ سود اور قمار دونوں پر مشتمل ہے، اس لئے اگر کوئی شخص سود نہ لے تو بھی اس میں شرکت کی اجازت نہ ہوگی، کیوں کہ ایک وجہ حرمت کے نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسری بات حرمت کی نہ ہو، پھر اگر یہ شخص سود نہ لینے کے گناہ سے بری ہو بھی گیا تو اس سودی کاروبار کرنے والی کمپنی کے تعاون کا گناہ تو اس پر باقی رہا، اس لئے سود نہ لینے کی صورت میں بھی اس میں شرکت کی اجازت نہ ہوگی۔

اور دارالحرب میں سود اور عقود فاسدہ کے جواز و عدم جواز کا مسئلہ چونکہ اختلافی ہے، اس لئے اس اصل مسئلہ کے بارے میں فیصلہ تو دشوار ہوگا، البتہ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مجوزین کے مسلک پر بھی کیا ہندوستان میں سود و قمار کی اجازت ہوگی؟ اس سلسلے میں احقر کی رائے یہ ہے کہ اجازت نہ ہوگی۔ اولاً: اس لئے کہ ہندوستان کا دارالحرب ہونا مسلم نہیں ہے اور یہ جواز مشروط ہے اس سے کہ یہ معاملہ دارالحرب میں ہو، ثانیاً: اس لئے کہ یہ جواز اس وقت ہے جبکہ سود و قمار کی رقم مسلمان کو ملے، اگر کافر کو ملے تو مسلمان کو ایسے معاملے کی اجازت خود مجوزین کے

پاس بھی نہیں ہے اور ہندوستان میں انشورنس کا معاملہ کرنے میں کبھی نفع مسلمان کو ہوگا اور کبھی کمپنی کو، جس میں کفار ہوتے ہیں، لہذا یہ ناجائز ہے، پھر جواز پر فتویٰ احتیاط کے بھی خلاف ہے۔

پھر انشورنس کا معاملہ اور کاروبار نجی کمپنیوں کے ہاتھ میں ہو یا حکومت کے ہاتھ میں، بہر حال قمار و سود پر اشمال کی وجہ سے یہ حرام ہی ہوگا۔ البتہ حوادث کی صورت میں جو رقم حکومت کی طرف سے ملے اس کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے، مگر سود و قمار تو ہر صورت میں حرام ہی ہوں گے اور حکومت کے ہاتھ میں کاروبار ہونے سے اس سے سود و قمار کا معاملہ جائز نہ ہوگا، اور اس میں یہ تاویل کرنا کہ حکومت کے خزانہ میں چونکہ ہر ایک کا حق ہوتا ہے، لہذا وہ مشترک مال ہے اور مال مشترک میں ربو اجاری نہیں ہوتا، صریح دھوکہ اور بڑا مغالطہ ہے، جیسا کہ اصل مقالے میں اس پر بحث کی گئی ہے۔

پھر ٹیکس یا ایسے کاموں میں لگانے کے لئے جو حکومت کے ذمہ لازم ہوتے ہیں، اس معاملے میں شرکت قواعد کی رو سے جائز معلوم ہوتی ہے، تاہم اس پر فتویٰ دینا احتیاط کے خلاف ہے اور صدقہ خیرات کرنے یا حکومت کے غیر واجبی کاموں میں لگانے کے لئے اس میں شرکت ناجائز ہوگی۔

اور وہ مصالحوں و منافع جو انشورنس سے حاصل ہوتے ہیں ان کی تحصیل کے لئے شرکت و مضاربت کے شرعی اصولوں اور امداد باہمی کے اداروں کو قائم کرنا چاہئے۔

## انشورنس.....ملک کی موجودہ صورتحال میں

مولانا محمد امین مبارکپوری

اسلام ایک ایسا اعلیٰ مکمل اور ہمہ گیر نظام حیات اور دستور العمل ہے جو سراسر عدل و اعتدال اور حکم و مصالح پر مبنی ہے، اور اس میں انسانی فطرت سے مکمل آہنگی اور انسانی مصالح، ضرورتوں، کمزوریوں اور مجبوریوں کی مکمل رعایت موجود ہے، اور مختلف احوال و ظروف کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، اسلامی شریعت کی بنیاد ہی نوع انسانی کی مادی، روحانی اور دنیوی و اخروی مصلحتوں پر رکھی گئی ہے، اور کیوں نہ ہو، یہ کسی محدود ناقص علم و بصیرت رکھنے والے نہیں، بلکہ اس خالق کائنات کے تشکیل کردہ ہیں جو ہمہ داں، وہمہ بین، رحمن و رحیم، علیم و حکیم اور سمیع و بصیر ہے، جس کے لئے خفی و جلی، ظاہر و باطن سب یکساں ہیں، جو انسانی تمام کمزوریوں، نارسائیوں اور جملہ میلانات و رجحانات سے پورے طور پر باخبر ہے، اور جس کا علم خیر و شر، صلاح و فساد اور نفع و ضرر کے تمام پہلوؤں اور ان کے کم و کیف کو محیط ہے، چنانچہ علامہ ابن القیمؒ اعلام الموقعین میں تحریر فرماتے ہیں:

شریعت کی بنیاد و اساس حکمتوں اور بندوں کی دنیوی و اخروی مصالح پر ہے وہ سراپا عدل و مجسمہ حکمت و مصلحت ہے، اس لئے جو مسئلہ بھی عدل سے ظلم کی طرف، رحمت سے زحمت کی طرف، مصلحت سے مضرت کی طرف اور حکمت سے عبث کی طرف خروج کرے وہ مسئلہ شریعت کا مسئلہ نہ ہوگا، اگرچہ تاویل کے ذریعہ اس میں داخل کر دیا گیا ہو۔

شریعت مطہرہ اگر ایک طرف انسان کو کچھ حدود و ضوابط کی پابند کرتی ہے تو دوسری طرف اس کی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے ایسے اصول و قوانین وضع کرتی ہے جن پر عمل پیرا ہونا دشوار و مشکل نہ ہو، تمام احکام شرعیہ میں نرمی اور بندوں کی سہولت کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر نہایت صراحت و وضاحت سے اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے۔

”يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ“ (سورۃ بقرہ ۱۸۵)۔

(اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں)۔

### انشورس اور ضرورت شدیدہ:

جن خطرات اور مشکلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوالنامہ میں انشورس کے عدم جواز کے باوجود اس کے کرانے اور نہ کرانے کی بحث اٹھائی گئی ہے کیا وہ خطرات و مشکلات ضرورت شدیدہ کی تعریف میں داخل بھی ہیں یا نہیں؟ اگر وہ ضرورت شدیدہ و اضطرار کی تعریف میں داخل اور ان میں اس کے تمام شرائط و قیود پائے جاتے ہیں تو اس کے جواز کا حکم ہوگا، اور اگر وہ اس کی تعریف اور اسکی شرائط سے خارج ہے تو اس کے جواز کا حکم نہیں دیا جائے گا، لہذا پہلے اس کی تعریف اور اس کے شرائط و قیود کا علم ضروری ہے تاکہ اس کی روشنی میں باسانی حکم لگایا جاسکے۔

قرآن کریم میں ارشاد باری عز اسمہ ہے:

”فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ“ (سورۃ بقرہ: ۱۷۳)۔

”فَمَنْ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرٍ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ“

(سورۃ مائدہ)۔

پھر جو شخص بیتاب ہو جائے بشرطیکہ نہ تو طالب لذت ہو اور نہ حد سے تجاوز کرنے والا ہو تو اس شخص پر کچھ گناہ نہیں۔

پس جو شخص شدت کی بھوک میں بیٹاب ہو جائے بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو تو اللہ تعالیٰ بخش دینے والا مہربانی کرنے والا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ جو اہر الفقہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

قرآن کریم کی آیات بالا مذکورہ میں جس طرح کی ضرورت اور جن شرائط کے تحت کسی حرام کو مباح قرار دیا گیا ہے وہ خود قرآنی دلالت و اشارات کی رو سے یہ ہیں۔

۱- جان بچانے کے لئے جائز صورت نہ رہے۔

۲- ناجائز، حرام چیز کے استعمال سے جان بچ جانا یقینی ہو تو اس صورت میں حرام چیز کا

استعمال جائز ہو جاتا ہے۔

لیکن ان شرائط و قیود کی پوری پابندی ضروری ہے جن کے تحت قرآن کریم کا یہ فیصلہ ہے، عوام بلکہ بہت سے پڑھے لکھے لوگ بھی اس معاملہ میں اکثر غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ ہر انسانی حاجت کو وہ ضرورت و اضطرار کا درجہ دیدیتے ہیں، حالانکہ اصطلاح قرآن میں ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔

ہمیں غور کرنا ہے کہ ملک کی موجودہ صورت حال میں کیا فسادات کا ہونا قطعی اور یقینی ہے، نیز اگر انشورنس، یعنی بیمہ زندگی کی اجازت دیدی جائے اور لوگ کرا بھی لیں تو کیا اس سے جان کا بچ جانا بھی حتمی اور یقینی ہے، اور کیا اس کے علاوہ کوئی دوسرا حل اور علاج کی صورت نہیں ہے۔

تو احقر جہاں تک سمجھتا ہے یہ تمام چیزیں یعنی فسادات کا ہونا، اور انشورنس کرا لینے کے بعد جان کا بچ جانا موہوم کے درجہ میں ہے، فسادات کا ہونا بھی ایک موہوم چیز ہے، یقیناً وہ قطعی اور یقینی نہیں، خواہ ان کے امکانات اور خوف کتنے زیادہ ہوں، نیز انشورنس اور بیمہ زندگی کرا لینے کے بعد جان کا بچ جانا بھی کوئی قطعی اور یقینی بات نہیں، یہ محض خیال اور وہم ہے، تیسرے یہ کہ اس سے بچاؤ کی اس کے علاوہ دوسری سبیل اور راستے موجود ہیں، صرف یہی ایک راستہ نہیں۔ اور اگر اس کو مان بھی لیا جائے کہ یہی صرف ایک راستہ ہے تو یہ راستہ بھی موہوم ہی ہے قطعی اور یقینی نہیں۔

لہذا نص قطعی کے ہوتے ہوئے ایک شئی موہوم، اور اس کے علاج موہوم اور حل موہوم کی بنا پر ایک ناجائز و حرام چیز کے جواز کا حکم دینا صحیح اور درست نہیں۔ جن حضرات کی املاک فسادات کی نذر ہو جاتی ہیں اور اس کے نتیجہ میں ان کو دوبارہ از سر نو کاروبار شروع کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو یہ صورت بھی اضطرار اور ضرورت شدیدہ کے اندر داخل نہیں، کیونکہ اس کی وجہ سے جان کا ضائع ہونا یقینی اور لازمی نہیں، بلکہ زیادہ سے زیادہ دوبارہ کاروبار شروع کرنے میں مشکلات اور دشواریاں پیش آتی ہیں، تو آدمی کوئی معمولی کاروبار یا محنت و مزدوری کر کے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی پرورش کر سکتا ہے، کیا ضروری ہے کہ اعلیٰ پیمانہ پر کاروبار کرے جبکہ اس کے لئے ایسے امر حرام کا ارتکاب کرنا پڑے جو نص قطعی سے ثابت ہے۔

لہذا ان پیچیدگیوں اور مشکلات کی وجہ سے جواز ”بیمہ زندگی“ کا حکم نہیں دیا جاسکتا۔

## جواب - ۲:

مدت پوری ہونے سے قبل انتقال ہو جانے کی صورت میں جمع کردہ رقم سے زائد رقم، نیز مدت پوری کر لینے کی صورت میں بالاقساط جمع کردہ رقم، نیز اس کے ساتھ زائد رقم جو کمپنی دیتی ہے وہ سود ہے، وہ ان کے ورثا یا جمع کرنے والے کے لئے حرام ہے، وہ غرباء و مساکین اور محتاجین میں بلا نیت ثواب تقسیم کر دی جائے، یا رفاہ عام کے کاموں میں صرف کر دی جائے، سودی رقم کو انتہائی درجہ کی مجبوری اور اضطراری حالت کے بغیر اپنے استعمال میں لانا ناجائز اور حرام ہے، جیسا کہ فتاویٰ کی عام کتابوں میں یہ مسئلہ مذکور ہے، اوپر کے بیان سے معلوم ہو چکا ہے کہ انشورنس کی اجازت نہیں، لہذا اگر اضطراری اور ضرورت شدیدہ کی صورت میں بیمہ کرایا ہے تو مذکورہ بالا رقم کا وہ حکم ہوگا۔

۳- فسادات کی صورت میں جان و مال کی ہلاکت و ضیاع پر بیمہ کمپنی ہولڈر کی طرف سے

جمع کردہ رقوم سے زائد متاثرین و مستحقین کو دے تو اس رقم کو معاوضہ جان نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس کا معاوضہ ہلاک کرنے والوں کے ذمہ ہے، نہ کہ دوسروں کے، لہذا اس کو جان و مال کا معاوضہ نہیں تصور کیا جاسکتا، کیونکہ کمپنی اپنے سابقہ معاہدہ معاملہ اور ان سے قسط وار رقم وصول کرنے کی وجہ سے ان کے ورثہ کو وہ رقم ادا کرتی ہے، نہ کہ بطور دیت اور معاوضہ ہلاکت جان و مال ادا کرتی ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر ایک ہلاک ہونے والے اشخاص کے ورثہ کو دیتی، البتہ اس کے برعکس حکومت ہر ہلاک ہونے والے اشخاص کے ورثہ کو معاوضہ جان وغیرہ ادا کرتی ہے، جان و مال کے ضیاع کا معاوضہ تو حکومت خود کبھی علیحدہ ادا کرتی ہے۔

۴- اگر ملازمین کو حکومت انشورنس کرانے پر مجبور کرتی ہے تو یہ بھی جائز نہیں کہ حصول ملازمت کے لئے انشورنس کرایا جائے، بہترے لوگ ملازمت چھوڑ کر محنت و مزدوری کر کے اپنی اور اپنے بال بچوں کی پرورش کرتے ہیں، انہیں بھی چاہئے کہ اس پر عمل درآمد کریں، اللہ تعالیٰ رزاق اور روزی رساں ہے قرآن حکیم میں ہے:

”وَمَا مِنْ ذَاتِ بِيَةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا“ (سورہ ہود: ۶)۔

حدیث شریف میں ہے:

”ان العبد له رزقه فلو اجتمع عليه الثقلان الجن والأنس ان يصد عنه

شيئاً من ذلك ما استطاعوا“ (ترغیب و ترہیب ۲/۵۳۷)۔

نیز دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”ان روح القدس نفث في روعي ان نفساً لن تموت حتى تستكمل

رزقها، ألا فاتقوا الله واجملوا في الطلب، ولا يحملنكم استبطاء الرزق على أن

تطلبوه بمعاصي الله، فإنه لا يدرك ما عند الله إلا بطاعته“ (مشکوٰۃ ۲/۴۵۲)۔

لیکن اگر جان جانے کا یقین ہو تو ایسی صورت میں بیمہ زندگی کرا سکتا ہے، جیسا کہ

درمختار میں ہے:

”وان اكره بملجى بقتل أو قطع حل الفعل انتهى مختصراً“ (درمختار ۵/۱۲۷)۔



۵- اگر مذکورہ بالا جبری بیمہ کی صورت میں ملازم کی تنخواہ سے بغیر ملازم کے حوالہ کئے خود حکومت وضع کر کے جمع کر لیتی ہے تو ایسی صورت میں وہ رقم پراویڈنٹ فنڈ کی طرح اس کے لئے جائز ہوگی، جیسا کہ یہ مسئلہ کتب فتاویٰ میں مذکور ہے (ملاحظہ ہو امداد الفتاویٰ ۱۳۹۳، کفایۃ المفتی ۱۴/۹۳، نظام الفتاویٰ ۲۱۳) اور اگر ملازم کو پوری پوری تنخواہ حوالہ کر دی جائے اس کے بعد ملازم خود اپنے ہاتھوں اس رقم کو جمع کرے تو اس صورت میں یہ جائز نہیں، بلکہ اس کے حق میں وہ ملنے والی رقم سود ہوگی جو اس کے لئے درست اور حلال و جائز نہیں۔

۶- تجارتی سامان کے انشورنس کرنے والے کو حادثہ کے پیش آجانے کی صورت میں جمع شدہ رقم سے زائد ملنے والی رقم سود کا حکم رکھتی ہے۔

اور یہ صورت جائز بھی نہیں، کیونکہ حکومت اس انشورنس پر مجبور بھی نہیں کرتی اور اگر مجبور کرے بھی تو انشورنس نہ کرانے میں زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ انٹرنیشنل منڈیوں میں سامان بھیجا نہیں جاسکتا اور یہ بھی حکومت کے مجبور کرنے کی صورت میں، ورنہ ایسا نہیں۔ لہذا اس سے اجتناب کرنا لازم ہوگا، لیکن اگر جبراً مجبور کرتی ہے تو بھی ملنے والی رقم سود کا حکم رکھتی ہے۔

۷- مسئلہ انشورنس پر گفتگو کی آخری کڑی یہ کہ جب ایجر کمپنیاں اگر وہ خود ہی متعلقہ سامان کا انشورنس کریں اور اجرت حمل و نقل سے زائد رقم لے کر یہ معاملہ کر لیں کہ ضیاع و نقصان کی صورت میں ہم اس کے ذمہ دار اور دیندار ہیں تو ایسی صورت میں معاملہ کرنے والی کمپنیوں سے نقصان کا معاوضہ لینے کا کیا حکم ہے؟، تو اس صورت جبکہ اس کمپنی نے یہ ذمہ داری لی ہے اور خود کو اس کا ضامن قرار دیتی ہے اور اس کی حفاظت پر وہ کچھ رقم لیتی ہے تو ایسی صورت میں جبکہ وہ ضامن ہے تو ضیاع مال کا نقصان اس سے وصول کیا جاسکتا ہے، اور اس مسئلہ کو ضامن خطرہ طریق پر قیاس کیا جائے گا (شامی جواہر الفقہ ۲/۱۸۲-۱۸۳)۔

لہذا ضیاع کی ہر صورت میں اس سے ضمان وصول کیا جائے گا۔

## موجودہ حالات میں بیمہ کی شرعی حیثیت

مولانا محمد زید مظاہری ندوی ☆

بیمہ عین قمار ہے:

یہ تو حقیقت ہے کہ ”بیمہ“ کی مروجہ تین صورتیں سود و قمار (جوے) پر مشتمل ہیں جن کی حرمت منصوص و متفق علیہ ہے، قمار کے بارے میں علماء شریعت نے قاعدہ لکھا ہے:

”تعليق الملك على الخطر“ (جواہر الفقہ ۲/۲۲۷)، نیز ابو بکر رازی کے الفاظ ہیں: ”حقیقۃ القمار تمليک المال على المخاطرة وهو أصل في بطلان عقود التمليكات الواقعة على الاخطار“ (احکام القرآن ۳/۳۶۵)۔

یعنی ملکیت کو ایسی صورت سے معلق کر دینا جو خطر پر مبنی ہو، یعنی جس میں ہونے نہ ہونے کا احتمال ہو۔ ”غرر و خطر“ کہتے ہی اس کو ہیں جس کا انجام معلوم نہ ہو ”و الغرر ما یکون مستورا لعاقبة“ (بدائع الصنائع ۳/۶۸)۔

اور ظاہر ہے کہ مروجہ بیمہ کی صورتوں میں غرر و خطر پورے طور سے پایا جاتا ہے، اس لئے از روئے شرع مروجہ بیمہ کی شکلیں سود و قمار پر مشتمل ہونے کی وجہ سے نص قطعی سے حرام، ناجائز، گناہ کبیرہ ہیں۔

☆ استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

### حکم کی دو قسمیں اصلی و عارضی:

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ احکام شرعیہ کی دو قسمیں ہیں، ایک اصلی، دوسرے عارضی، یعنی کبھی تو کسی شئی کی ذات پر نظر کر کے احکام مرتب ہوتے ہیں اور کبھی عوارض پر نظر کر کے، اور دونوں قسم کے احکام باہم مختلف بھی ہو جاتے ہیں (بوادر النوادیر ۷۷۱/۲)۔

شریعت میں اس کے بے شمار نظائر ہیں کہ ایک شئی اپنی حقیقت اور حکم اصلی کے اعتبار سے ممنوع اور ناجائز تھی، لیکن عوارض اور ضرورت کے وقت وہی جائز ہو گئی۔

شمس الائمہ سرخسیؒ ایک مسئلہ کے ضمن میں بطور نظیر کے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

”وهو نظير الفصد فهو جرح لا يجوز الإقدام عليه من غير حاجة وعند الحاجة يكون دواء“ (مبسوط للسرخسی ۱۲۱/۱۳)۔

اور اس کی نظیر فصد کھلوانا (آپریشن وغیرہ) ہے کہ اصلاً تو یہ زخم لگانا ہے، ایسا اقدام کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا، لیکن ضرورت و حاجت کے وقت وہی زخم لگانا دواء و علاج ہو جاتا ہے۔

### الضرر یزال:

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ شریعت مطہرہ کا مسلمہ اصول ہے کہ ”الضرر یزال“، یعنی ضرر کو زایل کیا جائے گا۔ اور اسی ازالہ ضرر کی خاطر قاعدہ ہے ”الضرورات تبیح المحظورات“ کہ ضرورت (دفع ضرر) کی وجہ سے ممنوعات بھی جائز ہوتے ہیں، اور وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ ”الحرج مدفوع“، یعنی شرعاً حرج مدفوع ہے۔

ابن نجیمؒ نے الاشباہ میں اس کی بڑی تفصیل فرمائی ہے (الاشباہ ۱۴۰)۔

الغرض ضرورت (دفع ضرر کی) کی وجہ سے محظورات کے ارتکاب کی اجازت ہے۔ اور ضرورت کا مطلب محض اکراہ و اضطراب (جس میں جان جانے کا خطرہ ہو) نہیں ہے بلکہ

لحوق حرج اور ضرر بھی ضرورت میں داخل ہے۔ چنانچہ فقہاء کرام نے جھوٹ بولنے، رشوت دینے وغیرہ امور کی اجازت دفع ضرر کے لئے دی ہے جس میں یقیناً اضطراب نہیں ہوتا، بلکہ صرف ضرر ہوتا ہے۔

البتہ دفع ضرر کے علاوہ محض حصول نفع کی خاطر محظورات کے ارتکاب کی اجازت ہرگز نہیں ہو سکتی اور دونوں کا فرق بالکل واضح ہے (فقہ حنفی کے اصول و ضوابط ۲۱۳)۔

مذکورہ بالا تمہیدات و تفصیلات سے بطور نتیجہ کے واضح طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مروجہ بیمہ کافی نفسہ شرعی و اصلی حکم عدم جواز کا ہے جس میں کوئی کلام نہیں۔

البتہ حالات و عوارض کے پیش نظر، یعنی دفع ضرر عام و حفظ جان مسلمین کے خاطر بیمہ کرانے کی اجازت چند شرائط کے ساتھ ہو سکتی ہے، اور یہ اس کا حکم عارضی ہوگا، جب تک کہ اس قسم کے عوارض پائے جائیں گے اور جن علاقوں میں پائے جائیں گے صرف ان علاقوں میں عوارض کے پائے جانے کے وقت تک یہ عارضی حکم بھی باقی رہے گا۔

ضرورت کی وجہ سے بیمہ کے جواز کے واضح نظائر:

حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے اس سوال کے جواب میں کہ ”غیر مسلم حکومت کی ماتحتی میں عدالتی عہدے قبول کرنا از روئے شرع کیسا ہے؟ جہاں کہ یقیناً غیر اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کرنا پڑیں گے جبکہ نصوص میں وارد ہوا ہے۔ جو شخص شرع کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ فاسق ہے، کافر ہے، ظالم ہے (سورہ مائدہ: ۴۴، ۴۵، ۴۷)۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ”فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ الْخ“ (سورہ نساء: ۶۵) اس قسم کے نصوص سے تو بہ ظاہر عدم جواز ہی معلوم ہوتا ہے۔

اس سوال کے جواب کے متعلق حضرت تھانویؒ نے ایک اصولی گفتگو فرمائی ہے جو زیر بحث مسئلہ بیمہ کے لئے نظیر و مثیل بن سکتی ہے۔ حضرت حکیم الامت تھانویؒ فرماتے ہیں:

جواب: بعض افعال ایسے ہیں کہ شرعی کلی قانون سے حرام ہیں، لیکن ضرورت میں شرعاً ہی اس کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ خواہ نصاً، خواہ اجتہاداً، جیسے اکل میوہ تناول خمر مخمضہ میں، یا اکراہ میں، یا اساعہ لقمہ غاصہ کے لئے۔ ایسے ہی افعال میں باقتضاء قواعد یہ مناصب مسئولہ عنہا بھی داخل کئے جاسکتے ہیں، اگرچہ کوئی نقل جزئی اس وقت میری نظر میں نہیں گذری، مگر کلیات و نظائر سے تمسک ممکن ہے۔

البتہ کلام ضرورت میں ہے اور یہ اہم ہے سو اس کی تحقیق یہ ہے کہ ضرورت کی عرفی دو قسمیں ہیں ایک تحصیل منفعت، خواہ دینی دنیوی، خواہ اپنی ہو یا غیر کی، دوسری دفع مضرت اس تعیم کے ساتھ، سو تحصیل منفعت کے لئے ایسے افعال کی اجازت نہیں، مثلاً محض تحصیل قوت ولذت کے لئے حرام دوائی کا استعمال و مثل ذلک۔ اور دفع مضرت کے لئے اجازت ہے جبکہ وہ مضرت قواعد صحیحہ منصوصہ، یا اجتہاد سے معتد بہا ہو۔ اور شرعی ضرورت یہی ہے۔ مثلاً دفع مرض کے لئے دوائے حرام کا استعمال جبکہ دوسری دوا کا نافع نہ ہونا تجربہ سے ثابت ہو گیا ہو، کیونکہ بدون اس کے ضرورت ہی کا تحقق نہیں ہوتا۔

انہیں عوارض کے پیش نظر دفع ضرر کے واسطے مروجہ بیمہ کی بھی گنجائش سمجھ میں آتی ہے۔

### تصریحات و تائیدات:

- چنانچہ ہندوستانی علماء و اکابر میں سے متعدد حضرات نے اسی قسم کے حالات و عوارض کے پیش نظر جواز بیمہ کی صراحت فرمائی ہے، حضرت مفتی محمود صاحب تحریر فرماتے ہیں۔
- ۱- اگر کوئی شخص ایسے مقام پر اور ایسے ماحول میں ہو کہ بغیر بیمہ کرائے جان و مال کی حفاظت ہی نہ ہو سکتی ہو، یا قانونی مجبوری ہو تو بیمہ کرانا درست ہے (فتاویٰ محمودیہ ۲۴۰/۴)۔
  - ۲- حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب تحریر فرماتے ہیں: قانون فقہ ”الضرر یزال“ کے پیش نظر خطرے کی چیزوں کا بیمہ کرائینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے (فتاویٰ رحیمیہ ۱۳۳/۶)۔

۳- حضرت مفتی نظام الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں: ”شدید مجبوری میں مثلاً قانوناً لازم ہو جائے یا مثلاً کسی مقام کے حالات ایسے خراب ہو جائیں کہ بغیر انشورس کے جان و مال کی حفاظت مشکل ہو جائے تو بوجہ مجبوری کے محض مجبوری کے بقدر گنجائش نکل سکتی ہے (نظام الفتاویٰ ۱/۳۲۷)۔“

۴- نیز مفتیان دارالعلوم دیوبند نے ۱۲۵ اساتذہ دارالعلوم کی تصدیق و دستخط کے ساتھ ضرورت شدیدہ کی بنا پر بیمہ کے جواز کا فتویٰ دیا ہے (ملک کے موجودہ حالات میں بیمہ کا شرعی حکم)۔

### عوارض کی وجہ سے بیمہ کے جواز کے شرائط:

گذشتہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ”بیمہ“ فی نفسہ تو ناجائز ہے۔ البتہ حالات و عوارض کی بنا پر ضرورتاً اجازت ہو سکتی ہے، لیکن اس عارضی جواز کے بھی شرائط ہیں جو فقہاء کے کلام سے مستفاد ہوتے ہیں، نیز ان اصول سے بھی مفہوم ہوتے ہیں جن پر عارضی جواز کی بنیاد رکھی گئی ہے ورنہ ان اصول سے جواز کا استدلال کرنا ہی درست نہ ہوگا۔

جواز کی بنیاد ”الضرر یزال، الحرج مدفوع، الضرورات تبیح المحظورات“ جیسے قواعد پر ہے۔ یعنی ضرورت کی بنا پر ازالہ ضرر و دفع حرج کے واسطے محظورات کے ارتکاب کی اجازت ہے ظاہر بات ہے کہ ان قواعد کا مقتضی یہی ہے کہ محظورات کا ارتکاب اسی وقت مباح ہوگا جبکہ اس عمل محظور کے بغیر واقعی بظن غالب ضرر و حرج لازم آجائے گا۔

### جواز بیمہ کے شرائط کا خلاصہ:

مذکورہ بالا اصولی گفتگو اور محققین کی تصریحات کی روشنی میں بیمہ (جو فی نفسہ حرام ہے) کے جواز کے شرائط خود بہ خود واضح طور پر سمجھ میں آتے ہیں کہ بیمہ کا جواز عوارض و ضرورت کی بنا پر اس وقت ہوگا جبکہ:

۱- بیمہ نہ کرانے سے واقعی مسلمانوں کو ضرر و حرج لاحق ہونے کا ظن غالب ہو۔

۲- دوسرے یہ کہ بیمہ کرا لینے سے واقعی بظن غالب اس ضرر و حرج سے تحفظ ہو سکتا

ہو۔

۳- اس ضرر و حرج سے تحفظ کی سوائے بیمہ کے اور کوئی شکل ممکن نہ ہو۔

۴- بیمہ کرا لینے میں بھی دفع کی نیت ہو، حصول منفعت کی نیت نہ ہو۔

یہ ہیں شرائط اربعہ جن پر بیمہ کے جواز کا مدار ہے اور جن کے بغیر بیمہ کا جواز مشکل ہے۔

شرائط جواز کا پایا جانا مشکل ہے:

اب ان شرائط کے بارے میں غور کرنا چاہئے کہ کیا واقعی ملک کے موجودہ حالات اس طرح کے ہیں کہ بیمہ کرائے بغیر مضرت کا لاحق ہو جانا یقینی اور اس کے بغیر جان و مال کا تحفظ مشکل ہے؟ کیا واقعی بیمہ نہ کرا لینے کی صورت میں جان و مال سخت خطرہ میں ہیں؟ اور پھر بیمہ کرا لینے سے واقعی بظن غالب جان و مال کا تحفظ ہو جائے گا؟ اور تحفظ جان و مال کی سوائے بیمہ کرا لینے کی اور کوئی صورت نہیں؟

۱- ملک کے موجودہ نازک حالات اور خطرناک صورت میں بھی یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ فتنہ و فسادات کے حالات میں بیمہ کرائے بغیر جان و مال کا تحفظ مشکل ہے، اور بیمہ کرا لینے سے ضرور ہی جان و مال محفوظ رہ سکتے ہیں اور اس وقت سوائے بیمہ کے تحفظ جان و مال کی اور کوئی شکل نہیں، کتنے ہیں جنہوں نے جان و مال کا بیمہ کرایا، لیکن فتنہ و فساد نے ان کو پلیٹ میں لے لیا اور کتنے ہیں جنہوں نے بیمہ پالیسی کا تصور بھی نہیں کیا، لیکن فتنہ و فساد کی آنچ ان تک نہیں پہنچی۔

۲- بیمہ پالیسی گو حکومت سے متعلق ہوتی ہے، لیکن فساد کی اور فساد کرنے والے افراد پولیس و پی اے سی انہیں اس کی کیا خبر کہ کس کے جان و مال کا بیمہ ہے اور کس کا نہیں، فتنہ و فساد کی گرم بازاری اور بھڑکتے ہوئے شعلوں، مسموم زہریلی فضاؤں میں یہ امتیاز کرنا ہی مشکل ہوگا کہ آیا اس کے جان و مال کا بیمہ ہے یا نہیں۔ اور اگر امتیاز ہو بھی جائے تو بھی ظالموں کو اس سے کیا سروکار کہ قتل و غارت گری کے بعد اس کا انجام کیا ہوگا؟۔

۳- اگر یہ کہا جائے کہ عمومی پیمانہ پر اکثریت کے بیمہ کرائیے کی صورت میں حکومت پر بار پڑے گا کہ اس قدر جان و مال کا معاوضہ کہاں تک دے گی لامحالہ اوپر سے پولیس و پی اے سی پر سختی ہوگی کہ خبردار کسی قسم کے فتنہ و فساد کی شکل نہ ہونے پائے۔

اولاً تو عمومی پیمانہ پر اکثر مسلمانوں کا جان و مال کا بیمہ کرائیے عاقدہ ناممکن ہے۔ کیونکہ اکثر طبقہ تو تقریباً غریب و فقراء کا ہے جو بہ مشکل دونوں وقت محنت مزدوری کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتے ہیں، بیمہ کے لئے رقم کہاں سے لائیں، متوسط طبقہ کے لوگوں کو بیاہ شادی و تجارت ہی سے پیسہ بچانا مشکل ہوتا ہے، عموماً کاروبار ہی کے لئے وہ سودی قرض لینے پر مجبور ہوتے ہیں، لہذا بیمہ کے لئے رقم جمع کرنا ان کے لئے دشوار مسئلہ ہے، رہے امراء و خوش حال قسم کے لوگ ان میں بھی یقین نہیں کہ وہ سب بیمہ کرائیں گے، کیونکہ مختلف الخیال قسم کے لوگ ہیں، سارے امراء بھی بیمہ کرانے پر متفق نہیں ہو سکتے، خواہ شرعی منظور سمجھ کر یا طبعی تصور و فتور کی بنا پر، نیز اہل علم میں بھی دونوں ہی قسم کے لوگ ہیں، اب تک اکثر علماء تو بیمہ کے عدم جواز کے قائل ہیں اور عوام الناس کا رشتہ مختلف اہل علم سے ہے اور وہ اپنے ہی مقتدا کے مطابق عمل پیرا ہوں گے۔

الغرض یہ سمجھنا ہی سرے سے غلط معلوم ہوتا ہے کہ اکثر معلوم مسلمانوں کے بیمہ کرائیے سے حکومت پر بار پڑے گا، کیونکہ محدود پیمانہ پر بیمہ کرانے سے یقیناً بار نہیں پڑے گا، جیسا کہ مشاہدہ ہے اور عمومی پیمانہ پر مسلمانوں کا بیمہ کرائیے ناممکن ہے، اس لئے یہ نظریہ قابل تسلیم نہیں۔

۴- اور اگر یہ مان بھی لیا جائے پھر بھی حکومت پر دباؤ اور بار پڑنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ فساد زدہ علاقوں میں فساد سے متاثر افراد مفتولین کے اولیاء و ورثاء کی حکومت جو امداد کرتی ہے وہ بیمہ کے علاوہ مستقل محکمہ ہے، اور بیمہ کا شعبہ بالکل علیحدہ ہے گو حکومت سے متعلق وزیر کی نگرانی میں یہ بھی ہے، لیکن حکومت شعبہ بیمہ کی کفیل نہیں، بلکہ خود یہ محکمہ اپنے اخراجات کا کفیل ہوتا ہے، جان کے ضیاع کی صورت میں جو کچھ بھی معاوضہ ملتا ہے وہ خزانہ حکومت سے نہیں، بلکہ بیمہ پالیسی کے تحت علیحدہ دیا جاتا ہے، بیمہ تو دراصل اسی نوعیت کا ایک کاروباری شعبہ



ہے، جیسے سودی بینک، بیمہ پالیسی میں بھی قمار بازی کے توسط سے کاروبار چلتا ہے اور اس کی آمدنی سے جان و مال کا معاوضہ دیا جاتا ہے، حکومت سے اس معنی کر اس کا کوئی تعلق نہیں، اس لئے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بیمہ کرا لینے سے حکومت پر دباؤ پڑے گا اور اس کی وجہ سے فتنہ و فساد کی روک تھام ہوگی۔

۵- بالفرض اگر واقعہ حکومت ہی کے خزانہ سے مجروحین و مقتولین کو مال و جان کا معاوضہ دیا جائے، لیکن اس کے باوجود محض اس کی وجہ سے فتنہ و فساد کی روک تھام سمجھ میں نہیں آتی، جب قانون ان کا، حکومت ان کی، سکے ان کا، فوج ان کی، سیاہ و سپید کے وہ مالک، وہ جو چاہیں، جب چاہیں کریں، قوانین میں تغیر و تبدل کریں اگر واقعہ حکومت پر بار پڑے بھی تو بھی وہ بڑی آسانی سے اس کا حل نکال سکتے ہیں۔ اور ہماری تدبیر بے سود ہی رہے گی۔

اگر عدل و انصاف کا اتنا ہی لحاظ ہوتا تو یہ فتنہ فساد اور قتل و غارت گری کا بازار ہی کیوں گرم ہوتا، جب وہ ہماری جانوں سے کھیل سکتے ہیں تو کیا اموال کی بابت ہم کو ان پر اطمینان کر لینا چاہئے؟

اور اگر اطمینان ہو بھی جائے تو زائد سے زائد حکومت پر بار پڑے گا مالی نقصان ہوگا، لیکن اس کو اس کی کب پرواہ، وہ خرچ کر کے پھر ہم ہی سے وصول کر لے گی، اگر ملک کے نقصان کا اتنا لحاظ ہوتا ہے تو فتنہ و فسادات میں اس سے کہیں زائد نقصان ہوتا ہے۔ وہ تو اس پر خوشی سے راضی ہو کر سودا کر سکتے ہیں کہ فتنہ و فسادات ہوتے رہیں، جانیں ضائع ہوتی رہیں اور ہم پیسہ تقسیم کرتے رہیں گے۔

نیز بیمہ کرا لینے کے بعد بھی کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اکثر مقتولین (جن کا بیمہ بھی ہوا ہو) کے جان کا عوض آسانی سے مل سکتا ہے؟ جبکہ آج کل فسادات میں بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ قتل و غارت گری کے بعد نعرہ و میت کو گاڑیوں میں بھر کر دریا برد کر دیا جاتا ہے، اور بیمہ ہونے کی صورت میں جان کا معاوضہ اسی وقت مل سکتا ہے جبکہ ڈاکٹری رپورٹ پولیس وغیرہ کی جانچ صحیح ثبوت اور تصدیق بھی موجود ہے، ورنہ محض میت کے لاپتہ ہونے کی صورت میں برسہا برس تک

مقدمہ بازیاں ہوں گی اور لاپتہ میت کی جستجو و تلاش کا حکم نافذ ہوگا، ابھی معاوضہ جان ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اور اگر واقعی فسادات میں ہلاکت کا ثبوت بھی ہو، لیکن پھر بھی حکومت ہرگز ہرگز ثبوت فراہم نہیں ہونے دیتی جب غیر مسلمین کے بکثرت مقتول ہو جانے کی صورت میں ان کے مقتول ہو جانے کو تسلیم نہیں کیا گیا اور ہزاروں کی تعداد میں قتل ہو جانے کے باوجود صرف چند ہی افراد کے مقتول ہونے کو تسلیم کر کے صرف انہیں پر قانونی کارروائی کے بعد ان کی امداد کی گئی اور بقیہ مقتولین کو دریا برد گردیا گیا تو مسلمانوں کو کیوں کر ایسی امید ظالموں سے وابستہ رکھنا چاہئے کہ وہ ہمارے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کریں گے۔

الغرض یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بیمہ کرا لینے سے حکومت پر اثر پڑے گا اور اسکی وجہ سے فسادات کی روک تھام اور مسلمانوں کے جان و مال کا تحفظ ہوگا، اس لئے ایسے حالات میں بھی بیمہ کی گنجائش نہیں ہوگی۔

### حدود جواز اور جان و مال کے بیمہ کا فرق:

لیکن اگر کسی علاقہ و خطہ میں اور کسی شخص کی تحقیق، تجربہ و مشاہدہ کی روشنی میں واقعی یہ امر متعین و متیقن ہو جائے کہ بیمہ کرا لینے سے فتنہ و فسادات کی عمومی روک تھام بظن غالب ہو سکتی ہو، اور بیمہ کرانے سے مسلمانوں کے جان و مال واقعی محفوظ رہ سکتے ہوں تب بھی عام حالات میں عام اجازت تو ہرگز نہ ہوگی، بلکہ صرف انہیں علاقوں میں عارضی اجازت انہیں شرائط کے ساتھ ہوگی جس کا ذکر ماقبل میں گزرا۔ اور اس علاقہ کے ممتاز قابل اطمینان علماء و ارباب افتاء کی جماعت کا منفقہ قول ہی ان کے حق میں قابل اعتبار ہوگا۔

یہ ساری تفصیل جان کے بیمہ کے بارے میں تھی۔ اور یہی حکم اموال و املاک کے بیمہ کا ہے، لیکن جان کے بیمہ کے مقابلہ میں اس کا مسئلہ اہون اور اس میں قدرے توسع ہے اور وہ یہ کہ خطرناک حالات میں جبکہ مضرت کا ظن غالب ہو تو ضرر سے تحفظ کے واسطے دکان و مکان مساجد

مدارس کے بیمہ کرانے کی بھی اجازت (مجبوری کی صورت میں، یعنی جبکہ واقعی ضرر کا اندیشہ بظن غالب ہو) ہے۔

چونکہ اموال و املاک و عمارات کے بیمہ میں جو نقصان ہوتا ہے اس کی وصولیابی آسانی ہو جاتی ہے، جیسا کہ مشاہدہ ہے، اس لئے نقصان کی تلافی اور آتش زدہ دکان مکان کا اعادہ ممکن ہے، اس لئے اس کی اجازت ہے، برخلاف جان کے بیمہ کے۔

جواز کا دوسرا پہلو:

البتہ زیر بحث مسئلہ میں ایک جہت اور بھی ہے جس کی بابت اہل علم و ارباب افتاء کو غور کرنا چاہئے کہ ان حالات میں اس جہت سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے یا نہیں جس میں کہ ہمیشہ سے علماء و فقہاء کا اختلاف چلا آ رہا ہے اور دونوں ہی طرف محققین ہیں۔

اور وہ یہ کہ دار الحرب میں امام ابوحنیفہ و محمد رحمہما اللہ نے حریوں سے کسی بھی معاملہ حتیٰ کہ سود و قمار کے ذریعہ بھی ان سے نفع حاصل کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔

فقہائے حنفیہ نے طرفین ہی کے قول کو راجح قرار دیا ہے (دیکھئے: مجلہ فقہ اسلامی دوم ۷۸، ۴، ربوہ کی شرعی حقیقت)، شمس الائمہ سرخسی فرماتے ہیں:

و كذلك لو باعهم مיתה أو قامرهم وأخذ منهم مالاً بالقمار فذلك المال طيب له عند أبي حنيفة و محمد رحمهما الله تعالى خلافاً لأبي يوسف والشافعي رحمهما الله تعالى (مبسوط للسرخسی ۵۶/۱۳)۔

یعنی دار الحرب (دار الشکر) میں مشرکین سے مردار کی بیع، یا قمار کے ذریعہ اگر مال حاصل کیا جائے تو وہ مال پاکیزہ اور حلال ہے۔ امام ابوحنیفہ و امام محمد کا اس میں اختلاف ہے۔

شمس الائمہ سرخسی نے آگے تفصیلی کلام فرمایا ہے اور طرفین کے دلائل اور امام شافعی کے مستدل کا جواب بھی تحریر فرمایا ہے، طرفین کی دلیل میں دو واقعہ نقل فرمائے ہیں جن سے واضح طور سے حریوں سے قمار کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

پہلا واقعہ تو وہ ہے جس کے متعلق سورہ روم (الم غلبت الروم) کی آیات نازل ہوئیں جن میں یہ پیشین گوئی اور بشارت دی گئی ہے کہ چند سال بعد پھر روم فارس پر غالب آجائیں گے، پورا واقعہ محدثین و مفسرین نے نقل فرمایا ہے (تفسیر نسفی ۲۶۶/۳)، اس موقع پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ابی بن خلف سے قمار کا معاملہ فرمایا اور ابی بن خلف کی تکذیب کرنے پر فرمایا کہ میں اس پر شرط کرنے کو تیار ہوں کہ اگر تین سال کے اندر روم غالب نہ آسکے تو سو ۱۰۰ اونٹنیاں میں تمہیں دوں گا اور اگر وہ غالب آگئے تو سو ۱۰۰ اونٹنیاں تمہیں دینا پڑیں گی، آگے لمبا واقعہ ہے، روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے پانچ سال پہلے پیش آیا اور پورے سات سال ہونے پر غزوہ بدر کے وقت روم دوبارہ فارس پر غالب آگئے، اس وقت ابی بن خلف مرچکا تھا، حضرت صدیق اکبر نے اس کے وارثوں سے اپنی شرط کے مطابق سو ۱۰۰ اونٹنیوں کا مطالبہ کیا، انہوں نے اونٹنیاں دیدیں۔

مذکورہ واقعہ اور یہ دو طرفہ لین دین اور ہارجیت کی شرط حضرت صدیق اکبر نے ابی بن خلف کے ساتھ ٹھہرائی تھی، یہ بھی ایک قسم کا جو اور قمار ہی تھا (معارف القرآن ۷۰۸/۶)۔  
لیکن حضور ﷺ نے اس کو جائز قرار دیا۔

البتہ بعض مفسرین نے نقل فرمایا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جبکہ قمار کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی ”وكان ذلك قبل تحريم القمار“ (تفسیر نسفی ۲۶۶/۳، تفسیر احمدی ۲۹۷) حضرت مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں:  
”یہ واقعہ ہجرت سے پہلے کا ہے جب قمار حرام نہیں تھا“ (معارف القرآن ۷۰۹) لیکن حضرت قتادہ فرماتے ہیں:

امام ابو حنیفہ و محمد رحمہما اللہ کا مسلک یہ ہے کہ عقود فاسدہ، مثلاً سودی معاملات اور اس کے علاوہ (مثلاً قمار) یہ دار الحرب میں مسلمان و کفار کے درمیان جائز ہیں اور اسی مذکورہ واقعہ ہی سے احتجاج کیا ہے، صاحب کشاف نے بھی اسی طرح فرمایا ہے، لیکن صاحب ہدایہ نے اس واقعہ سے تمسک نہیں فرمایا، بلکہ حدیث و قیاس سے احتجاج کیا ہے (تفسیر احمدی ۳۹۷)۔

شمس الائمۃ سرخسیؒ اسی واقعہ کے متعلق فرماتے ہیں:

”جب شرط کے مطابق ۱۰۰ اونٹنیاں حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ آئیں تو آپ ان کو لیکر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے اس کے کھانے کا حکم فرمایا، اور یہ تمام مسلمانوں کے درمیان تو جائز نہیں حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر و قریش مکہ کے درمیان جائز قرار دیا اس وجہ سے کہ وہ مکہ میں تھے جو کہ دارالشک تھا جہاں مسلمانوں کے احکام نافذ نہیں ہوتے، (بلکہ وہ مغلوب و محکوم ہوتے ہیں)“ (مبسوط لسخی ۱۳/۵۷)۔

اس واقعہ کے متعلق بعض روایات میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے ان اونٹنیوں کے صدقہ کرنے کا حکم فرمایا ”هذا السحت تصدق به“۔

ابو یعلیٰ وابن عساکر میں حضرت براء بن عاذب کی روایت ہے، اس میں یہ الفاظ منقول ہیں هذا السحت تصدق به، یہ تو حرام ہے اس کو صدقہ کر دو (روح المعانی، معارف القرآن ۶/۷۰۹)۔

الغرض فقہاء کرام نے مذکورہ واقعہ سے دارالشک میں سود، قمار کے ذریعہ حاصل شدہ مال کو حلال و جائز قرار دیا ہے اور یہی طرفین کا مسلک ہے۔

طرفین کے مسلک کی دلیل میں دوسرا واقعہ حضور ﷺ کا رکنا پہلوان سے کشتی لڑنے کا ہے، واقعہ مشہور و معروف ہے، اس میں بھی صریح قمار کا معاملہ تھا، لیکن دارالحرب میں ہونے کی وجہ سے وہ بھی جائز تھا، شمس الائمۃ سرخسیؒ پورا واقعہ نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

”وهذا دليل على جواز مثلة في دارالحرب بين المسلم والحربي؛ لأن مال الحربي مباح“ (مبسوط ۱۳/۵۷)۔

(یعنی یہ واقعہ بھی اس جیسے معاملات (قمار) کے جواز کی دلیل ہے، یعنی دارالحرب میں حربی و مسلم کے مابین کیونکہ حربی مباح الاموال ہے)۔

بعض کتابوں میں مسلم مستامن کی قید لگی ہوئی ہے، لیکن ”شرح سیر کبیر“ وغیرہ دوسری

عبارتوں میں یہ بھی قید نہیں، مطلقاً مسلم و حربی کے مابین معاملہ کو درست لکھا ہے۔

”ثم قد علم أن الربا لا يجزى بين المسلم والحربي في دار الحرب“

(شرح سیر الکبیر ۱۱۲/۳، جواہر الفقہ ۲۳۰/۲)۔

کچھ ہندوستان اور دارالہرب کے بارے میں:

ہندوستان کی بابت برابر اہل علم و فقہاء کا اختلاف چلا آ رہا ہے کہ آیا یہ ہندوستان ان جیسے حالات میں دارالہرب کے حکم میں ہے یا نہیں، علماء کی بڑی جماعت حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت گنگوہی، مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی، حضرت مدنی کی تحقیق و صراحت کے مطابق ہندوستان دارالہرب ہے، اور حضرت تھانوی نے دارالہرب کی جو تعریف و تقسیم فرمائی ہے اس سے بھی ہندوستان کا دارالہرب ہونا معلوم ہوتا ہے، یہ اساطین امت ہندوستان کے دارالہرب ہونے کے قائل ہیں اور مذکورہ اکابر میں حضرت تھانوی کے علاوہ جملہ اکابر دارالہرب میں حریوں سے سود و قمار کے ذریعہ نفع حاصل کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔

موجودہ حالات میں ہندوستان کی صورت حال اس سے بہتر یقیناً نہیں بلکہ بدتر ہے، اور جب حصول نفع کی خاطر ہندوستان جیسے ملک میں اساطین امت نے طرفین کے قول کے مطابق سودی معاملہ کرنے کی اجازت دی ہے تو نازک صورت حال جبکہ مسلمانوں کو واقعی جان و مال کا خطرہ لاحق ہو ایسی صورت میں تو بدرجہ اولیٰ گنجائش ہونی چاہئے، جلب منفعت کی خاطر نہ سہی دفع مضرت کی خاطر تو ضرور اس قول کے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے، جبکہ فقہاء نے طرفین کے قول کی ترجیح بھی فرمائی ہے، اور محققین کی بڑی جماعت نے اس کے مطابق فتویٰ بھی دیا ہے، کیوں نہ ایسے حالات میں ان روایات اور طرفین کے مسلک اور فقہاء کی ترجیح و اکابر کے فتوے کا سہارا لے کر مسئلہ کا حل نکالا جائے اور کون سی وہ رکاوٹ و ممانعت ہے جو اس قسم کی روایتوں پر عمل کرنے اور اختیار کرنے سے مانع بنتی ہے۔

حرام بعینہ کے ارتکاب سے بہتر یہ کہ اس جہت سے جواز کو اختیار کیا جائے، گو عارضی ہی ہو، یہ فیصلہ اہل علم و ارباب افتاء ہی فرمائیں گے کہ طرفین کے قول کو اختیار کرنے میں کوئی مفسدہ و فتنہ شرعیہ ہے یا نہیں، جس کی بناء پر سداً اللباب مصلحیہ اس قول طرفین کے مطابق فتویٰ دینے سے احتیاط کرنا چاہئے۔

### بیمہ میں زائد ملنے والی رقم کا حکم:

بیمہ میں جمع شدہ رقم سے زائد جو رقم حاصل ہوگی اس کی دو صورتیں ہیں، یا تو عام حالات میں طبعی موت واقع ہو جانے کی صورت میں زائد رقم حاصل ہوگی یا فسادات کی صورت میں بیمہ شدہ جان یا مال کا ضیاع ہوگا اور اس میں زائد رقم ملیں گی دونوں صورتوں کا حکم علیحدہ علیحدہ ہے۔ پہلی صورت، یعنی عام حالات میں بیمہ کرانے کی صورت میں جمع شدہ سے زائد جو رقم حاصل ہوگی وہ یقیناً سود ہے، کیونکہ اس پر سود کی تعریف صادق آتی ہے، اصولی حیثیت سے جمع شدہ رقم سے زائد رقم لینا بوجہ اس کے سود ہونے کے ناجائز اور اپنے استعمال میں اس کا لانا حرام ہوگا، الا یہ کہ کوئی شخص دالحرب جیسے ملک میں طرفین کے قول کا سہارا لے تو اس کے لئے گنجائش ہو سکتی ہے، لیکن طرفین کے قول کو اختیار نہ کرنے کی صورت میں بھی مصالح کا تقاضا اور فتویٰ یہی ہے کہ اصل رقم سے زائد ملنے والی رقم کو بھی ضرور حاصل کر لینا چاہئے، البتہ فساد زدہ علاقوں میں مظلومین کی مدد میں اس کو صرف کر دینا چاہئے، حضرت تھانویؒ کے بعض فتاویٰ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے (دیکھئے: امداد الفتاویٰ ۱۷۱/۳)۔

### فسادات کی صورت میں زائد ملنے والی رقم کا حکم:

دوسری صورت، یعنی فسادات کی صورت میں بیمہ شدہ جان کی ہلاکت یا مال کا ضیاع ہو جائے اور اس میں اصل جمع شدہ رقم سے زائد رقم دی جائے اس کا حکم اور اس میں تفصیل یہ ہے کہ فساد سے متاثر ہونے والے اشخاص و پسماندگان کو جو رقم دی جاتی ہے ایک تو وہ ہے جو محض

امداد و تعاون کی حیثیت رکھتی ہے جو حکومت کا مستقل محکمہ ہے اور حکومت فساد زدہ علاقوں میں امداد کیا کرتی ہے، ظاہر ہے کہ اس کی حیثیت محض امداد و تعاون کی ہے، اس لئے اس کے قبول کرنے اور استعمال کرنے میں کوئی اشکال نہیں۔ امیر و غریب سب کا حکم یکساں ہے۔

”ماکان علی وجه التبوع یستوی فیہ الغنی والفقیر“ (قواعد الفقہ ۱۱۶)۔

البتہ فسادات کی صورت میں بیمہ (جو ایک معاملہ ہے) کے واسطے سے بیمہ شدہ جان و مال کے ہلاک ہو جانے کی وجہ سے جمع کردہ رقم سے زائد جو رقم ملتی ہے اس کا لینا جائز ہے یا نہیں اور شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے یہی اہم سوال ہے۔ غور و فکر کے بعد اس طرح کی زائد ملنے والی رقم میں چند احتمال ہو سکتے ہیں۔

۱- امداد و تعاون، ۲- حفاظت میں کوتاہی کا جرمانہ و ضمان، ۳- جان و مال کا معاوضہ۔  
۱- امداد و تعاون کے نام سے تو اس رقم کا لین دین جائز ہو نہیں سکتا، گو لینے اور دینے والوں کی نیت بھی امداد و استمداد کی ہو، کیونکہ فسادات کی بنا پر امداد و تعاون کرنے کا محکمہ دوسرا ہے جو فساد سے متاثر افراد کو ملتا ہے، خواہ اس کا بیمہ ہونہ ہو، اور بیمہ میں رقم انہیں کو ملتی ہے جن کا بیمہ ہو اور فساد و حادثہ طبعی موت جملہ صورتوں میں ملتی ہے۔

نیز قمار اور سودی معاملہ کے ذریعہ سے تعاون اور امداد و استمداد کرنا بھی جائز نہیں، اس لئے امداد و تعاون کی تاویل بے سود ہے۔

۲- رہا جان کا معاوضہ، یا حفاظت میں کوتاہی کا جرمانہ و ضمان سو یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا، کیونکہ اس طرح فسادات ہو جانے کی صورت میں جو جانیں ضائع ہوتی ہیں وہ محض ظلم و زیادتی کی بنا پر ہوتی ہیں، از روئے شرع جو احکام اس سے متعلق ہو سکتے تھے وہ حدود و قصاص کے ہو سکتے تھے جس کی شکل ایک صلح کی بھی ہے کہ مقتول کے اولیا قاتل سے دیت پر صلح کر لیں۔

ان صورتوں میں سے یہاں کوئی صورت منطبق ہونے والی سمجھ میں نہیں آتی، حدود و قصاص کا تو سوال ہی نہیں اور صلح کیلئے باقاعدہ معاملہ ہونا شرط ہے جس کی تفصیلات کتب فقہ میں



مذکور ہیں، اس لئے فسادات میں ضائع ہونے والی جان کا معاوضہ (یعنی بیمہ میں جمع شدہ زائد رقم کا جواز نہ ہوگا)۔

۳- البتہ فسادات میں ہونے والے مالی نقصان کی تلافی و مکافات سمجھ میں آتی ہے اور مال ہلاک کر دینے کی صورت میں جو ضمان لازم آتا ہے اس کا لین دین بھی عام حالات میں جائز ہے، اس کے لئے وہ شرائط بھی نہیں جو جان ضائع ہونے کی صورت میں دیت و صلح کے واسطے ضروری ہیں اور فسادات میں ہونے والے نقصان کی تلافی و ضمان بھی حکومت ہی پر لازم ہے، کیونکہ حکومت ہی اصلاً محافظ تھی جس کی کوتاہی، بلکہ سازش کے نتیجہ میں یہ نقصان ہوا، اور حکومت ہی کے افراد نے کیا، اور یہ مسئلہ بھی اپنی جگہ پر متعین ہے کہ ضمان جس طرح مباشرت پر ہوتا ہے اسی طرح متناسب پر بھی ہوتا ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے (شامی، الاشاہ، رسم المفتی)۔

اس بناء پر بھی حکومت سے مالی نقصان کا معاوضہ لینا ہمارا حق ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ فسادات کی صورت میں بیمہ شدہ جان و مال میں جمع کردہ رقم سے زائد جو رقم ملتی ہے اس کو امداد و تعاون تو ہرگز نہیں کہہ سکتے، جان کا معاوضہ کہہ کر بھی جواز نہیں ہوگا، البتہ جان ضائع ہونے کی صورت میں پسماندگان کی مجبوری کی حالت میں ضرورت شدیدہ کی وجہ سے اس زائد رقم کا جواز ہوگا۔

البتہ اموال و املاک کا بیمہ ہونے اور مالی نقصان ہونے کی صورت میں جمع شدہ رقم سے زائد جو رقم ملے گی اس رقم کو بقدر نقصان کا معاوضہ سمجھنا اور اپنے استعمال میں لانا درست ہوگا، مقدار نقصان سے زائد رقم کا تصدق ضروری ہوگا۔

املاک کے جبری بیمہ اور ملنے والی زائد رقم کا حکم:

قانونی مجبوری کی وجہ سے املاک (کار، ٹرک) وغیرہ کا بیمہ کرانا جائز تو یقیناً ہے جس میں کہ جمع شدہ رقم کی واپسی بھی نہیں ہوتی، البتہ حادثہ پیش آجانے کی صورت میں جمع شدہ رقم سے زائد رقم ملتی ہے۔

اس کا شرعی حکم معلوم کرنے سے قبل یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اس طرح املاک (کار وغیرہ) کے بیمہ کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں جن میں بعض جبری اور بعض اختیاری ہوتے ہیں۔

۱- ایک بیمہ تو واقعی جبری اور لازمی ہوتا ہے جس کے بغیر گاڑی سڑک پر نہیں آسکتی، قانونی اصطلاح میں اس کو ”تھرڈ پارٹی“ کا بیمہ کہا جاتا ہے جو صرف اس واسطے ہوتا ہے کہ اس گاڑی سے اگر کسی دوسرے کا نقصان ہو جائے، مثلاً کوئی حادثہ پیش آئے یا کوئی شخص اس گاڑی سے کچل جائے تو یہ بیمہ کمپنی اس کی ذمہ دار ہوگی۔ مالک گاڑی پر اس کی کچھ آنچ نہ آئے گی، اور نہ ہی اس نقصان کا ضمان و جرمانہ گاڑی کے مالک پر ہوگا، اس بیمہ کا صرف یہی مقصد ہوتا ہے، نہ تو اس میں رقم کی واپسی کا سوال ہوتا ہے اور نہ ہی اس بیمہ کی وجہ سے گاڑی کی حفاظت کا وعدہ و ضمان ہوتا ہے، ہاں دوسرے کسی کو جو نقصان اس گاڑی سے پہنچ جائے صرف اس کا بیمہ ہوتا ہے۔

بیمہ کی یہ رقم ایسی ہے جو واقعی جبری ہے، لیکن یہ شکل تو ایسی ہے کہ کسی بھی صورت میں زائد رقم ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اس لئے یہ کہنا بھی بے سود ہے کہ جبری بیمہ میں ملنے والی زائد رقم کا کیا حکم ہوگا؟۔

الغرض جو جبری بیمہ ہے اس میں زائد رقم ملتی نہیں، نہ مل سکتی ہے، اور جن صورتوں میں زائد رقم ملنے کا امکان ہو سکتا ہے (یعنی بہ صورت حادثہ) وہ بیمہ جبری نہیں، بلکہ اختیاری ہیں، اس لئے وہ بیمہ اور اس بیمہ میں ملنے والی زائد رقم درست نہیں۔

**جبری بیمہ زندگی اور اس پر مزید ملنے والی رقم کا حکم:**

اس کا حکم یہ ہے کہ گورنمنٹ وہ زائد رقم اگرچہ سود کے نام سے دیتی ہے، لیکن سود کی تعریف تو اس وقت صادق آتی جبکہ ہم نے خود رقم جمع کی ہوتی اور اس پر مزید رقم ملتی، لیکن یہاں تو گورنمنٹ نے ہمارے اختیار کے بغیر از خود رقم کاٹ کر جمع کر لی ہے جو ابھی ہمارے قبضہ و ملک میں بھی نہیں آئی اور اس پر اضافہ کرتی ہے، اس لئے اس رقم پر جو بھی اضافہ ہوگا وہ ہماری مملوک

میں اضافہ نہ ہوگا، بلکہ ابتدائی تبرع و انعام ہوگا، بعض محققین نے اس کی صراحت بھی فرمائی ہے حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

”درحقیقت وہ سود نہیں ہے، اس لئے تنخواہ کا جو جزء وصول نہیں ہوا وہ اس ملازم کی ملک میں داخل نہیں ہوا۔ پس وہ رقم زائد اس کی مملوک شئی سے منتفع ہونے پر نہیں دی گئی، بلکہ تبرع ابتدائی ہے گو گورنمنٹ اس کو اپنی اصطلاح میں سود ہی کہے“ (امداد الفتاویٰ ۱۲۹/۳)۔

### حمل و نقل کرنے والی کمپنیوں کا بیمہ:

حمل و نقل کا کام انجام دینے والی کمپنیاں جن اشیاء کا بیمہ کراتی ہیں اور حمل و نقل کی اجرت مثل سے زائد اجرت محض اسی وجہ سے وصول کرتی ہیں کہ یہ زائد رقم بیمہ سے متعلق ہے اور اس کے عوض میں ہم اس کے محافظ ہیں، بصورت ضیاع ہم اسکے ذمہ دار و ضامن ہیں۔

چونکہ یہ صورت اور مسئلہ ”اشتراط الضمان علی الأمان والأجیر“ کے قبیل سے ہے جس کی فقہاء کرام نے اجازت دی ہے، ”در مختار شامی“ میں اس کی صراحت موجود ہے (شامی کتاب الودیعہ ۵۵۱/۴) بعض اکابر نے بھی اس کے جواز کی صراحت فرمائی ہے (امداد الفتاویٰ ۱۶۱/۳)۔

اس لئے یہ صورت بلاشبہ جائز ہے، اور نقصان و ضیاع کی صورت میں کمپنی جو معاوضہ دے گی کمپنی سے وصول کرنا اور اپنے استعمال میں لانا جائز ہوگا۔

## بینک انشورنس

☆ مولانا رفیق المنان القاسمی ☆

انشورنس بذات خود بہت مفید و کارآمد چیز ہے اگر اسے فاسد عناصر سے پاک کر کے اخوت و باہمی تعاون کے جذبہ سے اس کا نظام استوار کیا جائے تو اس سے بہتر اور مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اور یہ سماجی بہتری اور خیر و برکت کا باعث اور تعاون علی البر و التقویٰ کا مصداق بن سکتا ہے، لیکن جدید معاشی نظام کی باگ ڈور بے دین و خدا ناطرس کے ہاتھوں میں ہونے کی وجہ سے یہ بھی ایک سودی کاروبار اور زرا اندوزی کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔

شیخ ابوزہرہ کے الفاظ میں:

”اگرچہ اس کی اصلیت تعاون محض تھی، لیکن اس کا انجام بھی ہر اس ادارہ کا سا ہوا جو یہودیوں کے ہاتھ میں پڑا کہ یہودیوں نے اس نظام کو جس کی بنیاد ”تعاون علی البر و التقویٰ“ پر تھی اسے ایک ایسے یہودی نظام میں تبدیل کر دیا جس میں تمنا اور ربا دونوں پائے جاتے ہیں“ (بحوالہ جواہر الفقہ ۲/۱۹۸)۔

شیخ مصطفیٰ زرقاء نظام بیمہ کو اس معدنی چھڑی سے تشبیہ دیتے ہیں جسے بڑی اور اونچی عمارتوں کے اوپر اس لئے نصب کیا جاتا ہے تاکہ عمارت اور اس میں موجود نفوس و املاک کو برق آسانی کی قہر سامانیوں سے محفوظ رکھے، یہ چھڑی بجلی کو عمارت پر گرنے سے روکتی نہیں، لیکن جب

بجلی گرتی ہے تو یہ چھڑی اسے لے کر زمین کی طرف منتقل کر دیتی ہے اور بجلی زمین کی گہرائیوں اور وسعتوں میں منتشر ہو کر اپنی شدت و مضرت کھودیتی ہے اور عمارت کو بجلی گرنے سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

### بیمہ کی مختلف قسمیں اور احکام:

بیمہ کی تین قسمیں ہوتی ہیں: (۱) جان کا بیمہ (۲) تقصیری ذمہ داریوں کا بیمہ (۳) جائداد و املاک کا بیمہ۔ پھر طریقہ کار کے اعتبار سے بیمہ کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) تعاونی بیمہ (۲) اجتماعی بیمہ (۳) تجارتی بیمہ (۴) سرکاری بہبود عامہ کی پالیسی کے تحت کیا جانے والا بیمہ، پھر بیمہ بعض صورتوں میں رضا کارانہ ہوتا ہے، جس میں کسی کو شریک ہونے یا نہ ہونے کا پورا اختیار ہوتا ہے، اور بعض مخصوص صورتوں میں بیمہ جبری و قانوناً لازمی ہوتا ہے۔

### تعاونی بیمہ:

تعاونی بیمہ ایسا معاملہ ہے جو افراد کی ایک محدود جماعت کے درمیان ہوتا ہے جس کا مقصد صرف حوادث کے وقت ایک دوسرے کو مدد بہم پہنچانا اور مادی نقصانات کی تلافی کرنا ہوتا ہے، کاروباری منفعہ اور ہوس زرا اندوزی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے، مثلاً تاجر، اہل صنعت، اہل زراعت یا ایک گاؤں، محلے اور شہر کے لوگ تعاون باہمی کی اپنی اپنی یونین قائم کریں اور ان میں کا ہر شخص اپنی کمائی کا کچھ حصہ جمع کرے اور حسب معاہدہ ان میں سے کسی کے بھی حادثہ کی زد میں آجانے کی صورت میں جمع شدہ رقم سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اس کی مدد کی جائے (دیکھئے: عقود التامین للشیخ احمد محمد جمال ۲۶۱)۔

اس طرح کا بیمہ اب قریباً منفقہ طور پر جائز قرار دیا گیا ہے، بیمہ کے شدید مخالفین بھی اس بیمہ کو نہ صرف یہ کہ جائز قرار دیتے ہیں، بلکہ اسے نیک اور قابل تحسین عمل قرار دیتے ہیں۔

عرب دنیا کے مشہور عالم و محقق شیخ ابوزہرہ مصری جو مروجہ بیمہ کے شدید مخالف ہیں وہ

اجتماعی تعاونی بیمہ کو جائز و مباح قرار دیتے ہیں (دیکھئے: ایضاً ۵۱)۔

حضرت مفتی محمد شفیع نے بھی مروجہ بیمہ کے متبادل کے طور پر قریباً اسی قسم کی بیمہ کی تجویز

پیش کی ہے:

”بیمہ کے کاروبار کو امداد باہمی کا کاروبار بنانے کیلئے بیمہ پالیسی خریدنے والے اپنی رضامندی سے اس معاہدہ کے پابند ہوں کہ اس کاروبار کے منافع کا ایک معتد بہ حصہ نصف یا تہائی چوتھائی ایک ریزرو فنڈ کی صورت میں رکھ کر وقف کریں گے جو حوادث میں مبتلا ہونے والے افراد کی امداد پر خاص اصول و قواعد کے ماتحت خرچ کیا جائے گا“ (جواہر الفقہ ۱۸۹/۲)۔

سعودی عرب کے ”ہئیة كبار العلماء“ کے اجلاس ریاض (منعقدہ ۱۳۹۷/۴/۱۳ھ) نے اور ”مجمع الفقہ الاسلامی“ کے اجلاس ”مکہ مکرمہ“ (منعقدہ ۱۰ شعبان ۱۳۹۸ھ) نے اتفاق رائے سے تعاونی بیمہ کے جواز کا فیصلہ کیا۔

”مجمع الفقہ الاسلامی“ کے اجلاس میں شیخ عبدالعزیز بن باز، شیخ محمد محمود الصواف اور شیخ عبداللہ السبیل پر مشتمل کمیٹی کی پیش کردہ تجویز سے جو قرارداد اتفاق رائے سے منظور ہوئی اس میں کہا گیا ہے کہ:

قرر المجمع الفقہی بالاجماع الموافقة علی قرار هیئة كبار العلماء

بجواز التامین التعاونی بدلا من التامین التجاری (عقود التامین ۱۰۶/۱)۔

اس سلسلہ میں مزید دلائل و تفصیلات کے لئے دیکھئے: (عقود التامین ۱۰۶، ۱۰۷، مجلہ الاقتصاد

الاسلامی جمادی الاول ۱۴۰۲ھ)۔

اسی طرح سے جامعہ ازہر میں ہونے والے مجمع الجوث الاسلامیہ کے اجلاس (محرم

۱۳۸۵ھ) میں یہ فیصلہ کیا گیا

”التامین الذی تقوم بہ جمعيات لتؤدی لاعضاءها ما یحتاجون إلیه من

معاونات و خدمات أمر مشروع وهو من التعاون علی البر“ (عقود التامین ۱۰۶)۔

## اجتماعی بیمہ:

یہ بیمہ کی وہ قسم ہے جس کا نظم خود حکومت اپنے ملازمین و موظفین کی بھلائی اور مشکل حالات میں ان کے اور ان کے اہل و عیال کی معونت کے لئے کرتی ہے اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص کی تنخواہ کا کچھ حصہ بیمہ کے نام پر وضع ہوتا رہتا ہے اور حادثہ پیش آنے کی صورت میں اس کو یا اس کے اہل و عیال کو ایک خطیر رقم حکومت کی طرف سے مل جاتی ہے جس سے ناگہانی مشکلات سے نمٹنے میں کافی مدد ملتی ہے، بیمہ کی یہ صورت بھی جائز ہونی چاہئے، کیونکہ یہ تعاون ہی کی ایک صورت ہے، اس میں حکومت کا مقصد کاروبار و تجارت نہیں ہوتا، یہ بیمہ پراویڈنٹ کے مشابہ ہے اور جس طرح پراویڈنٹ فنڈ کو جائز قرار دیا گیا ہے، اسی طرح بیمہ اجتماعی کو بھی جائز قرار دینا زیادہ قرین صواب معلوم ہوتا ہے۔

شیخ ابو ہریرہ جو بیمہ کے شدید مخالف کے طور پر مشہور ہیں فرماتے ہیں:

ان التامینات الاجتماعیة التي تقوم به الدولة ازاء الموظفين والعمال  
أو التي تقوم بها بعض الطوائف صحيحة مباحة وهو تعاون اجتماعي سواء  
كانت اتفاقاً أم فرضاً من الحكومة (عقود التامين ۵۱)۔

## تجارتی بیمہ:

یہ بیمہ کی وہ قسم ہے جو تجارتی کمپنیاں بطور کاروبار کے کرتی ہیں، جن کے پیش نظر لوگوں کی خدمت و تعاون سے زیادہ دولت کمانا ہوتا ہے، اسی وجہ سے اسے تجارتی، یا استر باجی بیمہ کہا جاتا ہے، بیمہ کمپنیاں خاص فنی ذرائع سے خطرات و حوادث کے امکان و وقوع کا دقیق و تفصیلی تجزیہ کرتی ہیں اور ایسا طریقہ کار اختیار کرتی ہیں کہ بیمہ داروں سے اقساط کی وصولی اور حادثات کے شکار افراد کو متعین رقم کی ادائیگی کے درمیان وصولی کا تناسب ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے، ادائیگی کے بعد زائد رقم کمپنی کا حصہ اور اس کا نفع شمار ہوتا ہے، تجارتی بیمہ اور تعاونی بیمہ کے درمیان بنیادی

فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں نفع بھی مقصود ہوتا ہے جبکہ دوسرے کی بنیاد خالص تعاون و امداد باہمی پر رکھی گئی ہے اس میں صرف یہ جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ انفرادی مشکلات سے اجتماعی طور پر نمٹا جائے اور ایک شخص کے صدمات و مصائب کا بوجھل جمل کراٹھا یا جائے۔

استر باہمی بیمہ کے جواز و عدم جواز میں اختلاف رائے ہے، ایک گروہ اس کو جائز قرار دیتا ہے، جبکہ دوسرا گروہ اس کے عدم جواز کا قائل ہے، عرب علماء میں اس پر زور دار بخشیں ہو چکی ہیں، اس کی تائید و تردید میں متعدد مقالے لکھے گئے اور اس پر غور و خوض کے لئے علماء کی متعدد مجالس منعقد ہو چکی ہیں، مؤیدین میں سے سب سے مشہور نام نامور شامی عالم و محقق شیخ مصطفیٰ الزرقاء کا ہے، علماء کی اکثریت اب بھی اس بیمہ کو ناجائز قرار دیتی ہے۔

”بیئۃ کبار العلماء“ اور ”المجمع الفقہی“ کے اجلاسوں میں باتفاق رائے باستثناء شیخ مصطفیٰ الزرقاء تجارتی بیمہ کو ناجائز قرار دیا گیا (دیکھئے: الاقتصاد الاسلامی ج ۱، ۱۳۰۲ھ)۔

مئی ۱۹۵۶ء میں جامع ازہر میں منعقد ہونے والے ”مجمع الجوث الاسلامیہ“ کے اجلاس میں البتہ اس پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکا۔ اس میں تعاونی و اجتماعی بیموں کے جواز کا فیصلہ کیا گیا، مگر تجارتی بیمہ کے متعلق کسی واضح فیصلہ تک نہ پہنچنے کی وجہ سے معاملہ کی مزید تحقیق اور فریقین کے دلائل کے تجزیہ کی تجویز منظور کی گئی اور اس کے لئے علماء شریعت و ماہرین اقتصادیات کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی (تفصیل مذکورہ مجلہ) میں دیکھی جاسکتی ہے)۔

تجارتی بیمہ کے مخالفین کہتے ہیں کہ تعاونی بیمہ و تجارتی بیمہ میں واضح فرق ہے، تعاونی بیمہ اس لئے جائز ہے کہ اس کی بنیاد محض تعاون باہمی پر ہے، وہ ایک عقد تبرع ہے جسے لین دین کے اصول پر منطبق ہونا ضروری نہیں، لیکن وہ بیمہ جو تجارتی اغراض پر مبنی ہو اور جس کا مقصود حصول منفعت ہو وہ تعاون و تناصر کی حدود سے نکل کر معاوضات مالیہ کے معاملات میں داخل ہو جاتا ہے، اس لئے اس کے جواز کے لئے ضروری ہے کہ وہ لین دین اور معاوضات مالیہ کے شرعی اصول و فقہی ضوابط پر پوری طرح منطبق ہو اور ”مبادلۃ مال بالمال“ کی جو شرائط ہیں وہ پورے طور پر اس میں پائی جائیں۔



اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تجارتی بیمہ میں متعدد ایسی خرابیاں نظر آتی ہیں جو عقد معاوضہ کے فساد کی باعث ہیں، مثلاً معاوضہ میں ضروری ہے کہ ہنگام عقد عوضین معلوم و متعین ہوں بصورت دیگر معاملہ غرر کا ہو جائے گا جس کی ممانعت صراحۃً حدیث میں آئی ہے، یہ غرر و مجہولیت مفسد عقد ہے، تجارتی بیمہ کا معاملہ بھی اسی غرر و مجہولیت کا حامل ہے، کیونکہ بیمہ دار و بیمہ کمپنی میں سے کسی کو بھی یقینی طور سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اسے کیا دینا ہوگا اور اسے کیا ملے گا، عوضین میں سے ہر ایک کے تعین کا انحصار مستقبل میں حادثہ کے وقوع و عدم وقوع پر ہوتا ہے۔

اسی طرح اس میں قماریت کی شان پائی جاتی ہے، کیونکہ یہ ایسی خطر جوئی کا معاملہ ہے جو نفع نقصان کے درمیان دائر ہے اور متعاقبین میں سے کسی ایک کا نقصان اور دوسرے کا فائدہ یقینی ہے، لیکن یہ متعین نہیں کہ کون فائدہ میں رہے گا اور کون نقصان اٹھائے گا، اگرچہ چند قسطیں ہی ادا کرنے کے بعد حادثہ رونما ہو گیا ہو، بیمہ دار فائدہ میں رہتا ہے کہ اس کی لاگت سے کافی زائد رقم اسے مل جاتی ہے، جبکہ بیمہ کمپنی کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے، اگر حادثہ پیش نہیں آیا تو کمپنی کا فائدہ ہی فائدہ ہے، جبکہ بیمہ دار کی پوری رقم ڈوب جاتی ہے۔

تیسری چیز جو اس بیمہ کو ناجائز معاملہ بنا دیتی ہے اس میں ربا کا تحقق ہے، بیمہ کا معاملہ ”مبادلہ ائمن بالئمن بکنسہ“ کا معاملہ ہے جس میں معاملہ برابری کے طور پر دست بدست ہونا ضروری ہے، مبادلہ اگر کمی بیشی کے ساتھ ہو تو یہ ”ربا الفضل“ اور ادھار ہو تو ”ربا النساء“ ہے، اور مذکورہ بیمہ میں یہ دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اور ربا کی یہ دونوں قسمیں حرام ہیں۔

تجارتی بیمہ پر یہ تین مضبوط ترین اور بنیادی اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ بقیہ دوسرے اعتراضات یا تو انہیں کے محور پر گردش کرتے ہیں یا وہ معمولی اور بے جان ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: عقود التامین ص ۵۴)۔

جہاں تک غرر کا تعلق ہے تو مویدین کے بقول بیمہ میں کوئی ایسا غرر نہیں پایا جاتا جو منع و فساد کا موجب ہو۔ اگر یہاں غرر ہے تو وہ اتنا معمولی ہے جو مفضی الی المنازعہ نہیں، متعدد ایسے

شرعی نظائر موجود ہیں جن میں صرف مصلحت اور کثرت تعامل کے باعث ضرر لیسر کو گوارہ کیا گیا ہے، اس لئے بیمہ میں وہ اسے گوارہ کیا جاسکتا ہے۔

شبہہ ربا کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ بیمہ کا معاملہ عقد صرف نہیں، کیونکہ وہ نقدین کے ساتھ خاص ہے، اس لئے عقد صرف میں پایا جانے والا ربا یہاں متحقق نہیں ہوتا اور ”ربا الدیون“ اس لئے لازم نہیں آتا کہ بیمہ دار کو جو زائد رقم ملتی ہے وہ کسی ”تاخیر واجل“ کا عوض و مقابلہ نہیں ہوتی جو اس ربا کا لازمہ اور حرمت کی علت ہے، بلکہ یہ رقم اس کو حادثاتی ضرر و نقصان کی تلافی کے لئے ملتی ہے جس کی یقین و ضمانت اسے پہلے سے حاصل ہوتی ہے اور حسب معاہدہ کمپنی ضرر معہود کی تلافی کی پابند ہوتی ہے، اگر حادثہ رونما نہیں ہوتا تو اسے یہ رقم نہیں ملتی، اس لئے اس میں غرتو ہو سکتا ہے مگر ربا نہیں، کیونکہ ربا کا تقاضا یہ تھا وہ زائد رقم اسے بہر صورت ملتی (دیکھئے: مجلہ الاقتصاد الاسلامی، شیخ علی الحنفی کا مضمون ۳۲، ۳۳، ۱۴۰۳ھ)۔

اگر بیمہ دار کا معمولی رقم جمع کر کے حادثہ ہو جانے کی صورت میں کثیر رقم حاصل کرنا ”ربا“ ہے تو یہ ربا تعاونی بیمہ میں بھی پایا جاتا ہے، اس لئے لازم ہوگا کہ اسے بھی ناجائز قرار دیا جائے۔ ضمان اجتماعی، پراویڈنٹ فنڈ جیسی چیزیں بھی اسی زمرہ میں آئیں گی، حالانکہ اب بیشتر لوگ، وہ لوگ بھی جو استر باجی بیمہ کے سخت مخالف ہیں اس کے جواز پر متفق ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: عقود التامین ۹۱-۹۰)۔

تجارتی بیمہ کے سلسلہ میں موافق و مخالف آراء اور ان کے بنیادی مستندات کا ایک اجمالی خاکہ پیش کر دیا گیا۔ فریقین کے دلائل کا تفصیلی ذکر اور مکمل تجزیہ یہاں وقت طلب و باعث طوالت بھی ہے اور غیر ضروری بھی، کیونکہ اس وقت ہمارے زیر بحث اصلاً تجارتی نہیں، بلکہ وہ بیمہ ہے جس سے اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کو سابقہ ہے، جہاں تک اس سلسلہ میں اپنی رائے کا تعلق ہے وہ جواز کے حق میں ہے، اپنے فہم ناقص میں بیمہ کی رو سے بوقت حادثہ ملنے والی رقم نہ

رہا ہے، نہ ہی وہ قمار کے زمرے میں آتا ہے، بیمہ کرنے والا ادارہ محض تعاون کی بنیاد پر چل رہا ہو یا اس میں استر باجی غرض بھی شامل ہو بیمہ دار کے حق میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، بیمہ کمپنی اگر جمع شدہ فاضل رقم یا کوئی اور ناجائز رقم سے سودی کاروبار کرتی ہے تو یہ اس کا اپنا جرم ہے، بیمہ دار کا اس میں کوئی دخل نہیں، اس لئے اس کو بیمہ کے ذریعہ ممکنہ خطرات کے ضرر سے محفوظ رہنے کے عمل سے محروم کر دینا قرین انصاف نہیں لگتا جس کی اہمیت و افادیت کے سبھی معترف ہیں اور ادارہ کے تعاونی ہونے کی صورت میں اس کا جواز سبھی کے نزدیک مسلم ہے۔

### ریاستی و سرکاری بیمہ:

پھر جبکہ مروجہ سرکاری بیمہ کا کوئی اور متبادل موجود نہیں اور ہندوستان کے موجودہ حالات میں جبکہ مسلمانوں کے جان و مال محفوظ نہیں ہیں، اور ہر لمحہ ان کی جان، ان کا مال، ان کی تجارت، ان کی صنعت، ان کے مکانات، ان کی مساجد اور ان کے مدارس خطرہ میں ہیں۔ اور بسا اوقات اس طرح کے واقعات میں حکومت کی غفلت، یا اس کے جانبدار نہ رویہ کو دخل ہوتا ہے، حالانکہ حکومت شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہے، ایسے واقعات کے پیش آ جانے کی صورت میں بچی کچی نسل کے لئے اور ان لوگوں کے لئے جو زندہ توراہ گئے ہیں، لیکن ان کی املاک تباہ ہو چکی ہیں، تجارتیں برباد ہو چکی ہیں، نئے سرے سے زندگی کا شروع کرنا دشوار امر ہوتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ جبکہ آج کی بیمہ کمپنی عام طور پر سرکاری نظم کے تحت چلتی ہے اور حکومت نے انہیں تو میا لیا ہے، لہذا اسکے نفع و نقصان کی ذمہ داری حکومت کی طرف لوٹی ہے، تو کیا مسلمانوں کے لئے یہ جائز ہوگا کہ وہ اپنی زندگی، اپنی تجارت، اپنی صنعت، اپنے مکانات اور اپنی مساجد کا بیمہ کرائیں تاکہ خدا نخواستہ اگر کوئی نقصان ان کو پہنچ جائے تو اس نقصان کی تلافی اور جان و مال کا معاوضہ بیمہ کمپنی سے وصول کر لیں، اس میں اولاً تو اگر زیادہ تعداد میں مسلمان جان و مال کا بیمہ کرائیں گے تو ایسی امید کی جاتی ہے کہ سرکاری ایجنسی جو امن قائم کرنے

کی ذمہ دار ہے وہ فسادات کو روکنے کی زیادہ کوشش کرے گی کہ مسلمانوں کو پہنچنے والے جانی و مالی نقصان کی تلافی سرکار کو ہی کرنا پڑے گی، دوسری طرف خدانخواستہ کوئی واقعہ پیش آ ہی جائے تو مسلمانوں کو اتنی رقم مل جائے گی کہ وہ ان واقعات سے پہنچنے والے نقصانات کی تلافی کر سکیں اور اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے لائق ہو سکیں، اس طرح فساد کرنے والی قوتوں کا وہ نشانہ اور وہ مقصد پورا نہیں ہوگا کہ مسلمانوں کی کمر معاشی طور پر توڑ دی جائے اور ان کو ذہنی طور پر مرعوب کر کے غلامی کی زندگی پر راضی رہنے پر مجبور کر دیا جائے (اقتباس سوالنامہ)۔

ایسی صورت میں میری ناقص رائے یہ ہے کہ مصلحت عامہ و دفع حرج کے لئے اس سرکاری بیمہ کی اجازت دی جانی چاہئے، جیسا کہ ”مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ“ اور بہت سے دیگر علماء و اصحاب فتاویٰ کی رائے ہے، مروجہ بیمہ میں موجود بعض نقائص کا انکار نہیں کیا جاسکتا، مگر میرے خیال میں مصالحوں کا پہلو اس میں غالب و رائج ہے، اس لئے کسی دوسرے متبادل کے نہ ہونے کی صورت میں بالخصوص ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کی اجازت دی جانی چاہئے۔

تعاونی بیمہ کو تو متفقہ طور پر جائز قرار دیا جا چکا ہے، اس پر قیاس کر کے سرکاری بیمہ کو بھی اجتماعی تعاون و تناصر کی ایک جامع اسکیم اور وسیع اقتصادی نظام قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ ظاہراً بیمہ پالیسی میں حکومت کا مقصد عوامی بہبود، معاشی استحکام، اجتماعی خدمت اور آڑے وقت میں لوگوں کو راحت و معنویت بہم پہنچانا ہے، اس لئے کاروباری پیمانے سے ناپنے کے بجائے، کیوں نہ اسے بھی تعاونی بیمہ کی طرح تبرع و تعاون ہی کا معاملہ قرار دیا جائے جو بیمہ کی اصل ہے، ”مجمع الجوٹ الاسلامیہ“ کے اجلاس جامع از ہر (منعقدہ محرم ۱۳۸۵ھ) کے فیصلہ کا یہ حصہ اس موقف کی تائید میں ہے۔

”ان نظام المعاشات الحکومی و مایشبہ من نظام الضمان الاجتماعی

المتبع فی دول آخری کل ہذا امن الأعمال الجائزۃ“ (عقود التامین ۱۰)۔

سرکاری بیمہ پالیسی کے تحت بوقت حادثہ ملنے والی رقم کے متعلق حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ بھی نزم گوشہ رکھتے ہیں:

”حادثہ کی صورت میں جو رقم حکومت سے ملے گی اس کو حکومت کا عطیہ قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ ایسے حالات میں امداد کرنا عموماً حکومتوں کی ذمہ داری سمجھا جاتا ہے، مگر ربا کا معاملہ پھر بھی حرام رہے گا، اس میں نجی کاروبار میں اور حکومت کے کاروبار میں کوئی فرق نہیں“ (جواہر الفقہ ۱۸۶/۲)۔

پھر حضرت مفتی صاحب نے بیمہ کا جو متبادل طریقہ تجویز کیا ہے اس میں اور اس سرکاری بیمہ میں بظاہر کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اگر بیمہ دار اپنی اقساط بہ نیت وقف اس ”ریزرو فنڈ“ کے لئے جمع کریں جس کا مقصد حادثہ زدہ افراد کی حسب شرائط و ضوابط مدد کرنا ہو اس متبادل بیمہ کا نظم کون کرے؟ حضرت مفتی صاحب نے اس کی کوئی تخصیص نہیں کی، میرے خیال میں اس کا نظم و نسق اگر حکومت کے ہاتھ میں ہو تو یہ زیادہ ہی مستحکم اور قابل اطمینان ہوگا، اگر حکومت بیمہ اسکیم سے کوئی ناجائز فائدہ بھی اٹھاتی ہو تو اس کا یہ طرز عمل ناجائز ہوگا، مگر خاص بیمہ دار کی جہت سے مصالح عامہ کے پیش نظر اسے جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ تو سرکاری بیمہ کے متعلق اجمالی اور عمومی گفتگو تھی، مناسب ہے کہ اس بیمہ کی متعدد رائج قسموں پر الگ الگ بھی نظر ڈال لی جائے۔

### سندات کا بیمہ:

یہ بیمہ وہ قسم ہے جس کا ذکر حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے اس طرح کیا ہے:

بیمہ کی ایک قسم سندات و کاغذات اور نوٹوں کا بیمہ ہے، اس کا رواج غالباً کچھ قدیم ہے، اسی لئے علامہ ابن عابدین شامی جو متاخرین میں افضل الفقہاء مانے گئے ہیں انہوں اس کا ذکر ”کتاب الجہاد باب المستامن“ میں بنام ”سوکرہ“ کیا ہے، مگر اس کی جو صورت لکھی ہے وہ موجودہ بیمہ سندات و کاغذات سے کسی قدر مختلف ہے، علامہ شامی نے ان کو بھی ناجائز قرار دیا ہے، مگر انہیں کی تحریر سے بیمہ سندات و کاغذات کی مروجہ صورت کا جواز معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس میں نقل کیا ہے: ”إن المودع إذا أخذ الاجرة علی الودیعة یضمنها إذا هلکت“

(شامی طبع استنبول ۳/۲۵/۳۲۵) یعنی جس شخص کو کوئی سامان بغرض حفاظت دیا جائے اگر وہ اس کی حفاظت کا معاوضہ لیتا ہے تو ضائع ہو جانے کی صورت میں اس پر ضمان واجب ہوگا، ظاہر ہے کہ محکمہ ڈاک وغیرہ جو سندات و کاغذات وغیرہ سر بہر کر کے حفاظت کے وعدے پر لیتا ہے اور اس حفاظت کی فیس بھی لیتا ہے تو ضائع ہو جانے کی صورت میں مذکورہ روایت کی بنا پر ضائع شدہ کاغذات کا ضمان اس پر لازم آئے گا“ (جواہر الفقہ ۲/۱۸۲) بیمہ کی اس قسم کے بارے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

#### ذمہ داریوں کا بیمہ:

یہ بیمہ کی وہ صورت ہے جس میں ایک شخص بیمہ اس لئے کراتا ہے کہ اس وجہ سے اور اس کی کسی کوتاہی وغیرہ غلطی کے نتیجہ میں کسی دوسرے شخص کو پہنچنے والے ضرر و نقصان کی تلافی کی جائے، اس میں بیمہ دار اور بیمہ کرنے والے ادارہ کے علاوہ تیسرے فریق کی حیثیت سے ایک اور شخص بھی ہوتا ہے اور اس بیمہ کا مالی فائدہ حقیقتاً اسی کو پہنچتا ہے (مجلد اقتصاد اسلامی)۔

بیمہ کی یہ قسم اسلامی نظام معاقل سے بڑی حد تک مشابہ اور اس کی روح سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، فرق یہ ہے کہ بیمہ میں فنڈ کا بیٹنگی انتظام کر لیا جاتا ہے، جبکہ نظام معاقل میں یہ انتظام وقوع حادثہ کے بعد ہوتا ہے۔

اسلامی حکومتوں میں اس صورت کے لئے معاقل کا اسلامی نظام ہی نافذ کیا جانا چاہئے مگر غیر مسلم حکومتوں میں اس کے متبادل کے طور پر اس نظام بیمہ کو قبول کیا جاسکتا ہے۔ بعض اہل علم نے اس بیمہ کی عدم حرمت کی یہ دلیل دی ہے:

” والعقد فی هذه الحالة له ثلاث أطراف، دافع القسط و دافع

التعويض و المستفيد والمستفيد هنا لا يبادل مالا وإنما يحصل على تعويض  
كتبرع من الدولة أو شركة التامين ، والدولة أو الشركة تساهم في هذا  
التعويض مع مساهمة المستعمل للسيارة“ (مجلد مذکور مقالہ ڈاکٹر یوسف کمال)۔

پھر اگر یہ بیمہ اختیار و رضا کے دائرہ سے نکل کر جبر و لزوم قانونی کی حد میں داخل ہو جائے تو یہ ایک مجبوری بن جاتا ہے جسے چارونا چار قبول کرنا ہی پڑے گا دیکھئے: عقود التامین / ۷۴، ۷۵۔

### سرکاری ملازمین کا جبری بیمہ:

”مجمع الحجوث الاسلامیہ“ کے اجلاس میں متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا ہے:

ثانیا: نظام المعاشات الحکومی و ما یشبهه من نظام الضمان الاجتماعی المتبع فی دول أخرى کل هذا من الأعمال الجائزة (حوالہ سابق / ۵۱)۔  
شیخ احمد محمد جمال اس کے متعلق کہتے ہیں:

أن نظام التقاعد والمعاشات فی وظائف الدولة وهو الذی یجمع علی جوازه شرعاً علماء الشریعة (عقود التامین / ۹۰)۔

ڈاکٹر حسین حامد حسان اپنی کتاب ”حکم الشریعة الاسلامیة فی عقود التامین“ میں لکھتے ہیں:

”اجتماعی بیمہ کا کاروبار خود حکومت کرتی ہے، یا اس کا انتظام و انصرام وہ اپنے کسی عام ادارے کے حوالہ کر دیتی ہے اور اس کے ذریعہ حکومت عوام کے بعض طبقات کو بعض خطرات سے تحفظ فراہم کرتی ہے، جیسے مزدوروں کے معذور ہو جانے، بیمار پڑ جانے اور بڑھاپے کے خلاف بیمہ کرنا، ہمارے نزدیک اس قسم کا بیمہ کرنا جائز ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں، ہماری اس رائے کی تائید علماء شریعت میں سے بیمہ پر تحقیق کرنے والے تمام محققین کرتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ بیمہ ممانعت کی دلیل تو دھوکہ ہے اور دلیل صرف معاوضہ والے معاملات تک محدود ہے، ہمعادات میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے“ (اردو ترجمہ عبدالرحیم اشرف / ۵۴، بحوالہ جامعۃ الرشاد، جولائی ۱۹۹۱ء)۔

خود اسلامی فقہ اکیڈمی کے سوالنامہ میں یہ صراحت موجود ہے:

”مثلاً سرکاری قانون کے تحت سرکاری ملازمین کا بیمہ زندگی یا گاڑیوں کا بیمہ

یابین الاقوامی منڈیوں میں مال بھیجنے کے لئے مال کا انشورڈ ہونا اگر قانوناً لازم کر دیا گیا ہے تو علماء اس قانونی لزوم کو ایک طرح کا جبر قرار دے کر مجبوری کی حالت میں اس طرح کے انشورنس کی اجازت دیتے ہیں، یعنی ان لوگوں کو اس عمل میں معذور قرار دیتے ہیں“ (سوالنامہ)۔

پھر اس کے بعد اس سلسلے میں مزید کسی بحث و گفتگو کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

### سرکاری مواصلات کے مسافروں کا بیمہ:

یہ بیمہ کی ایسی قسم ہے جس میں سرکاری بسوں، ٹرینوں اور جہازوں کے مسافروں کا بیمہ ہوتا ہے، مسافر جو رقم کرایہ کے طور پر ادا کرتے ہیں اس میں بیمہ کا بھی حصہ ہوتا ہے، اور جب کوئی مسافر حادثہ کی زد میں آ کر ہلاک یا زخمی ہوتا ہے تو اسی بیمہ فنڈ سے اسے یا اس کے اہل و عیال کو معاوضہ ملتا ہے، اس بیمہ کا حکم ظاہر ہے کہ اجتماعی بیمہ سے مختلف نہیں ہوگا، اس کے جواز میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا، یہاں تو ظاہراً حکومت اپنی ہی آمدنی کا ایک حصہ حادثہ زدہ افراد کی مدد کے لئے مختص کرتی ہے اور یہ خالص تعاون و تبرع ہی کا معاملہ نظر آتا ہے۔

### املاک کا بیمہ:

اس کی شکل یہ ہے کہ ”کوئی شخص ایک متعین رقم بیمہ کمپنی کو دیتے رہنے کی ذمہ داری اس شرط کے ساتھ لیتا ہے کہ اگر خدا نخواستہ متعین مدت کے اندر اس کی ان املاک کو کوئی نقصان پہنچا تو ان کی تلافی بیمہ کمپنی کرنے کی پابند ہوگی اور اگر نقصان نہیں ہوا تو اس صورت میں وہ جمع کی ہوئی رقم واپس نہیں ہوگی، یعنی بیمہ کرانے والا اصلاً کسی ملنے والی رقم کے معاوضے میں قسط ادا نہیں کرتا، بلکہ متوقع خطرہ کے نتیجے میں پہنچنے والے امکانی نقصانات کی تلافی کی وجہ سے جو تحفظ و اطمینان وہ حاصل کرتا ہے اس کا معاوضہ وہ ادا کرتا ہے، لہذا انشورنس کی اس صورت میں اپنی جمع کی ہوئی رقم پالیسی لینے والے کو واپس نہیں ملتی“ (سوالنامہ)۔

یہ بیمہ بھی اجتماعی و تعاونی بیمہ کے قیاس پر جائز قرار دیا جاسکتا ہے، میرے خیال میں یہ



اصلاً تجارتی معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ کفالت اجتماعی کا ایک وسیع حکومتی انتظام ہے جس کے تحت حکومت اقساط کی ادائیگی کی شرط پر امکانی مادی نقصانات کی تلافی کا ذمہ لیتی ہے اور وقوع حادثہ کی صورت میں حکومت حسب وعدہ نقصان کی تلافی اس اجتماعی فنڈ سے ترقی کرتی ہے جو بیمہ پالیسی میں شامل بہت سے افراد کی اقساط کی صورت میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ یہ انفرادی نقصان کا اجتماعی طور پر مقابلہ کرنے کا طریق ہے جس کا نظم و نسق حکومت کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اس میں ”رہا“ کا شبہ اس لئے نہیں ہے کہ بیمہ دار جو رقم جمع کرتا ہے وہ واپس لینے کے لئے نہیں کرتا کہ اس سے زائد ملنے والی رقم سود قرار پائے، حقیقتہً وہ رقم اس ”ریزرو فنڈ“ کے لئے جمع کرتا ہے جو حادثاتی نقصان کے لئے مختص ہوتا ہے، ہاں اسے یہ اطمینان ضرور ہوتا ہے کہ اگر خدا نخواستہ اس کی جائداد و املاک کسی حادثہ کی نذر ہو گئی تو حکومت کے ”زیر انتظام جمع شدہ“ ریزرو فنڈ“ سے اس کے نقصان کی تلافی کر دی جائے گی۔

اس میں قمار جیسی بھی کوئی بات نہیں، کیونکہ بیمہ دار کو ملنے والی رقم کسی مصنوعی خطر پر موقوف نہیں، بلکہ اس کی بنیاد واقعی و حقیقی خطرے اور ناگہانی ضرورت پر ہے جس میں وہ شخص واقعی قابل رحم و محتاج مدد ہو جاتا ہے۔ اس کا مقصد قسمت آزمائی و خطر جوئی نہیں خطرات کی زد میں آجانے کی صورت میں اس سے باہر نکلنے کی راہ ڈھونڈنا ہے، مقامر کی ہوس زرکوشی سے اس کا کوئی تعلق نہیں، جس کی امید مرنے پر منحصر ہو اسے امید کون کہے گا۔

اس مجموعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ حکومتی انتظام کا معاملہ تجارتی کمپنیوں کے معاملہ سے مختلف ہے، حکومت کے ذریعہ کیا جانے والا بیمہ اصلاً تعاون اور عوامی کفالت کا معاملہ ہے اور یہ اس کے جواز کی معقول بنیاد بن سکتی ہے، اس لئے ضرورت، حالات اور مصالح کے تقاضے سے املاک و جائداد کے سرکاری بیمہ کو جائز اور اس کے تحت ملنے والی رقم کو مباح قرار دیا جاسکتا ہے۔

جن اسلامی محققین نے بیمہ پر کام کیا ہے اور اس پر خاطر خواہ بحث کی ہے، تقریباً سب

ہی کا تعلق مسلم ممالک سے ہے، انہوں نے اپنے ملک کے پس منظر میں بیمہ سے بحث کی ہے اس لئے ان کی غالب اکثریت نے مروجہ تجارتی بیمہ کو مسترد کر کے اس کا متبادل پیش کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ بیمہ کی افادیت اور موجودہ دور میں اس کے ایک اقتصادی ضرورت بن جانے کا انکار نہیں، لیکن تعاونی و تبادلہ بیمہ کو وسیع پیمانے پر فروغ دے کر یہ ضرورت پوری کی جاسکتی ہے، پھر کیوں کاروباری کمپنیوں کے چکر میں پڑا جائے جو تعاون کے پردے میں لوگوں کا استحصال کرتی ہے (الوزہ، عقود التامین / ۵۴)۔

لیکن خاص ہندوستان کے پس منظر میں جہاں تجارتی بیمہ کمپنیوں کا بھی کوئی چکر نہیں، اور موجودہ بیمہ کا کوئی اور متبادل بھی مسلمانوں کی بساط سے باہر ہے محض بیمہ کی حرمت کا فتویٰ دے کر چھٹی کر لینا مناسب نہیں ہے، یہاں میں استاذ احمد محمد جمال کی عبارت کا ایک اور اقتباس پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں:

”إذن لا بد من قيام نظام للتأمين الإسلامي على غرار البنوك الإسلامية التي أقيمت على نطاق محدود لمواجهة البنوك الربوية... أما أن نظل نمنع و نحرم و نرفض والمشكلات والقضايا تتجدد وتتعدد وظروف الزمان والمكان تتطور و تتغير دون أن نوجد الحلول البديلة والتنظيمات المقبولة شرعا فهذا يأباه الإسلام؛ لأنه يوقع المسلمين في حرج دائم وجهل بدینهم مستمر“ (حوالہ سابق / ۵)۔

### زندگی کا بیمہ:

اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص بیمہ کمپنی کو متعین اقساط اس شرط پر ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے کہ ایک محدود مدت کے اندر اگر خدا نخواستہ اس کی موت واقع ہو جائے تو بیمہ کمپنی اس کے اہل خاندان کو اس کی موت سے پہنچنے والے نقصان کی تلافی کے لئے اتنی مقدار

رقم ادا کرنے کی پابند ہوگی جتنی رقم کا بیمہ کرایا گیا ہے اور اگر بیمہ کرانے والا وہ متعین مدت گزار لیتا ہے اور زندہ رہتا ہے تو وہ اپنی جمع کردہ رقم سود کے ساتھ بیمہ کمپنی سے پانے کا حقدار ہوگا“ (ایضاً)۔

یہ بیمہ املاک کے نیسے سے ذرا مختلف ہے، اس میں بیمہ دار کے دو مقاصد واضح طور پر ہیں اول یہ کہ اس کی کمائی کا کچھ حصہ پس انداز ہوتا رہے جو مدت بیمہ کو پورا کر لینے کی صورت میں بڑھاپے اور بیکاری کے آڑے وقت میں اس کے کام آئے، دوسرا مقصد اپنے خاندان کے مستقبل کی فکر اور ناگہانی مصائب کے وقت ان کو معونت بہم پہنچانے کا انتظام کرنا ہے، اسے حکومت کی یقین دہانی سے اطمینان ہوتا ہے کہ اگر مدت مقررہ میں وہ موت کی نیند سو گیا تو بیمہ کی مقررہ رقم سے اس کے زیر کفالت افراد کو کچھ سہارا مل جائے گا اور کمپرسی کے عالم میں فقر و فاقہ کی احتیاج سے کم از کم وقتی طور پر مامون ہو جائیں گے۔

شرعی نقطہ نظر سے ان میں سے کوئی مقصد برا اور قابل نکیر نہیں، بلکہ نصوص شریعت میں اس کی ترغیب موجود ہے، بیمہ کی اس صورت میں ذرا دشواری اور پیچیدگی ہے، ضرورتاً ایسا بیمہ کرانا اب عام طور پر جائز تسلیم کر لیا گیا ہے مگر اس صورت میں بیمہ دار کو جمع شدہ اقساط سے زائد جو رقم ملتی ہے اس کا کیا حکم ہوگا؟ بیمہ دار یا اس کے اہل خاندان اسے لے کر استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟ یہ ایک مشکل سوال ہے، ”مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ“ کے فیصلہ میں اس کی کوئی وضاحت نہیں، البتہ بعض حضرات نے زائد رقم کو مطلقاً ”ربا“ مان کر ناجائز قرار دیا ہے۔

بیمہ کی مقررہ مدت گذر جانے کے بعد بھی اگر صاحب بیمہ زندہ رہے تو اس جمع شدہ رقم مع کچھ زائد رقم کے اسے واپس مل جاتی ہے، اس لئے جمع شدہ اقساط کو ہبہ وقف جیسے امور پر معمول نہیں کیا جاسکتا، بلکہ واضح طور پر یہ قرض کا معاملہ قرار پاتا ہے، اس لئے زائد رقم لازمی طور سے سود ہوگی، لیکن دوران مدت موت کا حادثہ رونما ہو جانے کی صورت میں جو طے شدہ رقم اسے ملتی ہے اسے سود بھی قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ وہ اجل و مدت کے مقابلہ میں نہیں ہے، بلکہ وہ حادثہ موت کے مادی عواقب و صدمات کے ازالہ و تخفیف کے لئے ہے، اگر حادثہ پیش آیا تو وہ رقم ملتی ہے اور

نہیں پیش آیا تو نہیں ملتی۔

میرے نزدیک اس کی فقہی تطبیق یہ ہے کہ بیمہ دار کی جمع کردہ رقم بشکل قرض کی حیثیت رکھتی ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ فرد کی کمائی کا کچھ حصہ پس انداز ہو کر آڑے وقت کے لئے محفوظ ہو جائے، حکومت اس بچت اسکیم میں شامل ہونے والوں کے لئے اس مراعات کا وعدہ و یقین دہانی کراتی ہے کہ اگر اس کی موت واقع ہو گئی تو اس کے اہل و عیال کی راحت رسانی کے لئے ایک متعین رقم ادا کرے گی، یہ معاملہ میرے نزدیک ”جعلہ بالشرط“ کے مشابہ ہوگا جس کا اصل قرض پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اگر حادثہ مقررہ مدت میں واقع ہو جائے تو حکومت حسب وعدہ متعین رقم دیتی ہے، یہ حکومت کا عطیہ اور ”جعل“ ہوگا، اس لئے اس کا لینا جائز و درست ہوگا، لیکن اگر موت واقع نہ ہو اور مقررہ مدت گزرنے کے بعد جمع شدہ اقساط مع کچھ زائد رقم کے اسے واپس مل جائیں تو یہ قرض کی واپسی منظور ہوگی اور اصل رقم سے زائد جتنی رقم اسے ملے گی وہ ”ربا“ ہوگی جس کا لینا اور استعمال کرنا جائز نہ ہوگا۔



## انشورنس کا مسئلہ

مولانا ابوالکلام شفیق القاسمی المظاہری ☆

عصر حاضر میں انشورنس کی مختلف قسموں میں ”بحری انشورنس“ سب سے قبل وجود میں آیا اور اس سلسلے میں ۱۶۰۱ء میں سب سے پہلا قانون انگریزوں کی طرف سے جاری کیا گیا۔ لیکن یہ بیمہ کمپنی نہیں تھی، بیمہ کمپنی بنانے والے پیارس کے باشندے ہیں چنانچہ ”بحری انشورنس“ کی پہلی کمپنی ۱۶۶۸ء میں پیارس میں شروع کی گئی، اس کے بعد مسلسل کمپنیاں کھل گئیں۔

چونکہ ترکی یورپ سے ملتا جلتا علاقہ ہے اور وہ خلافت عثمانیہ کا ایک مدت تک مرکز رہا ہے، تجارتی تعلقات کی وجہ سے وہاں بھی بیمہ کارواج پڑ گیا بعض حضرات کہتے ہیں کہ اندلس میں اس کارواج اولاً ہوا، اس کے بعد ترکی میں، بہر حال علامہ شامیؒ کے زمانے میں اسلامی ممالک میں اس کا خوب رواج پڑ گیا تھا۔

بری انشورنس:

۱- سب سے قبل لندن میں ۱۶۶۶ء میں انشورنس کرایا گیا جبکہ بہ یک وقت تیرہ ہزار مکانات اور ایک سو گرجا گھر جل کر خاک ہو گئے۔

اس کے بعد امریکہ، جرمن، فرانس اور دنیا کے مختلف ممالک میں آگ سے جلنے کا انشورنس کرایا گیا اور اس کا عام رواج پڑ گیا۔

- ۲- بیمہ زندگی: انیسویں صدی عیسوی کے قریب قریب آغاز ہوا جبکہ لوگوں میں مختلف قسم کے انشورنس کی عادت پڑ گئی، پھر آگے چل کر ہاتھ، پیر، سر وغیرہ کا بھی انشورنس ہونے لگا۔
- ۳- اب تو ہر چیز کا انشورنس ہونے لگا ہے، خواہ وہ انسان کے بدن سے متعلق ہو یا کوئی مادی شئی ہو۔

### انشورنس کمپنی کا بیمہ:

خود انشورنس کمپنیاں اپنا بیمہ دوسری کمپنیوں سے کرتی ہیں، مثلاً دس لاکھ روپے کی انشورنس کی رقم اول الذکر اپنے ممبروں کو دے تو ری انشورنس کمپنی اس کو اس میں سے آدھی یا تہائی رقم دے گی، یا پچاس لاکھ روپے سے زائد رقم اگر اول الذکر کمپنی کو دینا پڑے تو ثانی الذکر پچاس لاکھ سے زائد کی رقم کو ادا کرے۔

اسی پر اکتفا نہیں ری انشورنس کمپنیاں بھی اپنا انشورنس دوسری اس سے بڑی انشورنس کمپنی سے کرتی ہیں جس کا نام RETROCESSION ہے (اعمال الندوة الفقہیۃ بیت التمول الکویتی/۲۶۶)۔

بری انشورنس کمپنی کی بنیاد سب سے قبل کولونیا میں ۱۸۴۶ء میں ڈالی گئی، اسکے بعد سونز ریلینڈ میں بنائی گئی جبکہ برطانیہ میں ۱۹۰۳ء میں ری انشورنس کی کمپنی کی بنیاد رکھی گئی۔

لہذا دو کمیٹیوں کے بیچ انشورنس اس طرح ہوتا ہے جس طرح کے کمپنی اور عام افراد میں ہوتا ہے، لہذا دونوں کا شرعی حکم ایک ہی طرح ہوگا (حوالہ بالا/۲۱۹)۔

### انشورنس کے سلسلہ میں کانفرنسیں:

بیمہ کے متعلق سب سے پہلے دمشق میں (۱/ تا اپریل ۱۹۶۱ء) میں ”اسبوع الفقہ الاسلامی“ میں امام ابن تیمیہؒ کے متعلق کیا گیا۔

اس ہفتہ میں چار بحثیں انشورنس کے متعلق پیش کی گئیں، پروفیسر مصطفیٰ الزرقاء اور پروفیسر عبدالرحمن عیسیٰ نے اس کی اجازت دی۔ پروفیسر الصدیق محمد الامین نے منع فرمایا، شیخ محمد ابو زہرہ نے منع کرنے والوں کی تائید کی۔

الصدیق محمد الامین اور پروفیسر مصطفیٰ الزرقاء کے بیچ میں صرف ایک مسئلہ میں اختلاف تھا، اول الذکر نے اس کو ”عذر للبیع“ قرار دیا جبکہ شیخ الزرقاء نے اس کو تسلیم نہیں کیا (التامین التجاری واعداد التامین فی الصورة المشروعة او الممنوعة / ۱۹۱)۔

### ریاض میں ہدیہ کبار العلماء السعودیہ کی میٹنگ انشورنس کے متعلق

”ہدیہ کبار العلماء“ نے اپنے دسویں جلسہ (منعقدہ ریاض بتاريخ ۱۴ / ۱۳ / ۱۳۹۷ھ) میں انشورنس کے متعلق بحث کی ہے اور اس کے حرام ہونے کا فیصلہ سنایا (مجلہ الحجۃ الاسلامیۃ العدد ۲۶ ص: ۳۳۵)۔

### رابطہ العالم الاسلامی میں انشورنس کے متعلق کانفرنس:

”رابطہ العالم الاسلامی“ کے تابع ”مجمع الفقہ الاسلامی“ نے مکہ مکرمہ میں اپنے پہلے اجلاس میں جو (۱۰ / شعبان ۱۳۹۸ء) میں ہوا، انشورنس کے متعلق بحث و مباحثہ کے بعد اپنا فیصلہ سنایا کہ انشورنس کی تمام قسمیں حرام ہیں۔ یہ فیصلہ اکثریت سے کیا گیا۔ شیخ مصطفیٰ الزرقاء نے اس میں اختلاف کیا کہ وہ اس کی حرمت کے قائل نہیں ہیں (حوالہ بالا / ۳۳۴)۔

### انشورنس اور بری انشورنس کے متعلق جدہ میں کانفرنس:

”منظمتہ المؤمنین الاسلامی کی ماتحتی میں“ مجمع الفقہ الاسلامی“ نے جدہ میں (۱۰ / ۱۶ / بیج الثانی ۱۴۰۶ھ موافق ۲۲ / ۲۸ / دسمبر ۱۹۸۵ء) میں کانفرنس کی اور اس کو حرام قرار دیا۔

### کویت میں انشورنس کے متعلق کانفرنس:

بیت التمويل الكويتي نے (۷/۱۱/۱۴۰۷ھ / ۷/۱۱/۱۹۸۷ء) میں انشورنس اور بینکنگ کے متعلق کانفرنس منعقد کی (اعمال الندوة الشہیہ / ۱)۔

### مکہ مکرمہ میں انشورنس کانفرنس:

”المؤتمر العالمي للاقتصاد الاسلامي“۔

اسلامی اقتصادیات کی عالمی پہلی کانفرنس منعقدہ (۲۱ تا ۲۶ فروری ۱۹۷۶ء) مکہ مکرمہ میں انشورنس کے متعلق بحث کی اور عدم جواز کا فیصلہ کیا (نفس المصدر / ۲۲۳)۔

### انشورنس کی حرمت اور اس کے دلائل:

انشورنس میں غرر پایا جاتا ہے، غرر کے معنی اس جگہ خطرے کے ہیں، غرر وہ ہے جس کا انجام مجہول ہو، ہر سال بیمہ کرانے والا انشورنس کی رقم جمع کرتا رہتا ہے، لیکن حادثہ نہیں آتا ہے وہ ایسی چیز پر خرچ کرتا ہے جس کی مقدار سے وہ واقف نہیں ہے، اسی طرح بیمہ کمپنی کبھی ایک ہی قسط وصول کر پاتی ہے کہ حادثہ پیش آجاتا ہے تو ان کو لاکھوں روپیہ بیمہ کرانے والے کو دینا پڑتا ہے جس کی اس کو امید نہیں تھی، اس سے زیادہ کھلا ہو غرر اور کس چیز میں پایا جاسکتا ہے، حدیث پاک میں ہے:

”عن ابی ہریرۃ: ان النبی ﷺ نہی عن بیع الحصة وعن بیع الغرر“

(راوہ مسلم ۲/۲)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا کنکری والی بیع سے

اور غرر سے۔

”عن ابن عمر أن النبی ﷺ نہی عن بیع الغرر“ (بیہقی ۵/۳۴۴)۔



حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے منع فرمایا ایسی بیع سے جس میں غرر ہو۔  
بیع الحصاة کے متعلق مولانا تقی صاحب عثمانی نے ”فتح الملہم“ میں علامہ ابن الاثیر سے نقل کیا ہے:

(اس کی شکل یہ ہے کہ یوں کہے جب میں کنکری پھینک دوں تو معاملہ مکمل ہو جائے گا اور کہا گیا کہ بیع الحصاة یہ ہے کہ یوں کہے کہ میں نے وہ سامان تم کو فروخت کر دیا جس پر تمہاری کنکری پڑے جب تم پھینکو یا میں نے اتنی زمین بیچ دی جہاں تک تمہاری کنکری پہنچے، یہ سب کی سب فاسد ہے، کیونکہ یہ زمانہ جاہلیت کی بیع اور بیع ہے، اور یہ سب بیع غرر میں داخل ہے، کیونکہ اس میں جہالت پائی جاتی ہے) آگے غرر کے متعلق علامہ ابن الاثیر لکھتے ہیں:

”ما له ظاهر توثره و باطن تکرهه، فظاہره یغری المشتري و باطنه

مجہول“۔

(غرر وہ ہے جس کے ظاہر کو آپ ترجیح دیں اور باطن کو ناپسند کریں، اس کا ظاہر خریدنے والے کو دھوکہ میں ڈالتا ہے اور اس کا باطن مجہول ہوتا ہے)۔  
لیکن غرر میں بھی جو غریب ہو اس کو برداشت کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ علامہ نوویؒ وغیرہ فقہاء نے تصریح کی ہے، علامہ تقی صاحب عثمانی مدظلہ نے غریب میں ہوٹلوں کے کھانے جس میں آدمی متعینہ رقم داخل کر دیتا ہے اور جیسا چاہے موجودہ کھانوں میں سے جو چاہے کھاتا ہے اس کو غریب میں شمار کیا جاتا ہے۔

”لأن الجهالة يسيرة غير مفضية إلى النزاع وقد جرى به العرف والتعامل“۔

کیونکہ معمولی جہالت جھگڑے تک نہیں پہنچاتی ہے، نیز عرف اور تعامل اس میں

جاری ہے۔

بیمہ کی اکثر صورتوں میں غرر فاحش پایا جاتا ہے کیونکہ بیمہ کی تمام قسطیں مجہول ہوتی ہیں اور انشورنس کمپنی کی رقم بھی مجہول ہوتی ہے، عموماً غرر نے اس طرح گھیر لیا ہے کہ گویا وہ غرر تام ہے۔

بیمہ میں ربوا ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ باقی سود رہ گیا اسے چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو، اگر تم نے نہ چھوڑا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے اور اگر توبہ کر لو تو اصل مال تمہارا تمہارے واسطے ہے نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے“ (سورہ بقرہ: ۲۷۹)۔

ربالغت میں زیادتی کو کہتے ہیں، اصطلاح شرع میں ربوا کہتے ہیں اصل قرضہ پر زیادتی کو یا بلا معاوضہ مال پر زیادتی، خواہ یہ بڑی ہو یا چھوٹی۔

”خص فی الشرع علی وجه دون وجه (راغب) هو فضل مال عن العوض فی معاوضۃ مال بمال (مدارک)“

اہل عرب لفظ ”ربوا“ کو اس زائد رقم کے لئے استعمال کرتے تھے جو قرض خواہ اپنے قرض دار سے مہلت کے معاوضہ میں وصول کرتا تھا، جس کو اردو میں سود کہتے ہیں (الحجج الوسیط)۔ ڈاکٹر نعیمی نے اپنی کتاب میں انشورنس میں ربا کس طرح پایا جاتا ہے اس کی بہت واضح انداز میں تشریح کی ہے ملاحظہ ہو ”التائین عند النوازل والحوائج“ لکھتے ہیں:

”یہ بیمہ متبادل عقد ہے جو مال کے بدلہ میں مال ہوتا ہے، بیمہ کے معاملہ میں دونوں عوض نقد ہیں، کیونکہ لوگوں کے درمیان بیمہ کے معاملہ میں وہی مال متعارف ہے نقد میں قرض اور زیادتی دونوں پائی جاتی ہے جنس کے متحد ہونے اور شمیت کی علت پائے جانے کی وجہ سے اور کاغذی نوٹ وغیرہ متبادل کا ذریعہ ہیں۔“

بازاروں میں وہی شمن متعارف ہے اگر اس میں ربوا جاری نہ ہو تو آج کل ربائمنوں میں جاری نہ ہوگا تو ایک ملک میں اس کی کرنسی کے تبادلے کے وقت متماثل اور قبضہ ضروری ہوگا، جب احد البلدین ایک دوسرے سے متاخر ہو جائیں گے، یا ایک کے بدلہ دوسرے میں اضافہ ہوگا

توربا کے پائے جانے کی وجہ سے معاملہ حرام ہو جائے گا، بیمہ مضاربت نہیں جس میں مال بڑھایا جاتا ہو، بلکہ وہ موجودہ مال، یعنی قسط کو اس مال مؤخر کے بدلے بدلنا ہے جو حادثہ کے پیش آ جانے کے بعد دیا جاتا ہے۔“

لہذا یہ حرام ہے، نیز انشورنس میں طرفین اس بات کے متمنی ہوتے ہیں کہ کم دیں اور زیادہ وصول کریں، اس پر اضافہ یہ ہے کہ عام طور سے کمپنیاں وہ سود بھی وصول کرتی ہیں جو قسط کے ادا کرنے میں تاخیر کی گئی تو یہ ظلمہ فوق ظلمہ کا مصداق بنا۔

بیمہ لوگوں کے مالوں کو ناحق کھانے کے معنی میں ہے:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ“ (سورہ نساء: ۲۹)۔

(اے ایمان والو! اپنے مالوں کو آپس میں باطل طور پر نہ کھاؤ)۔

عقد غرر کے حرام ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس میں دوسروں کے مال کو ناحق کھایا جاتا ہے، بیمہ میں چونکہ غرر فاحش ہے، لہذا اس میں دوسرے کے مال کو باطل طور پر کھانا پایا گیا۔

بیمہ میں التزام مالا یلزم ہے:

وہ ضمان جو اس عقد سے پیدا ہوا ہے وہ ”التزام مالا یلزم“ ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس عقد سے پیدا ہونے والے ضمان کو شریعت نہیں مانتی ہے تو گویا اس نے اپنے اوپر لازم کیا ہے ایسی چیز کو جو اس پر لازم نہیں ہے، انسان ایسی چیز کی ضمانت نہیں لے سکتا ہے جس کی مدافعت کی اس کو قوت نہ ہو اور جس کے متعلق اس کو کچھ معلوم نہ ہو، اگر کوئی کمپنی اس کی ذمہ داری لیتی ہے تو وہ ”التزام مالا یلزم“ ہے جو درست نہیں ہے۔

بیمہ کے جواز کے جوابات:

۱- اس آیت سے استدلال کا جواب دیتے ہیں کہ اس آیت سے استدلال درست

نہیں ہے، کیونکہ ہر وہ معاملہ جو طرفین کی رضامندی سے ہے سو وہ تجارت نہیں ہے، غیر مسلموں نے یہاں تک کہا ہے ”إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا“ (سورہ بقرہ: ۲۷۵) کہ بیع ربوا کی طرح ہی ہے اور آج کل ربوی معاملات بھی طرفین کی پوری رضامندی سے ہوتے ہیں، اس لئے ہم اس کو جائز نہیں کہہ سکتے، یہ آیت انہی پر حجت ہے، چہ جائیکہ ان کی دلیل بنے، اس لئے کہ وہ معاملات جس میں غرر ہو اور لوگوں کے مالوں کو ناحق کھایا جائے اور اس میں جہالت فاحشہ ہو ان تمام معاملات کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔

۲- مراد ”عہد“ سے وہ عہد اور وعدے ہیں جو شریعت مطہرہ کے خلاف نہ ہوں، یا شریعت نے اس سلسلہ میں سکوت کیا ہو، بیمہ کا عقد وہ عہد ہے جس میں ربا اور قمار ہے جس سے شریعت نے منع کیا ہے اور تمام عہد کو توڑنا لازم ہے، چہ جائیکہ اسے پورا کیا جائے۔

۳- تیسری آیت: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ“ یہ آیت جنگ کے متعلق نازل ہوئی اگر اس کے حکم کو عام رکھ بھی لیا جائے کہ لوگوں کے ساتھ عام معاملات میں احتیاط برتا جائے تو دیکھا جائے گا یہ احتیاط جائز بھی ہے یا نہیں، جب بیمہ اور ربا غرر سے ملا ہوا ہے تو وہ کیسے جائز ہو سکتا ہے؟

۴- ”تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى“ (سورہ مائدہ: ۲) والی آیت سے بھی استدلال درست نہیں ہے، کیونکہ پوری آیت ہے: ”وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“ جس میں عقد غرر ہو وہ اثم اور گناہ ہے، انشورنس میں ربا کی مشابہت ہے، لہذا یہ گناہ ہوا۔

یہاں یہ واضح رہے کہ تجارتی بیمہ کی حرمت کا فیصلہ رابطہ عالم اسلامی کی مکہ فقہ اکیڈمی نے بھی اپنے اجلاس منعقدہ ۴/۴/۱۳۹۷ھ ریاض میں کیا ہے، البتہ اس کے رکن شیخ مصطفیٰ زرقاء نے فیصلہ سے اختلاف کرتے ہوئے جواز کی رائے دی ہے۔

اسی طرح اسلامی اقتصادیات کی پہلی عالمی کانفرنس (منعقدہ ۲۱/۲۶/۲۰۰۶ء) صفر ۱۳۹۶ھ، ۲۱/۲۶ فروری ۱۹۷۶ء مکہ مکرمہ) میں انشورنس کے متعلق بحث کی گئی اور مندرجہ ذیل فیصلہ کیا گیا:

کانفرنس تمام اسلامی ممالک سے درخواست کرتی ہے کہ اسلامی قوانین کی تکمیل کریں تاکہ قانون اور نظم و ضبط، اقتصادی اور اجتماعی اداروں کی بنیاد اسلام کے اصول، ضوابط اور شریعت کے موافق ہو۔

کانفرنس کی رائے ہے کہ وہ بیمہ جس کو آج کل بیمہ کمپنیاں ایک دوسرے کی مدد اور نصرت کے نام سے کرتی ہیں، وہ شریعت کے موافق نہیں ہے، کیونکہ شرائط جو اس کے حلال ہونے کے متقاضی ہیں وہ اس میں نہیں پائے جاتے۔

جدہ میں ”جمع الفقہ الاسلامی“ نے جو فیصلہ کیا ہے کہ انشورنس کی موجودہ شکل ناجائز ہے۔ سمینار اسی کی تائید کرتا ہے اور اس کا جائز بدل جس کے جواز پر اتفاق ہے وہ بیمہ تعاونی ہے (الفتاویٰ والتوصیات الفقہیہ للیت التمويل الكويتی۔ ۱۱/۱۱/۱۳۰۷ھ)۔

#### خلاصہ بحث:

ہندوستان کے موجودہ حالات میں اگر ہم نے انشورنس کو جائز کہا تو انشورنس کرانے والے زیادہ سے زیادہ دو فی صد مسلمان ہوں گے، محض ان کے لئے ایک شیئ محرم (ربو اوقمار پر مبنی انشورنس) کو ضرورت تسلیم کر کے جائز نہیں قرار دیا جاسکتا، اور نہ اس موقع پر حاجت کو ضرورت کے درجہ میں اتارا جاسکتا ہے۔

اس لئے انشورنس کی تمام قسمیں ناجائز ہوں گی، البتہ گاڑیوں کا انشورنس جو ہندوستان میں جبری ہے، پھر اگر دوسرے غیر متعلقہ اشخاص کو ان گاڑیوں سے اتفاقی حادثات میں کوئی نقصان پہنچ جائے اور انشورنس کمپنی اپنے شرائط اور پابندیوں کے مطابق ان کا تعاون کرے تو ان اشخاص کو قبول کرنا درست ہے، کیونکہ یہ رقم انھیں بھی دی جاتی ہے جنہوں نے بیمہ پالیسی خریدی نہ ہو۔

## سوالات کے جوابات:

## انشورنس کا حکم

☆ مولانا محمد صدر الحسن ندوی ☆

معاشیات میں ”انشورنس“ کو آج کے اس ترقی یافتہ دور میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے، اور مغربی دنیا نے اس کو زندگی کے ہر میدان میں اس طرح داخل کر دیا ہے کہ مشرقی قومیں اس کو اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔

ہندوستان کے طول و عرض میں سرکاری و نیم سرکاری انشورنس کمپنیاں پھیلی ہوئی ہیں اور ٹکنالوجی، اور مشینی دور میں ہر لمحہ خطرات کے بڑھتے ہوئے تناسب کو دیکھتے ہوئے لوگ مختلف اسکیموں کے تحت بیمہ کمپنی کی پالیسی قبول کر رہے ہیں، مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں کے نزدیک حلال و حرام کے واضح تصورات موجود نہیں ہیں، اس لئے وہ لوگ بلا جھجک ہر اس چیز کو اختیار کر لیتے ہیں جس میں ان کو فائدہ دکھائی دیتا ہو یا آئندہ فوائد کے حصول کی امید ہو، لیکن مسلمانوں کے سامنے کسی کام کے آغاز سے پہلے اس کی شرعی و فقہی حیثیت ہوتی ہے کہ آیا یہ کام جائز ہے یا ناجائز، انشورنس کا معاملہ بھی ان ہی معاملات میں سے ہے۔

بیمہ کے رواج سے لے کر آج تک اس موضوع پر علماء نے تحقیقی کتابیں اور مقالات لکھے اور ربا، قمار، غرر کثیر اور شرط فاسدہ وغیرہ اسباب کی بنا پر علماء ہند و پاک اور علماء عرب نے انشورنس کی موجودہ شکل کو ناجائز قرار دیا، اور مسلمان اس حکم پر عمل پیرا ہے اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمان جو حلال و حرام کے مسئلہ میں بہت زیادہ حساس واقع ہوئے ہیں۔

☆ استاذ جامعہ اسلامیہ کاشف العلوم، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

(بعض علماء عرب نے اسے جائز قرار دیا ہے، راقم السطور نے اپنی کتاب ”اسلام اور انشورس“ میں طویل بحث کی ہے)۔

آج سے تقریباً ربع صدی پہلے ”مجلس تحقیقات شرعیہ دارالعلوم ندوۃ العلماء“ نے اپنے اجتماع (مؤرخہ ۱۵/۱۶ دسمبر ۱۹۶۵ء) میں ”انشورس“ کے مسئلہ پر علماء کرام کے ان جوابات کی روشنی میں غور کیا جو مجلس کے سوالنامہ کے پیش نظر ان حضرات نے تحریر فرمایا تھا، اس غور و خوض کے بعد مجلس جس نتیجے پر پہنچی ہے وہ ایک مختصر تمہید کے بعد درج ذیل ہے:

(ملاحظہ کیجئے: یہ فیصلہ اس بحث کے آغاز میں سوالنامہ کے ساتھ)۔

اسلامک فقہ اکیڈمی نے جو اہم حساس اور نازک مسائل پر کئی سیمینار منعقد کر چکی ہے اور اپنی سابقہ روایات کے مطابق ایک اہم موضوع پر بروقت علماء کرام کو اس بار بھی خامہ فرسائی کی دعوت دی ہے، اور وہ ہے ”ہندوستان کے موجودہ حالات میں انشورس کا مسئلہ“۔ اس موضوع پر ہندوستان کے موجودہ حالات میں مذاکرہ علمی کی سخت ضرورت تھی۔ اکیڈمی نے اس سیمینار کو منعقد کر کے ایک اہم ضرورت کی طرف علماء کی توجہ مبذول کرنے اور متفقہ طور پر کسی اہم نتیجے تک پہنچنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اکیڈمی اور اس کے سکریٹری جنرل حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی زید مجدہم کی کوششوں کو بار آور فرمائے اور اسے مسلمانوں کے حق میں مفید بنائے۔

اکیڈمی نے جو سوالنامہ مرتب کیا ہے اس کی روشنی میں چند باتیں پیش خدمت ہیں:

۱- فقہ کا مشہور قاعدہ ہے ”الضرورات تیج الحظورات“ اسی قاعدہ کے پیش نظر جان بچانے کے لئے اکل میتہ کی علماء نے اجازت دی ہے۔

”يجوز اكل الميتة عند المخمصة واساعة اللقمة بالخمر والتلفظ بكلمة الكفر بالاکراهة“

(جان کے لالے پڑ رہے ہوں تو میتہ کا کھانا جائز ہے، اسی طرح اچھو لگنے کے وقت شراب سے لقمہ کو نگلنا اور بہ وقت اکراہ کلمہ کفر زبان سے نکالنا جائز ہے)۔

”الاشباه والنظائر“ کی درج بالا عبارت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ”ضرورت“ کے وقت شئی حرام بھی جائز ہو جاتی ہے، لیکن فقہی اعتبار سے ضرورت کا کیا مفہوم ہے اور فقہاء نے ضرورت کا اطلاق کن چیزوں پر کیا ہے، اس کو واضح کرنے کے لئے ”ضرورت“ کے فقہی مفہوم پر بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

امام شاطبیؒ نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ”الموافقات“ میں اس موضوع پر بڑی اچھی بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

(ضرورت کا مفہوم یہ ہے کہ جس کا وجود دینی اور دنیاوی مصالح کے قیام کے لئے ضروری ہو اور اس کے فقدان کی صورت میں دنیاوی مصالح اپنی صحیح شکل میں باقی نہ رہیں، بلکہ اس میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو جائے اور زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے اور آخرت میں نجات اور نعمتوں سے لطف اندوزی ممکن نہ ہو اور گھانا ہی گھانا حصہ میں آئے)۔

پھر اس جامع مانع تعریف کے بعد ضروریات کی تقسیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ضروریات کی پانچ قسمیں ہیں:

(ضروریات پانچ ہیں: دین کی حفاظت، جان کی حفاظت، نسل کی حفاظت مال کی حفاظت، اور عقل کی حفاظت)۔

ضروریات کی تقسیم کے بعد فرماتے ہیں کہ ان کا تعلق عبادات سے بھی ہے اور عادات سے بھی، ان کا تعلق معاملات سے بھی ہے اور جنایات سے بھی، عبارت ملاحظہ ہو:

ضروریات کا تعلق عبادات، عادات، معاملات اور جنایات سبھوں سے ہے، عبادات میں ایمان مطلق بالشہادتین، نماز اور روزہ کی فرضیت دین کی حفاظت کی خاطر ہے۔

عادات میں ماکولات، ملبوسات اور مسکونات سے ضرورت کا تعلق ہے اور اس طرح کی دوسری چیزیں نسل اور عقل کی حفاظت کے لئے۔

معاملات میں نکاح، بیع اور اس طرح کی دوسری چیزیں نسل اور مال کی حفاظت کے لئے۔



جنایات میں مرتد کا قتل دین کی حفاظت کے لئے اور قصاص اور دیت جان کی حفاظت کے لئے، شراب نوشی پر حد کا نفاذ عقل کی حفاظت کے لئے اور زنا کی حد نسل کی حفاظت کیلئے اور چور کا ہاتھ کاٹنا اور ضامن ہونا مال کی حفاظت کے لئے ہے (الموافقات ۸/۲-۱۰)۔

امام شاطبی نے ضرورت کی یہ تعریف بیان فرمائی کہ جس کے بغیر دینی اور دنیاوی مصالح کا قیام ممکن نہ ہو اور اس کے فقدان کی صورت میں دنیاوی مصالح اپنی صحیح شکل میں باقی نہ رہیں، بلکہ اس میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو جائے۔ اور پھر ضرورت کی متعین پانچ صورتیں بیان فرمائیں:

- |                   |                 |
|-------------------|-----------------|
| الف- دین کی حفاظت | ب- جان کی حفاظت |
| ج- نسل کی حفاظت   | د- مال کی حفاظت |
| ه- عقل کی حفاظت   |                 |

امام شاطبی اور دیگر فقہاء کے اقوال اور ان کی تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شریعت مطہرہ نے ”ضرورت“ کا اطلاق مذکورہ پانچ اشیاء پر کیا ہے (الاشباہ والنظائر، اصول الدین، خلاف، اصول الدین خصصری، الموافقات ۸/۲-۱۰، اصول التشریح مع الاسلامی)۔

علماء کرام کے اقوال کی روشنی میں حاجت کا اطلاق ان چیزوں پر ہوگا جن کی لوگوں کو مشقت اور تنگی دور کرنے کے لئے ضرورت ہو اور جن کے فقدان سے ان کی زندگی ختم نہیں ہوتی، بلکہ ان سے ان کو مشقت اور پریشانی لاحق ہوتی ہے، اسی کے پیش نظر شریعت مطہرہ نے سلم، استصناع، مزارعت اور مساقات کی اجازت دی ہے۔

”ضرورت“ اور ”حاجت“ کے اطلاقات ہمارے سامنے ہیں۔ ان اطلاقات کی روشنی میں موجودہ حالات میں مسلمانوں کے حالات کا جائز لینا ہے کہ موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کو جان و مال کا جو خطرہ درپیش ہے وہ فقہی ضرورت کے ضمن میں آتا ہے یا حاجت کے ضمن میں۔ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ موجودہ ہندوستان میں فسادات روزانہ کا معمول بن

گئے ہیں، اور حکومت ہند کی دستوری ضمانت کے باوجود منظم اور سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مسلمانوں کی نسل کشی اور اقتصادی اعتبار سے ان کو مفلوج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، فسادات کا اگر سروے کیا جائے تو اس بات کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں کہ ہمیشہ ہر فساد میں مسلمانوں ہی کا جانی اور مالی نقصان سب سے زیادہ ہوتا ہے اور روز بہ روز مسلمانوں کی اقتصادی حالت خراب ہوتی جا رہی ہے، نہ ان کی جان محفوظ ہے اور نہ ان کا مال، نہ ان کی تجارت اور نہ ان کی صنعت، اس لئے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ: ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کو جان و مال کا جو خطرہ درپیش ہے وہ فقہی ضرورت کے ضمن میں آتا ہے۔

۲- جان و مال کا جو خطرہ مسلمانوں کو درپیش ہے وہ فقہی ضرورت کے ضمن میں آتا ہے، اس لئے موجودہ حالات میں مسلمانوں کو ”انشورنس“ کی اجازت دی جانی چاہئے تاکہ وہ انشورنس کے ذریعہ اپنی جان و مال کی حفاظت کر سکیں۔ اس لئے کہ مشاہدہ ہے کہ فسادات کے دوران شریکین و عوامی افراد کی جان لینے اور ایسے کاروبار اور تجارت کو نقصان پہنچانے، یا نذر آتش کرنے سے گریز کرتے ہیں جن کے بارے میں ان کو معلوم ہو کہ اس کا انشورنس ہے، بیمہ کی صورت میں اگر دکان (مثال کے طور پر) نذر آتش کر دی گئی تو صاحب دکان کا کوئی نقصان نہ ہوگا، کیونکہ بیمہ کمپنی صاحب دکان کو بیمہ کی رقم ادا کرے گی اور شریکین و عوامی افراد نے جن ناپاک عزائم اور مسموم مقاصد کے تحت اس کی مالی اور اقتصادی حالت کو مفلوج کرنے کی کوشش کی تھی اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوں گے۔

ان حالات میں ہمارے بعض اکابر علماء کی طرف سے انشورنس کے جواز کا فتویٰ موجود

ہے۔ چنانچہ ”فتاویٰ محمودیہ“ میں یہ عبات ملتی ہے کہ:

”اگر کوئی شخص ایسے مقام پر اور ایسے ماحول میں ہو کہ بیمہ کرائے بغیر جان و مال کی

حفاظت ہی نہ ہو سکتی ہو یا قانونی مجبوری ہو تو بیمہ کرنا درست ہے“ (فتاویٰ محمودیہ ۲۴۰/۴)۔

آج کے حالات میں اگر مسلمانوں کو ”انشورنس“ کی اجازت نہ دی گئی تو یہ ایک بہت

بڑی اجتہادی غلطی ہوگی جس کو مستقبل کا مورخ کبھی بھی نظر انداز نہ کر سکے گا۔

۳- چونکہ ضرورۃً ”الضرورات تبیح المحظورات“ کے قاعدہ کے تحت علماء کرام نے ”انشورنس“ کی اجازت دی ہے اس لئے بالاقساط ادا کی ہوئی رقم سے زائد رقم کا استعمال جائز نہ ہوگا، البتہ بالاقساط ادا کی ہوئی رقم سے زیادہ جو رقم مل رہی ہے وہ بیمہ کمپنی میں نہ چھوڑے، بلکہ اسے لے کر بلانیت ثواب ضرورت مندوں میں تقسیم کر دے، لیکن اگر اقتصادی حالت اتنی خراب ہوگئی ہے کہ ادا کی ہوئی رقم سے زائد رقم اگر استعمال نہ کرے تو کاروبار کا پھر سے شروع کرنا ممکن ہی نہ ہو تو بہ قدر ضرورت زائد رقم کو استعمال میں لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

مفتی عبدالرحیم صاحب لاچپوری اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

”الضرریز ال“ کے پیش نظر خطرہ کی چیزوں کو بیمہ کرا لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اس شرط کے ساتھ کہ بیمہ کمپنی میں جو رقم جمع کرائی ہے اس سے زیادہ جو رقم ملے وہ غربا اور محتاجوں میں بلانیت ثواب تقسیم کر دی جائے، اپنے کام میں ہرگز نہ لائی جائے، ہاں اگر خدا نخواستہ خود ہی محتاج ہو جائے تو علماء کرام سے فتویٰ حاصل کر کے بہ قدر ضرورت اپنے استعمال میں لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، فقہی قاعدہ ہے ”الضرورات تبیح المحظورات“ اور یہ نیت رکھی جائے کہ ”اقتصادی حالت درست ہو جانے پر یہ رقم غرباء کو دے دی جائے گی“ (فتاویٰ رحمیہ ۶/۱۳۳-۱۳۲)۔

۴- پالیسی ہولڈر کی جانب سے ادا کی گئی رقم سے زائد رقم جو مرحوم کے ورثاء کو مل رہی ہے چونکہ وہ سودی رقم ہے، اس لئے اس زائد رقم کے استعمال کے عدم جواز کا پہلو راجح معلوم ہوتا ہے۔

ایک بلند پایہ محقق کی رائے ملاحظہ ہو:

”بیمہ کمپنی جو رقم دے رہی ہے وہ لے لی جائے اس رقم میں سے چار ہزار روپے جو مرحوم نے ادا کئے ہیں مرحوم کے ترکہ میں شامل ہو کر ورثاء کو ملیں گے اور جو زائد رقم ہے وہ واجب

التصدق ہے، غیر محتاجوں کو یا کسی رفاہ عام کے کاموں میں دے دی جائے، زائد رقم ایک قسم کا سود ہے، اس کو مرحوم کے ترکہ میں شامل نہیں کر سکتے، اس کو کسی کارخیر میں بلا نیت ثواب خرچ کر دینا چاہئے“ (فتاویٰ رحیمیہ ۱۹۱/۲-۱۹۰)۔

۵- پالیسی ہولڈر کی طرف سے ادا کی ہوئی رقم سے زائد رقم چونکہ سودی رقم ہے، اس لئے اس کو جان، یا مال کا معاوضہ سمجھ کر استعمال کرنا جائز نہ ہوگا، لیکن:

الف: جان کی ہلاکت کی شکل میں اگر بیوہ، اولاد یا ورثاء افلاس کے شکار ہو جائیں اور کوئی ذریعہ معاش نہ ہو صرف مہلک ہی اپنے افراد خاندان کی کفالت کا ذریعہ تھا تو اس شکل میں بہ قدر ضرورت زائد رقم کو استعمال میں لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

ب: اسی طرح مال کے ضیاع کی شکل میں اگر پورا کاروبار ہی متاثر ہو گیا ہو اور اقتصادی حالات کو از سر نو سدھارنے کے لئے بیمہ کمپنی سے زائد ملنے والی رقم کے استعمال پر مجبور ہو تو اس زائد رقم کا استعمال جائز ہوگا۔

۶- انشورنس ضرورتاً ہو، یا جبراً دونوں شکلوں میں جمع کردہ رقم سے زائد ملنے والی رقم سود ہے اس لئے اس کا استعمال جائز نہ ہوگا۔

لیکن جبری انشورنس کی شکل میں اگر پالیسی ہولڈر ملازمت پیشہ ہے اور تنخواہ ملنے کے بعد پالیسی کی رقم ادا نہیں کرتا، بلکہ اس کی تنخواہ سے بلا قسط ماہ بہ ماہ کٹتی رہتی ہے اور اس کی ملکیت میں آنے سے پہلے ہی ادارہ، حکومت یا کمپنی لے لیتی ہے تو اس مخصوص شکل میں بیمہ کمپنی سے ملنے والی زائد رقم کا استعمال جائز ہوگا جو صورت سود ہے، لیکن حقیقتاً سود نہیں ہے۔

پروویڈنٹ فنڈ میں زائد ملنے والی رقم کے استفسار کے جواب میں مولانا تھانوی فرماتے

ہیں:

”تنخواہ کا کوئی جز اس طرح وضع کر دینا اور پھر یک مشنت وصول کر لینا اگرچہ اس کے ساتھ سود کے نام سے کچھ رقم ملے یہ سب جائز ہے، کیونکہ درحقیقت وہ سود نہیں ہے، اس لئے کہ

تنخواہ کا وہ جز جو وصول نہیں ہوا، وہ اس ملازم کی ملک میں داخل نہیں ہوا، پس وہ رقم زائد اس کی مملوک شئی سے منتفع ہونے پر نہیں دی گئی، بلکہ تبرع ابتدائی ہے، گو گورنمنٹ اس کو اپنی اصطلاح میں سود ہی کہے“ (امداد الفتاویٰ ۱۳۹/۳)۔

’فتاویٰ محمودیہ‘ میں بھی اسی سے ملتی جلتی عبارت ملتی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

”یہ جزو تنخواہ ملازم نے خود جمع نہیں کیا، بلکہ یہ سلسلہ حکومت نے اپنے قانون کے پیش نظر جاری کیا ہے جس سے ملازم کی خیر خواہی مقصود ہے، جب تک اس پر ملازم کا قبضہ نہ ہو یہ ملازم کی ملکیت نہیں، لہذا اس پر جو کچھ اضافہ ملتا ہے یہ بھی سود نہ ہوگا، بلکہ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ بعض محکموں میں ملازمت ختم ہونے پر حسن کارکردگی کے صلہ میں پنشن ملتی ہے اس کو بھی سود نہیں کہا جاتا“ (فتاویٰ محمودیہ ۲۲۰/۳)۔

۷۔ بیمہ اور پروویڈنٹ فنڈ میں بنیادی اور جوہری فرق ہے، اس لئے بیمہ کو پروویڈنٹ فنڈ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ پروویڈنٹ فنڈ میں جو زائد رقم ملتی ہے وہ شئی مملوک سے منتفع ہونے پر نہیں دی جاتی، کیونکہ تنخواہ کا جو جز وصول نہیں ہوا، وہ اس ملازم کی ملک میں داخل نہیں ہوا، انشورنس کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، یہاں پالیسی ہولڈر ایک متعین رقم بالا قسط بیمہ کمپنی میں جمع کراتا ہے اور حادثہ، موت یا متعین مدت کی تکمیل کی شکل میں پالیسی ہولڈر کو جو زائد رقم ملتی ہے وہ اس کی شئی مملوک سے منتفع ہونے پر ملتی ہے اور یہی سود ہے، اس لئے اس زائد رقم کا استعمال پروویڈنٹ فنڈ پر قیاس کرتے ہوئے جائز نہ ہوگا۔

۸۔ بعض حضرات نے ابن عابدینؓ کی تحریر کردہ ”شامی“ کی عبارت سے تجارتی سامان اور کارو غیرہ کے حادثہ کی شکل میں ادا کردہ رقم سے زائد مقررہ رقم لینے کی اجازت دی ہے۔ عبارت یہ ہے:

”أسلك هذا الطريق، فإنه آمن وإن أصابك شئى فيه، فإننا ضامن  
فسلكه فأخذ لصوص ماله يضمن القائل تعويضه عما أخذ من ماله“ (حاشیہ ابن  
عابدین ۳۴۵/۳)۔

(اس راستہ کو اختیار کرو، کیونکہ وہ مامون ہے اور اگر تمہیں کچھ نقصان پہنچے تو میں ضامن ہوں تو اگر اس شخص نے اس راستہ کو اختیار کیا اور چوروں نے اس کے مال پر قبضہ کر لیا تو کہنے والا مال کی جو مقدار چلی گئی ہے اس کے عوض کا ضامن ہوگا)۔

میرے نزدیک اس عبارت سے ”تأمين ضد الأضرار“ میں زائد رقم لینے کا جواز ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ:

(الف): ضمان خطر الطريق کی علت فریب دہی ہے، کیونکہ راستہ سے سفر کرنے والا راستہ کے متعلق کچھ نہیں جانتا اور یہ شخص دھوکہ دے کر اس راستہ کے اختیار کرنے کی فہمائش کرتا ہے، اسی لئے اگر اس راستہ سے سفر کرنے والے شخص کو یہ بات معلوم ہو کہ یہ راستہ غیر مامون ہے اور پھر بھی اس راستہ کو اختیار کرے تو ضامن پر ضمان واجب نہ ہوگا۔

”انشورنس“ میں انشورنس کمپنی پالیسی ہولڈر کو دھوکہ نہیں دیتی اور نہ حادثہ کے وقوع پذیر ہونے کے احتمال کی نفی کرتی ہے، بلکہ صرف معاہدہ کی بنیاد پر وہ رقم انشورنس کمپنی ادا کرتی ہے۔

(ب): انشورنس کا تعلق عقود معاوضات سے ہے جبکہ مسئلہ ضمان خطر الطريق تبرع کے ضمن میں آتا ہے۔

(ج): تبرعات جہالت سے فاسد نہیں ہوتے، لیکن عقود معاوضات جہالت فاحشہ سے باطل ہو جاتے ہیں، اس لئے انشورنس (عقد معاوضہ) کا ضمان خطر الطريق (تبرع) پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔

۹- اس مسئلہ میں دو چیزیں قابل غور ہیں:

الف: حمل و نقل کا کام انجام دینے والی کمپنیاں متعلقہ سامان کا خود انشورنس کرا رہی ہیں، اس انشورنس کا تعلق متعلقہ سامان کے مالک سے براہ راست نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق انشورنس کمپنی اور ٹرانسپورٹ کمپنی سے ہے۔

ب: ٹرانسپورٹ کمپنی متعلقہ سامان کے مالک سے اجرت سے زائد رقم لے کر یہ معاملہ طے کر رہی ہے کہ ضیاع و نقصان کی صورت میں متعلقہ سامان کے نقصان کی تلافی کمپنی کی ذمہ داری ہوگی۔

پہلی صورت کا تعلق ٹرانسپورٹ کمپنی اور انشورنس کمپنی سے ہے اور یہ ان دونوں کمپنیوں کا نجی معاملہ ہے، اس سے صاحب سامان کا کوئی تعلق نہیں۔

دوسری صورت میں کیا متعلقہ ٹرانسپورٹ کمپنی کا اجرت سے زائد رقم لینا اور نقصان کی صورت میں متعلقہ سامان کے مالک کا کمپنی سے رقم وصول کرنا جائز ہوگا؟ تو اس سلسلہ میں کتب فقہ کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ صورت جائز ہوگی اور اس کی نظیر کتب فقہ میں ”اجرت علی الحر استہ“ اور ”ودیعت بالاجرة“ ہے۔ اس ضمن میں فقہاء کرام تفسیر کی شرط لگاتے ہیں، یعنی تفسیر اور کوتاہی کی شکل میں ضمان واجب ہوگا۔

اس قاعدہ کے پیش نظر اگر کوئی حادثہ پیش آیا اور اس میں ٹرانسپورٹ کمپنی کی کوتاہی اور تفسیر کو دخل تھا تو نقصان کی تلافی کے طور پر مساوی رقم کا لینا جائز ہوگا، اور اگر تفسیر نہ پائی گئی تو مساوی رقم کا لینا جائز نہ ہوگا۔

لیکن آج کل دیانت داری اس قدر مشتبہ ہو گئی ہے کہ اگر حادثہ میں تفسیر اور عدم تفسیر کی شرط لگائی جائے تو کمپنیاں ہر جگہ عدم تفسیر ہی ثابت کریں گی۔ اور پیسے کے بل بوتے پر بیچ نامہ میں پولیس کو رشوت دے کر اپنے حق میں بیچ نامہ تیار کرائے گی، اس لئے اس صورت میں میری رائے یہ ہے کہ تفسیر اور عدم تفسیر کی شرط نہ رکھی جائے اور ٹرانسپورٹ کمپنی ہر دو شکل میں نقصان کی تلافی کی ضامن ہوگی۔

تفسیر اور عدم تفسیر کے بارے میں فقہاء فرماتے ہیں:

”إن المودع لديه يضمن إذا قصر في حفظ الوديعة فلو هلكت بما لا

يمكن التحرز عنه لا يضمن“ (مجمع الضمانات لابن غانم بغدادی ۳۰۰)۔

(جس شخص کے پاس ودیعت ہو اگر اس نے اس کی حفاظت میں کوتاہی کی تو ضامن ہوگا، اور اگر ہلاکت کا سبب ایسی چیز ہے جس سے بچنا ممکن نہ تھا تو ضامن نہ ہوگا)۔

” الحارث الذی یقوم بالحراسة لا یضمن الأخطار إلا عند

تقصیرہ“ (حوالہ سابق / ۳۴)۔

(چونکہ اگر جو حفاظت کر رہا ہے وہ ضامن نہ ہوگا، مگر کوتاہی کی شکل میں ضامن ہوگا)۔

”إن الضمان للتقصیر“ (تقریرات رافعی مع الرد / ۲۴۷)۔

ضمان کا وجوب کوتاہی کی وجہ سے ہے۔

” لا تضمن بالهلاک إلا إذا كانت الودیعة بأجر“۔

(ہلاکت کی شکل میں ضامن نہ ہوگا، لیکن اگر ودیعت بالاجرة ہو تو ضامن ہوگا)۔

۱۰- انشورنس کمپنیاں چاہے سرکاری ہوں یا نیم سرکاری یا پبلک سیکٹر کی، چونکہ قوانین سمجھوں

کے ایک ہی ہوتے ہیں اور ہر ایک کے لئے قمار اور ربولو لازم ہے، اس لئے حکم مسئلہ پر کوئی فرق نہ

پڑے گا۔





## ہندوستان کے موجودہ حالات میں انشورنس کا مسئلہ

مولانا عتیق احمد قاسمی

انشورنس سے متعلق سوالات کا جواب دینے سے پہلے یہ صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ انشورنس اصلاً شریعت میں جائز نہیں ہے، کیونکہ انشورنس میں ایک یا ایک سے زائد محرّمات کا ارتکاب لازم آتا ہے، مروجہ انشورنس کی بعض صورتوں میں ربا، قمار، غرر جیسے متعدد محرّمات پائے جاتے ہیں، بعض میں صرف ربا اور قمار پایا جاتا ہے، ان محذورات شرعی کے ہوتے ہوئے اصلاً انشورنس کے جواز کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، لیکن جو سوال درپیش ہے وہ یہ نہیں کہ انشورنس اصلاً جائز ہے یا ناجائز۔ بلکہ زیر بحث سوال یہ ہے کہ انشورنس کو اصلاً ناجائز جانتے ہوئے ہندوستان کے موجودہ حالات میں جبکہ مسلمانوں کی جان و مال، صنعت و تجارت وغیرہ کو ہر وقت خطرہ درپیش ہے اور برابر ملک کے مختلف حصوں میں فسادات پھوٹتے رہتے ہیں جن میں مسلمانوں کا زبردست جانی و مالی نقصان ہوتا ہے، ان کی معیشت تباہ ہوتی ہے۔ کیا ان حالات میں مسلمانوں کے لئے شرعاً کوئی گنجائش ہے کہ وہ انشورنس کے ذریعہ اپنی جان و مال کے تحفظ کا راستہ اختیار کریں؟

شریعت مطہرہ میں ربا اور قمار وغیرہ کی جو شدید مذمت وارد ہوئی ہے اس کے پیش نظر تو ایک مسلمان کے لئے راہ عزیمت یہی نظر آتی ہے کہ وہ شدید سے شدید تر حالات میں بھی ایسے معاملات اور اعمال سے بچے جن میں ربا، قمار وغیرہ کی کھلی ہوئی آمیزش ہو، لیکن خود شریعت مطہرہ

نے انسان کی طبعی کمزوری اور اس کے ضعف کا لحاظ کرتے ہوئے بعض شدید تر حالات میں بعض محذورات شرعیہ کو جائز قرار دیا ہے، یا کم از کم ان کے بارے میں رفع اثم کی بات کہی ہے، لہذا فقہ اسلامی کا مستقل قاعدہ ”الضرورات تبیح اللظورات“ جو دراصل کتاب و سنت ہی کے مضامین کی ترجمانی ہے، اسی طرح رفع حرج اور دفع ضرر وغیرہ سے متعلق شریعت کے اصول اس بات کی گنجائش پیدا کرتے ہیں کہ ہندوستان کے پر آشوب اور نازک حالات میں انشورنس کے مسئلہ پر از سر نو غور و خوض کیا جائے۔

۱- کسی مسلمان کا مالی اور مادی منفعت کی خاطر جان، یا مال کا انشورنس کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، لیکن جان و مال کے تحفظ کی خاطر دونوں قسم کا بیمہ کرایا جاسکتا ہے، میرے خیال میں ہندوستان کے موجودہ حالات جو دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں اور فرقہ وارانہ زہر دل و دماغ میں پھیلتا جا رہا ہے، ان کے پیش نظر اسلامی شریعت کی رو سے مسلمانوں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ جان و مال، صنعت و کاروبار کا بیمہ کرائیں، خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ بیمہ کمپنیاں قومپائی جا چکی ہیں اور ان کا نفع و نقصان حکومت کو جاتا ہے۔ یہ حقیقت بھی اب محتاج ثبوت نہیں ہے کہ فسادات بھڑکانے میں فرقہ پرست تنظیموں کے ساتھ حکومتی مشنری کا پورا تعاون ہوتا ہے، یا کم از کم خاموش تعاون ہوتا ہے، موجودہ حالات میں انشورنس کرانے کے جواز و عدم جواز کا تعلق انشورنس کرانے والے کے علاقہ کے حالات اور اس کی نیت سے ہے، اگر انشورنس کرانے والے کے علاقہ کے حالات فرقہ وارانہ صورت حال کے اعتبار سے خراب ہیں، وہاں فسادات ہوتے رہتے ہیں یا فسادات کے لئے ماحول تیار ہے اور کوئی شخص جو ایسے علاقہ کا رہنے والا ہے اپنی جان و مال صنعت و تجارت کے تحفظ کی نیت سے انشورنس کراتا ہے، مادی منفعت اس کے پیش نظر نہیں ہے تو اس کے لئے انشورنس کرانا جائز ہوگا، اس کے برخلاف جس علاقہ میں نہ فسادات ہوئے ہیں اور نہ فسادات کا ماحول بنا ہے (اگرچہ ہندوستان کے بہت محدود علاقوں میں شاید ایسا ہو) اور جان و مال کو کوئی خطرہ درپیش نہیں ہے ایسے علاقہ میں رہنے والے کے لئے محض

مادی منفعت کے حصول کے لئے انشورنس کرانا قطعاً جائز نہیں ہے۔

۲- جس شخص نے جان کا بیمہ کرایا ہے اگر وہ مدت پوری ہونے کے بعد اپنی جمع کردہ رقم سے زائد پاتا ہے تو اس کے لئے اس زائد رقم کا استعمال جائز نہیں ہوگا، بلکہ بینک میں جمع کردہ رقم کے سود کی طرح وہ شخص اس حاصل ہونے والی زائد رقم کو بغیر نیت ثواب فقراء و مساکین پر خرچ کر دے گا، اسی طرح اگر مدت کے دوران ہی بیمہ زندگی کرانے والے کا انتقال ہو گیا اور اس کی جمع کردہ، زائد رقم کے ساتھ اس کے ورثاء کو ملی تو زائد رقم کا استعمال ورثاء کے لئے جائز نہیں ہوگا، بلکہ بینک کے سود کی طرح وہ رقم فقراء کو بلا نیت ثواب دینی ہوگی۔

۳- بیمہ زندگی کرانے والے کا انتقال اگر فسادات میں ہوتا ہے اور اس کے ورثاء کو جمع کی ہوئی رقم سے زائد رقم ملتی ہے تو وہ پوری رقم مرنے والے کے لئے جائز ہوگی اور اس زائد ملنے والی رقم کو مرنے والے کی جان کا تاوان تصور کیا جائے گا۔

۴- دکان یا مکان وغیرہ کا انشورنس کرانے کی صورت میں اگر املاک کی ہلاکت فسادات کی صورت میں ہوتی ہے تو ایسی صورت میں تو کمپنی کی طرف سے دی جانے والی کل رقم بیمہ کرانے والے کے لئے درست ہے، لیکن اگر آفات سماوی یا ناگہانی حادثے میں املاک کی ہلاکت ہوئی تو جمع کردہ رقم سے زائد رقم انشورنس کرانے والے کے لئے جائز نہ ہوگی۔

۵- جن ملازمتوں میں ”جبری انشورنس“ نافذ ہے اور تنخواہ کی ایک خاص مقدار بہ مد انشورنس تنخواہ میں سے کٹ جاتی ہے، اسے پروویڈنٹ فنڈ پر قیاس کرنا درست ہے، پروویڈنٹ فنڈ کے نام پر حاصل ہونے والی رقم کی طرح انشورنس کے نام پر حاصل ہونے والی رقم بھی ملازمین کے لئے جائز ہوگی، لیکن یہ حکم ملازمین کے جبری انشورنس کے ساتھ ہی محدود ہے، اسی طرح جس مقدار میں انشورنس لازمی ہے اس سے زائد کسی ملازم نے انشورنس کر لیا ہے تو انشورنس کے نام پر ملنے والی کل رقم اس کے لئے جائز نہ ہوگی، بلکہ جبری انشورنس والے حصہ کی رقم جائز ہوگی، اس سے زیادہ جائز نہ ہوگی۔

- ۶- کاروغیرہ کے جبری انشورنس کی صورت میں اگر انشورڈ کرائے ہوئے سامان کی ہلاکت فسادات میں ہوتی ہے تو بیمہ کمپنی سے ملنے والی پوری رقم جائز ہوگی اور اگر فسادات کے علاوہ کسی اور حادثے میں کاروغیرہ کو جزوی، یا کئی نقصان پہنچا تو اپنی جمع کردہ رقم سے زائد ملنے والی رقم انشورنس کرائے والے کے لئے جائز نہ ہوگی، زائد رقم فقراء و مساکین کو دے دی جائے۔
- ۷- حمل و نقل کا کام انجام دینے والی اگر تمام کمپنیاں سوالنامہ میں درج انشورنس کی صورت اختیار کرتی ہیں اور نقل و حمل کا کوئی دوسرا اطمینان بخش متبادل نظم موجود نہیں ہے تو مجبوراً ان کمپنیوں سے نقل و حمل کا کام لینا جائز ہوگا، لیکن متعلقہ سامان کے ضائع ہونے یا اسے نقصان پہنچنے کی صورت میں معاوضہ نقصان کے طور پر جو رقم کمپنی سے ملے گی اس میں سے اپنی جمع کردہ رقم کے بہ قدر اپنے استعمال میں لینا جائز ہوگا، زائد ملنے والی رقم بینک کے سود کی طرح بلا نیت ثواب فقراء و مساکین پر صرف کر دی جائے، ہاں اگر وہ کمپنی سرکاری ہو اور سامان کی ہلاکت فساد میں ہوئی ہو تو پورا معاوضہ نقصان جائز ہوگا۔
- مستفسرہ سوالات کے یہ اجمالی جوابات ہیں۔



## ہندوستان کے موجودہ مخصوص حالات میں بیمہ

مولانا محمد عبداللہ سعیدی ☆

شریعت نے جان و مال کی حفاظت کو جو اہمیت دی ہے اس کی بنا پر ہندوستان کے تیزی سے بگڑتے ہوئے حالات جو کہ اب محدود نہیں رہ گئے ہیں اور ملک کے کسی خطہ و حصہ میں مسلمانوں کی حفاظت ظن غالب کے درجہ میں نہیں رہ گئی ہے، ایسے حالات میں ”مجلس تحقیقات شرعیہ“ کی تجویز، نیز بعض اکابر کے فتاویٰ کی روشنی میں یہ درست ہے کہ مسلمان اپنی جان، مال کی حفاظت کی مناسب تدبیر کے قصد و ارادہ سے کم از کم ایسے علاقوں میں انشورنس کرائیں کہ جن علاقوں میں اور اطراف و جوار میں برابر ایسے واقعات پیش آرہے ہیں، یا حالات کے بگڑنے کی وجہ سے کسی وقت بھی ایسے واقعات کے لئے قوی امکانات موجود ہیں۔

مفتی عبدالرحیم صاحب نے مدارس و مساجد کے انشورنس کا فتویٰ دیا ہے (فتاویٰ رحیمیہ ۱۲۶/۶)، اگرچہ یہ فتویٰ برطانیہ سے متعلق ہے، مگر سوال میں جو واقعات اور حالات و خطرات ذکر کئے گئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے ملک کا فرق مؤثر نہیں، اسی طرح عام املاک کے انشورنس کی ہندوستان کے ایک استفتاء کے جواب میں اجازت دی ہے (حوالہ سابق) استاذی مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کے ایک فتویٰ میں ایسے حالات کے پیش نظر جان کے بیمہ کی بھی اجازت دی گئی ہے (فتاویٰ محمودیہ ۲۴/۴)۔

## ۲- مخصوص حالات میں کرائے گئے بیمہ کی زائد رقم:

اوپر ذکر کردہ مخصوص حالات میں کرائے گئے بیمہ سے حاصل ہونے والی زائد رقم کی دو صورتیں ہیں:

اول یہ کہ فسادات کی صورت کے علاوہ کوئی صورت نقصان کی، یا معاہدہ کے مطابق کمپنی سے سرمایہ حاصل کرنے کی پائی جائے۔  
دوم یہ کہ فسادات کی وجہ سے ہونے والے نقصان و ضیاع کی وجہ سے زائد رقم مل رہی ہو اور ملی ہو۔

(الف): پہلی صورت میں یہ بات متعین ہے کہ ایسی کوئی نوبت آنے پر صرف اپنی جمع کردہ رقم کے لینے کا، یا استعمال کرنے کا حق ہوگا، خواہ بیمہ مال کا ہو یا جان کا، اس لئے کہ بیمہ اصلاً حرام ہے، ملنے والی زائد رقم میں سود و قمار دونوں کے پہلو پائے جاتے ہیں، اس لئے جمع سے زائد کا استحقاق نہیں، یا تو زائد نہ لے یا لے کر سود کے مصرف میں لگا دے۔

(ب): دوسری صورت کہ مخصوص حالات کے پیش نظر محض حفاظت کے لئے انشورنس کرایا اور فساد کے نتیجے میں ضیاع ہوا اور اسی کے متعلق سوال کیا گیا ہے تو بہ ظاہر تو اس صورت میں بھی زائد رقم کی وہی حیثیت ہے جو کہ پہلی میں ہے، اس لئے مفتی عبدالرحیم صاحب نے اپنے فتاویٰ میں اس کو سود کی حیثیت دے کر سود کا ہی مصرف اس کے لئے تجویز فرمایا ہے۔

لیکن ہمارے یہاں جو صورت حال ہے کہ محض یہ بات نہیں کہ انشورنس کے نتیجے میں حفاظت پر ایک قسم کا اطمینان ہوتا ہے، بلکہ فسادات کی صورت میں جان و مال کے ضیاع میں حکومت کی بھی شرکت ہوتی ہے، بایں معنی کہ اس کی نااہلی، غیر ذمہ داری و لاپرواہی عموماً پائی جاتی ہے اور مشاہدہ ہے، پھر یہ کہ بہ کثرت حکومت کے عملہ کی کسی نہ کسی درجہ میں دلچسپی و شرکت ہوتی ہے اور انشورنس کی رقم حکومت ہی اپنے خزانے سے ادا کرتی ہے، اگرچہ انشورنس کمپنی کے واسطے سے کیوں نہ ہو کہ یہ سب حکومت کی آمدنی کے ذرائع اور اس کے مالیاتی ادارے ہیں تو گویا

نقصان میں جس کی شرکت و ہاتھ ہے اس سے یہ معاوضہ مل رہا ہے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسی ذمہ داری اصل مجرم اور فاعل پر عائد ہوتی ہے جسے فقہ کی اصطلاح میں ”مُباشر“ کہا جاتا ہے، اور دوسرا جس کا اگرچہ دخل ہو اس پر نہیں جس کو ”متسبب“ کہا جاتا ہے جو کہ ایک درجہ میں واسطہ ہوتا ہے، لیکن اصل فعل و قصور اس کا نہیں ہوتا۔

مگر خود ہمارے فقہاء نے ایسی استثنائی صورتیں ذکر کی ہیں اور یہ کہ فساد زمان کی وجہ سے بعض مواقع میں ”غیر مباشر“ اور ”متسبب“، یعنی ایسے شخص پر ضمان واجب کیا گیا ہے جس کا جرم سے واسطہ ہے اور ایک خاص انداز میں اس کی شرکت ہے جس کی وجہ سے نقصان موجب ضمان سامنے آیا ہے (فتاویٰ رحیمیہ ۱۲۶/۶-۱۳۳)۔

اس لئے اگرچہ حکومت فسادات کے جرم میں مباشر، یعنی براہ راست مجرم اور فاعل و قصور وار نہیں ہوتی مگر اس کی چشم پوشیوں، ایسے حالات میں مجرموں کی صحیح و مناسب سرزنش کیا ایک درجہ ان کی سرپرستی، عملہ کی غفلت، بلکہ عملی شرکت وغیرہ کی پناہ پر وہ بالواسطہ شریک جرم ہوتی ہے، اس لئے کیوں نہ اس جرم غفلت وغیرہ کی وجہ سے اس کو نقصانات کی تلافی کا ذمہ دار قرار دیا جائے اور اس خاص صورت میں ملنے والی زائد رقم کو اس حیثیت سے نقصانات کا معاوضہ قرار دیا جائے اور یوں نقصان کا شکار ہونے والوں کے لئے اس کو لے کر استعمال کرنا جائز قرار دیا جائے۔

جبکہ کم از کم اس قسم کی صورت حال میں ایک رخ اور بھی اس گنجائش کا سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ اگرچہ ہمارے حلقہ و اکابر کا عام رجحان یہ ہے کہ دارالحرب میں بھی سود کا لینا جائز نہیں ہے، مگر معلوم ہے کہ فقہاء حنفیہ کا عمومی نقطہ نظر اور علماء ہند، بلکہ ہمارے اکابر میں کچھ حضرات کا رجحان جواز کی طرف رہا ہے (شاہ عبدالعزیز دہلوی، مولانا عبدالحی لکھنؤ، مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ) اس لئے یہ ایک ”مجتہد فیہ“ مسئلہ ہے اور فسادات میں جس انداز کا نقصان ہوتا ہے معلوم ہے، اس لئے ان مخصوص حالات میں اس مجتہد فیہ مسئلہ میں جواز کے پہلو کو لیا جاسکتا ہے۔

اور کم از کم یہ تو کہا ہی جائے گا کہ ایسی صورت حال میں زائد رقم ضرور ہی لی جائے، اگر حاصل کرنے والا اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے اس کو استعمال نہیں کر سکتا تو دوسرے لوگوں کا بالخصوص غرباء، مزدور و محنت کش طبقہ کہ وہ بالکل ہی برباد ہو جاتا ہے، اس رقم سے ان کا تعاون کیا جائے، انفرادی طور پر کہ وہ غربت و افلاس کی وجہ سے اس رقم کے مستحق ہوتے ہیں، نیز اس رقم سے ایسے رفاہی کام انجام دیئے جائیں کہ جن سے بالخصوص ایسے افراد اپنی ضروریات کے پورا کرنے یا معاش کے حاصل کرنے میں فائدہ اٹھائیں۔

اس کو بھی سوچا جاسکتا ہے کہ بیمہ کرانے والا اگرچہ بالکل تباہ نہیں ہوا ہے، مگر کافی نقصان ہو گیا ہے، اور اسے کاروبار سنبھالنے کے لئے کافی رقم کی ضرورت ہے، ورنہ کاروبار بالکل تباہ ہو جائے گا اور قرض آسان نہیں تو وہ کاروبار کو سنبھالنے کے لئے استعمال کر لے اور بعد میں یہ کرے کہ بیمہ سے حاصل کردہ سب رقم بہ تدریج مصارف میں لگا دے، مفتی عبدالرحیم صاحب کے فتاویٰ میں رفاہی کاموں اور انتہائی ضرورت کی صورت میں خود استعمال کر لینے کی تصریح آئی ہے۔

### ۳- سرکاری ملازمین کا جبری بیمہ زندگی:

بہ ظاہر تو جبری بیمہ زندگی سے حاصل ہونے والی زائد رقم اور پروویڈنٹ فنڈ کی صورت میں ملنے والی زائد رقم میں کوئی فرق سمجھ میں نہیں آتا، اس لئے ایسے بیمہ کی زائد رقم جائز ہے، اس لئے کہ دونوں جگہ صورت واقعہ ایک بنتی ہے۔

پروویڈنٹ فنڈ میں بناء جواز یہ ہے کہ جب اجرت نقد، یعنی روپیہ طے ہو تو اس کا جو حصہ اجیر کے قبضہ میں نہ آئے وہ اس کا مملوک نہیں قرار پاتا، لہذا صاحب معاملہ کی طرف سے اپنے مقرر کردہ لازم قاعدے کے تحت اس کے ساتھ جو اضافہ ہوگا وہ جائز ہے، اس کو ربا کی تعریف و حقیقت سے خارج قرار دیا گیا ہے، اس پر تفصیلی بحث ”جدید مسائل کے شرعی احکام“ نامی رسالے میں موجود ہے۔ پروویڈنٹ فنڈ سے متعلق ایک مفصل حصہ اس رسالے میں شامل ہے، یہ



مفتی محمد شفیع صاحب کا تحریر کردہ اور مولانا محمد یوسف صاحب بنوری وغیرہ کا تصدیق کردہ ہے، جس میں یہ بات بھی آگئی ہے کہ حضرت تھانویؒ نے ”امداد الفتاویٰ“ میں اس بنیاد پر جواز سے رجوع فرمایا تھا، مگر بنیاد یہی ہے اور اس کی تحقیق کی گئی ہے، جیسے کہ امداد الفتاویٰ کے حاشیہ پر مفتی رشید احمد صاحب نے بھی اس کی صراحت کی ہے (جدید مسائل کے شرعی احکام ۵۷-۹۶، امداد الفتاویٰ ۱۵۱/۳)۔

ملازمین کے جبری بیمہ زندگی میں بھی حکومت اپنے جبری ضابطہ کے تحت تنخواہ کا ایک حصہ کاٹ لیتی ہے اور اسی کو بنیاد بنا کر معاملہ کرتی ہے، لہذا اس خاص صورت کے جواز اور اس میں ملنے والی زائد رقم کے جواز میں تو کوئی تردد نہیں معلوم ہوتا۔

#### ۴- املاک کا جبری بیمہ:

املاک (کار و سواریاں وغیرہ) کے جبری بیمہ میں ملنے والی زائد رقم کا اپنے استعمال میں لانا عام حالات میں جائز نہیں ہے، اس کی حیثیت عام بیمہ اور اس رقم کی ہے جو بلاشبہ ناجائز ہے، اس لئے اگر کوئی صورت بیمہ کی وجہ سے رقم کے حصول کی نکلے تو حساب لگا کر زائد رقم کو مصارف سود پر صرف کردے، البتہ اگر ایسے بیمہ کی صورت میں فساد کی وجہ سے ضیاع ہوا اور پھر رقم ملی تو نمبر ۲ کے تحت آئی ہوئی تفصیل کے مطابق حکم ہوگا۔

#### ۵- نقل و حمل کا کام کرنے والی کمپنیوں کا بیمہ:

حمل و نقل کا کام کرنے والی کمپنیاں جو کہ انشورس کے ساتھ سامان پہنچانے کا کام کرتی و ذمہ داری لیتی ہیں ان کا بیمہ جائز ہے اور طے شدہ ضمان و معاوضہ بھی لینا جائز ہے، خواہ کوئی ذریعہ ہو، بڑی، بحری، یا ہوائی، ڈاک یا ٹرانسپورٹیشن، اکابر میں حضرت تھانویؒ، نیز مفتی محمد شفیع صاحب اور ان کے رفقاء مولانا بنوری وغیرہ نے بعض صورتوں کے ضمن میں جواز کی صراحت و تفصیل کی ہے (امداد الفتاویٰ ۱۱۱/۳، ۳۱۰، ۳۱۱، جواہر الفقہ ۱۸۲/۲) اور ایسی صورتوں میں جواز کو مفصل

و مدلل اصول و فروع کی روشنی میں حضرت تھانوی نے ذکر کیا ہے۔

اگرچہ کتب فقہ میں آنے والی تفصیلات کے مطابق اجیر مشترک پر ضمان میں تفصیل و اختلاف ہے اور اس پر بھی ضمان نہیں ہوا کرتا، حتیٰ کہ ضمان کی شرط پر بھی عدم و جوب ضمان کا ہی فتویٰ ذکر کیا گیا ہے، مگر ابن نجیم نے امین کے حفاظت کی اجرت لینے کی صورت میں، نیز اشتراط ضمان کی صورت میں بھی ایجاب ضمان کا اور ضمان کے لینے کے جواز کا ذکر کیا ہے اور حضرت تھانوی نے دونوں ہی مسئلوں سے استدلال فرمایا ہے اور بالخصوص اجرت کی نسبت سے فرمایا ہے:

”قلت فی هذا العقد الذی یقال له ”بیمہ“ یستاجر بالزیادة علی الحفظ قصداً فكان أولى بالجواز من الأجير المشترك الذی یضمن علی العمل“ (امداد الفتاویٰ ۱۶۱/۳)۔

(بیمہ کے معاملہ میں تو زائد پیسہ حفاظت ہی کے مقصد سے لیا جاتا ہے تو اجیر مشترک پر ضمان کی دوسری صورتوں کے مقابلے میں اس میں بدرجہ اولیٰ ضمان کا جواز ہوگا)۔  
امانت کی حفاظت پر اجرت لینے کی صورت میں ضمان کے جواز کی یہی توجیہ ابن نجیم نے بحر میں اور شامی نے رد المحتار میں کی ہے (البحر الرائق ۲۷۸/۸، الاشبہ بحاشیہ ابن عابدین ص ۳۲۳، ۳۲۸، ۳۳۰، رد المحتار ۳۳۰/۳، ۲۵۰/۴، ۴۹۳/۵، ۴۱، ۴۰)۔

## ۶- بینک وغیرہ میں محفوظ کردہ اشیاء کا انشورنس:

گذشتہ مسئلہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اگر بینک وغیرہ میں کوئی سامان اس طرح محفوظ کیا جائے کہ اس کا انشورنس خود بینک نے کیا ہو اور ذمہ داری لی ہو تو یہ انشورنس اور ضمان جائز ہوگا، اس لئے کہ اجرت کے ساتھ حفاظت امانت میں ضمان کے جواز کو ذکر کیا گیا ہے۔

## ۷- ناجائز ٹیکس سے بچنے کے لئے انشورنس:

آج کل یہ بھی ہو رہا ہے کہ انشورنس کرا لینے کی وجہ سے آمدنی کے ٹیکس کا ایک بڑا حصہ

معاف ہو جاتا ہے، اپنی جائز کمائی کو بچانے کے لئے ایسا کرنا جائز ہے، البتہ زائد رقم کو اپنے استعمال میں لانا جائز نہ ہوگا (فتاویٰ رحیمیہ ۱۳۷۶ء)۔

خلاصہ:

- (الف): مجبوری کے حالات میں زندگی یا املاک وغیرہ کا بیمہ کرانا جائز ہے۔
- (ب): جواز کی صورت میں بھی عموماً صرف اپنی جمع کردہ رقم کو اپنے استعمال میں لاسکتے ہیں اور جمع کردہ رقم سے زائد حصہ کو سود کے مصارف میں لگایا جائے گا۔
- (ج): حسب ذیل صورتوں میں جمع کردہ رقم سے زائد لینا اور استعمال بھی جائز ہے۔
- ۱- سرکاری ملازمین کا جبری بیمہ زندگی۔
  - ۲- حمل نقل اور حفظ اشیاء کے معاملات میں کرایا جانے والا انشورنس۔
  - ۳- فسادات کی وجہ سے ضیاع کی بنا پر ملنے والی انشورنس کی رقم۔



## موجودہ حالات میں انشورنس کی شرعی حیثیت

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اس میں شبہ نہیں کہ انشورنس کی مروجہ صورتیں عام طور پر ربوا اور قمار سے خالی نہیں، اور اس سلسلہ میں جو تاویلات بعض اہل علم نے کی ہیں اور معاقل یا موالات وغیرہ کو اس کی نظیر قرار دینے کی کوشش کی ہے، وہ بعید از حقیقت ہے، لیکن مسئلہ اس وقت ہندوستان کے موجودہ حالات میں انشورنس کے جواز اور عدم جواز کا ہے اور اسی تناظر میں (جس کی سوال نامہ میں صراحت ہے) سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں:

۱- ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کی کثرت اور ان فسادات کا اتفاقاً پیش نہ آنا، بلکہ بعض جماعتوں اور تحریکوں کی طرف سے اس کی منصوبہ بند کوشش نے مسلمانوں کے لئے جماعتی اعتبار سے جان و مال اور کاروبار کے انشورنس کو ”حاجت“ ضرور بنا دیا ہے، اور فقہاء کے یہاں قاعدہ یہ ہے کہ عمومی اور اجتماعی نوعیتوں کی حاجتیں ”ضرورت“ ہی کے درجہ میں ہوتی ہیں ”الحاجة اذا عمّت كانت كالضرورة“ (الاشاہ والنظار للسیوطی ۱۷۹) بلکہ فقہاء نے تو انفرادی حاجت کی بنا پر بھی سودی قرض لینے کی اجازت دی ہے ”يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ (الاشاہ لابن نجیم مع الغرر ۲۹۳) اور دفع ضرر ہی کے لئے نہیں، بلکہ کسی چیز کے تعامل اور رواج کو بھی حاجت کی کیفیت پیدا ہونے کے لئے کافی تصور کیا گیا ہے۔

” ومنها الافتاء بصحة بيع الوفاء حين كثر الدين على اهل بخارى

وسكننا بمصر قد سموه بيع الأمانة“ (حوالہ سابق)۔

اسی طرح جن چیزوں میں کاریگروں سے غیر موجود مصنوعات کے خریدنے کا رواج ہو، ان میں رواج و تعامل کو ملحوظ رکھتے ہوئے فقہاء نے ”استصناع“ کی اجازت دی ہے۔

”ثم إنما جاز الاستصناع فيما للناس فيه تعامل إذا بين وصفا على وجه يحصل التعريف، أما فيما لا تعامل فيه ..... لم يجز“ (قاضی خاں ۱۷۹۹)۔

اسی طرح حاجت کی بنا پر ”ضمان درک“ (الاشباہ والنظائر للسیوطی: ص ۱۷۱۸۰ ”ضمان درک“ سے مراد یہ ہے کہ خریداری بیچنے والے سے سامان لینے کے علاوہ مزید ضمانت حاصل کرے کہ اگر اس سامان کا کوئی حقدار نکل آئے تو وہ اس سامان کی قیمت وصول کرے گا) وغیرہ کی گنجائش سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنے جان و مال اور تجارت و صنعت وغیرہ کے سلسلہ میں جس ضرر شدید سے دوچار ہیں وہ مذکورہ حاجتوں سے کہیں بڑھ کر ہے، اس لئے اس اجتماعی حاجت کی بنا پر ہندوستان کے موجودہ حالات میں جان و مال اور تجارت و صنعت کا انشورس جائز ہوگا۔

۲- امت کا اختلاف رحمت ہے اور جہاں دقت پیدا ہو جائے اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علماء کے مشورہ سے قول ضعیف پر بھی عمل کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ شامی نے ”الوان دم حیض“ کے بارے میں لکھا ہے (رد المحتار ۱/۵۱)، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دار الحرب میں عقود فاسدہ کے ذریعہ حصول مال مسلمان کے لئے جائز ہے، یہ رائے گودلائل کے اعتبار سے مرجوح ہے، لیکن بالکل بے اصل نہیں، ایسا ملک جو دار الحرب ہو، لیکن اہل اسلام سے اس کی مصالحت ہوگئی ہو، گویا ان کی حیثیت معاہدین کی ہوگئی ہو، امام محمدؒ کے حسب تحریر ان سے بھی عقود فاسدہ جائز ہے۔

”فلو أن أهل دار من دار الحرب وادعوا أهل الاسلام فدخل إليهم مسلم وباعهم الدرهم بالدرهمين لم يكن بذلك بأس، لأن بالموادعة لم تصر دارهم دار الاسلام“ (الشرح الكبير ۴/۱۴۹۳)۔

(اگر دار الحرب کے لوگ اہل اسلام سے صلح کر لیں، پھر کوئی مسلمان ان کے ملک میں جائے اور دو درہم کے بدلہ ایک درہم خرید کر لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اس لئے کہ اس

مصالحات کی وجہ سے ان کا ملک دارالاسلام نہیں بن جاتا)۔

ہندوستان میں بھی یہاں کی حکومت اور غیر مسلم شہریوں کو ایک حد تک ”موادعین“ کی فہرست میں رکھا جاسکتا ہے، پس ایک طرف مسلمانوں کی یہ اجتماعی حاجت اور دوسری طرف فقہ حنفی میں یہ گنجائش، اس بات کا جواز فراہم کرتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو جان، مال، تجارت اور کاروبار کے انشورنس کی اجازت دی جائے۔

۳۔ انشورنس کرانے والا اگر مقررہ مدت پوری کر لے تو اس کے لئے اپنی جمع کی ہوئی رقم تو جائز ہوگی ہی، مزید جمع کرتے وقت سونے کی جو قیمت رہی ہو اور وصول کرتے وقت قیمت میں جو اضافہ ہوا ہو اس کی بھی وہ اس رقم میں سے تلافی کر سکتا ہے، مثلاً پچاس ہزار روپے اس نے جمع کئے اور اس وقت اس کے ذریعہ جتنا سونا خریدا جاسکتا تھا، اب اتنا ہی سونا کچھتر ہزار روپے میں دستیاب ہو سکتا ہے تو اضافی رقم میں سے مزید پچیس ہزار روپے لینا درست ہوگا، ہر چند کہ خود یہ مسئلہ بھی متفق علیہ نہیں کہ کرنسی کے لین دین میں اس کی قدر کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟ لیکن امام ابوحنیفہؒ کی ایک رائے کے مطابق چونکہ دارالحرب میں اس رقم کے لینے کا جواز پیدا ہوتا ہے، اس لئے مذکورہ صورت میں روپے کی قدر ملحوظ رکھنے میں شاید کوئی قباحت نہیں۔

۴۔ اگر درمیان میں اس کی موت واقع ہو جائے اور پالیسی کی پوری رقم اس کے ورثہ کو دی جائے تو اس کا بھی وہی حکم ہونا چاہئے جو زندگی میں اس رقم کے ملنے کا ہے۔

۵۔ اگر فسادات میں جان و مال کی ہلاکت یا ضیاع ہو تو ایسی صورت میں کمپنی کی طرف سے دی گئی رقم حکومت کی طرف سے فریضہ حفاظت کی ناکامی کی وجہ جان و مال کا معاوضہ ہے۔ کیونکہ رعایا کی حفاظت حکومت کی ذمہ داریوں میں سے ہے۔

۶۔ سرکاری ملازمین جن کا جبری لائف انشورنس کرایا گیا ہو اور ان کی تنخواہ سے ماہ بہ ماہ متعین حصہ وضع کر لیا جاتا ہو اور مقررہ اصول کے مطابق بعد میں وہ رقم ادا کی جاتی ہو، اجرت ہی کا ایک جز تصور کیا جاسکتا ہے، اس کے وہی احکام ہونے چاہئیں جو پروویڈنٹ فنڈ کے ہیں۔

۷- کاروغیرہ کے انشورنس کی وہ خاص صورت جس میں حادثہ پیش نہ آنے کی صورت میں کچھ نہیں ملتا، اور حادثہ پیش آنے کی صورت میں اسے مقررہ رقم مل جاتی ہے، اس صورت میں قمار کی جہت نسبتاً خفیف ہو جاتی ہے، اس انشورنس کے ذریعہ حاصل ہونے والی رقم، یا ہلاک شدہ شئی کے بدل کو جائز ہونا چاہئے، اور اس سلسلہ میں مالکیہ کے اس اصول سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے کہ کسی معاملہ کے بغیر بھی وعدہ لازم ہو جاتا ہے، اور نقصان کی صورت میں وعدہ کرنے والے پر اس نقصان کا عوض ادا کرنا ضروری ہو جاتا ہے (جواہر الفقہ ۲۰۰۲، بحوالہ فتح العلی ۱/۲۵۵)۔

۸- فقہاء نے بر بناء مصلحت صانع کو ضامن قرار دیا ہے، حالانکہ اس کی حیثیت محض ایک اجیر کی ہے، چنانچہ دوسرے فقہاء کے علاوہ امام ابو یوسف اور امام محمد بھی اجیر کو اس کا ضامن قرار دیا ہے:

”وقال محمد و أبو یوسف فی الأجر أنه ضامن ورویا ذلك عن علی وخالفا ذلك أبی حنيفة بالرأى“ (اصول للمیزدوی ۳/۹۷)۔

علی ہذا القیاس حمل و نقل کا کام انجام دینے والی کمپنیوں سے ضائع شدہ سامان کا معاوضہ جائز اور درست ہونا چاہئے۔ اسی طرح فقہاء نے مال امانت کی حفاظت پر اجرت ادا کرنے کی شکل میں امین کو ضامن قرار دیا ہے۔ پس ایسی کمپنیوں سے معاوضہ حاصل کرنے کے جواز پر اس فقہی جزئیہ سے بھی روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔



## ہندوستان کے موجودہ پس منظر میں انشورس کا مسئلہ

مولانا زبیر احمد قاسمی ☆

اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انشورس کی جتنی صورتیں آج کل مروج ہیں تقریباً سب ہی میں قمار و ربوا کا عنصر بہر حال پایا جاتا ہے، اس کے علاوہ تمام ہی صورتوں میں کسی نہ کسی درجہ میں ”تعاون علی الاثم“ کی معصیت کا ارتکاب بھی لازم آتا ہے، اور اپنی جگہ یہ حقیقت بھی مسلمہ ہے کہ قمار و ربوا، یا ”تعاون علی الاثم“ ہر ایک کی حرمت پر نص قطعی موجود ہے، اس لئے انشورس کی کسی صورت کو جائز کہنا یقیناً مشکل ہے، لیکن جب سوال یہ سامنے لایا جائے کہ جس طرح مہیتہ و دم وغیرہ کی حرمت منصوص ہوتے ہوئے اضطرار کی ایک استثنائی صورت میں اس کے استعمال کی اجازت دی جاتی ہے تو کیا اسی طرح انشورس کے فی نفسہ ناجائز ہونے کے باوجود کسی مخصوص حالت میں بہ طور استثناء ایک مسلمان کے لئے اس کی اجازت دی جاسکتی ہے؟ تو ظاہر ہے کہ یہ سوال غور طلب بن جاتا ہے۔

آج ملک میں امن و سکون کی جو غیر یقینی صورت حال ہو چکی ہے اور فرقہ وارانہ فسادات نے جس طرح عموم و شیوع کے ساتھ ایک وبائی شکل اختیار کر لیا ہے اور ہر جگہ آئے دن ”برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر“ اور پھر ان کی جان و املاک کی جیسی ہلاکت و بربادی ہوتی ہے وہ آئے دن کا ایک مشاہدہ ہے۔ الامان والحفیظ۔ یقیناً یہ لمحہ فکر یہ ہے اور ان حالات میں یقیناً

☆ ناظم الجامعۃ العربیۃ اشرف العلوم، کنہواں، بیتا مڑھی۔



یہ سوال اپنی جگہ خاص اہمیت اختیار کر چکا ہے، میری نظر میں ضرورت ہے کہ رخص ابن عباسؓ کو دلیل راہ بنا کر شریعت کے اصول و قواعد کی روشنی میں اس کا کوئی ٹپک دار حل تلاش کیا جائے۔ دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں مسلمانوں کی جان و املاک کی بربادی جس سطح اور جس تسلسل کے ساتھ ہر مختصر وقفہ کے بعد ہونے لگی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ موجودہ دور میں اس مسئلہ کے اندر جمود کی بجائے توسع کی راہ ضرور اختیار کی جائے، ورنہ خطرہ ہے کہ مسلم عوام شریعت اسلامیہ کے احکام کے متعلق کسی سوئے ظنی کا شکار نہ ہو جائے۔

بالخصوص جب تجربہ و مشاہدہ کی شہادت یہ مل رہی ہے کہ انشورنس کے بعد ان کمپنیوں کی طرف سے فساد یوں کے دست برد سے ہر بیمہ شدہ جان و املاک کی خاص طور پر حفاظت کی کوشش کی جاتی ہے اور اس طرح فی صد نہیں تو پینچانوے فی صد تحفظ بھی ضرور مل جاتا ہے، ادھر دین میں بے سر، رفع حرج اور دفع ضرر کا مطلوب ہونا بھی ایک بدیہی امر ہے، گویا مختلف محرکات و مقتضیات ایسے جمع ہو گئے ہیں جو اس مسئلہ میں گنجائش نکالنے کا جواز فراہم کر رہے ہیں۔

جہاں تک میں نے غور کیا تو ہمیں اولاً: وہی مسئلہ اضطرار مقنن علیہ بننے کے لائق نظر آیا، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح ایک مضطر کو جب اپنی جان کی ہلاکت و بربادی کا ظن غالب ہو جاتا ہے اور اسکی حفاظت کا بہ ظاہر اسباب اکل میہ کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں رہتا ہے تو جان بچانے کی حد تک شریعت اسے اکل حرام کی اجازت دے دیتی ہے، تقریباً یہی صورت حال آج ہر مسلمان کے سامنے ہے، یعنی ہر آن مسلسل فسادات کے سبب جان و مال کی ہلاکت و بربادی کا ظن غالب ہے اور ایسے مواقع میں اپنی جان و املاک کی حفاظت کا بہ ظاہر کوئی ذریعہ و سامان انشورنس کے سوا ان کی قدرت میں نہیں، ایسی صورت میں جبکہ جان و املاک کی حفاظت مقاصد شریعت میں بھی داخل ہے، کیا مقصد شریعت کے حصول کے ارادے سے اس واحد ذریعہ حفاظت، یعنی انشورنس کی اجازت نہیں دی جاسکتی؟ اپنا خیال تو یہی ہے کہ ملک کی موجودہ بے امنی نے ہر آن مسلمانوں کی جان و املاک کی بربادی کو جس حد تک تقریباً یقینی بنا دیا ہے اس

کی بنا پر آج کا مسلمان اپنے تحفظ و بچاؤ کے اس واحد راستہ انشورس کو اختیار کرنے پر بظاہر مجبور ہو چکا ہے، اور مسلمانوں کی حالت اگر ایک مضطر کی نہیں تو ایسے محتاج کی ضرورت بن چکی ہے جس کی حاجت ”تنزل منزلة الضرورة“ ہو کرتی ہے، اس لئے درحقیقت ”انشورس“ آج وقت کی ایک ناگزیر ضرورت بن گئی ہے، اس کی اجازت مخصوص شرطوں کے ساتھ ضرور دینی چاہئے۔

ثانیاً: ہمارے فقہاء کرام کا وہ مشہور قاعدہ میرے سامنے آیا جو غالباً: ”إنما الأعمال بالنیات“ اور ”الأمور بمقاصدها“ جیسے اصول کی روشنی میں وضع کیا گیا ہے۔ ”کم من سئى یثبت ضمناً لا یثبت قصداً“ (یعنی ازحاشیہ ہدایہ ۵۲/۳) یعنی بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا قصد ارتکاب جائز نہیں ہوتا، مگر دوسرے امر مقصود کے ضمن میں اگر اس کا ارتکاب بطور لزوم ہو جائے تو وہ لائق صرف نظر ہے، اسے گوارا کر لیا جاسکتا ہے، فقہ میں اس کے بہت سے نظائر ملتے ہیں، یہاں بطور توضیح اس کی صرف ایک نظیر پیش کی جا رہی ہے:

فقہ کا معروف مسئلہ ہے کہ اگر ایسے دو نابالغ بچے جن کے درمیان رشتہ و قرابت اور محرمیت کا علاقہ پایا جاتا ہو کسی ایک شخص کی ملکیت میں جمع ہو جائیں تو مالک کے لئے شرعاً اس کی اجازت نہیں کہ بیع و ہبہ کے ذریعہ دو ملکیتوں میں دے کر ان میں تفریق کر دی جائے، یہ بچوں کے لئے ایجاب و اضرا ہے: ”من لم یرحم صغیرنا فلیس منا“ (الحدیث) کے تحت داخل ہے، جس کے متعلق جناب محمد رسول اللہ ﷺ سے وعید بھی منقول ہے، فرماتے ہیں:

”من فرق بین والدہ و ولدہا فرق اللہ بینہ و بین أحبته یوم القیامۃ“

(حوالہ سابق)۔

چنانچہ ایک موقع سے جناب رسول اللہ ﷺ نے دو چھوٹے غلام جو دونوں آپس میں بھائی بھائی تھے حضرت علیؑ کو عنایت فرمایا تھا اور جب کچھ دنوں کے بعد دریافت فرمایا: ”ما فعل الغلامان“ (دونوں غلام کیا ہوئے) تو حضرت علیؑ نے جواب دیا: ”بعث احدہما“ (ایک کو تو میں نے بیچ ڈالا)، تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ”أدرک“ ”أدرک“ یا ”أردو أردو“ تم نے ایک غلط کام کیا اس کی تلافی کرو یا، فرمایا اسے واپس لے آؤ۔

مگر اس صریح ممانعت اور وعید شدید کے باوجود ہمارے فقہاء لکھتے ہیں:

”لو كان التفریق لحق مستحق لا بأس به، كدفع أحدهما بالجناية

وبيعه بالدين ورده بالعيب، لان المنظور إليه دفع الضرر لا الإضرار به“

جس کا حاصل یہی ہے کہ گوان بچوں کے درمیان محض تفریق کے ارادے سے اس کی بیع جائز نہیں، لیکن اگر مقصود اور اصل مٹح نظر کسی حق واجب کی ادائیگی، یا اپنی ذات سے دفع ضرر ہو، گرچہ اس کے ضمن اور نتیجے میں بچوں کی باہمی تفریق بھی ہو جائے تو جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں اور بطور توجیہ مزید لکھتے ہیں:

”إنما حصل الإضرار بالصغير ضمنا لحق مستحق فلا يلتفت إليه،

لأنه كم من شئى يثبت ضمنا لا يثبت قصداً“ (یعنی حاشیہ ہدایہ ۵۲/۳)۔

اس شرعی اصول اور فقہی نظیر کی بنیاد پر میرا خیال یہ ہے کہ اگر انشورنس کرانے سے اصل مقصود صرف بہ درجہ مجبوری جان و املاک کی حفاظت اور ضرر کا دفعیہ ہو، مال کا کسب و اضافہ پیش نظر نہ ہو تو اصل مقصود کے حسن اور شرعاً مطلوب ہونے کے سبب اس کی اجازت ملنی چاہئے، گواس کے ضمن میں ربو او قمار سے تلوٹ بھی ہو جائے، فلا نلتفت إليه ولكن نستغفر الله۔

مذکورۃ الصدر تمہیدی تفصیلات اور اجمالی جواب کے بعد انشورنس کی مروجہ صورتوں کے متعلق میری ذاتی رائے حسب ذیل ہے: فإن أصبت فمن الله وإلا فمنى ومن الشيطان“۔

۱- چونکہ آج مسلسل فسادات ہی کے سبب مسلمانوں کی جان و املاک کی حفاظت کا مسئلہ اہمیت اختیار کر رہا ہے اور اسی کے پیش نظر دفع ضرر کے طور پر انشورنس کی ضرورت کا احساس ابھر رہا ہے اور اس کی اصل حقیقت یہی ہوتی ہے کہ پالیسی ہولڈر کی جان و املاک کی حفاظت کا بیمہ کمپنی ضمانت لیتی ہے، یعنی اولاً اور اصلاً انشورنس ایک عقد کفالت ہے، اور ثانیاً موجب عقد کے مطابق حفاظت میں ناکامی کے بعد تلافی نقصان کی ذمہ دار بنتی ہے، اور عقد کفالت کی صحت کے لئے شرط ہے کہ کفیل مکفول بہ کی تسلیم پر قادر ہو، غیر مقدور التسلیم شئی کی

کفالت قطعاً صحیح نہیں ہوتی، مشہور قاعدہ ہے ”الالتزام بما لا يقدر علی وفائہ باطل“۔ اب دو صورت ہمارے سامنے ہے، ایک فسادات کی بربادیوں سے حفاظت، اور دوسری آفات و حادثات سے حفاظت، اور ظاہر ہے کہ فسادات کی ہلاکت و بربادی میں انسانی ارادہ و اختیار کو دخل ہوتا ہے اور اس سے حفاظت و بچاؤ کی ممکنہ تدبیر میں کسی نہ کسی درجہ میں کمپنی کے تحت القدرہ بھی ہوتی ہیں، لیکن قدرتی آفات و حادثات میں کسی انسانی قصد و ارادہ کو ہرگز دخل نہیں ہوتا، بلکہ تکوینی طور پر اس کا ظہور ہوتا ہے، اس سے حفاظت و بچاؤ کی کوئی تدبیر انسان کے دائرہ اختیار میں نہیں، جس کا حاصل یہ نکلا کہ پہلی صورت یعنی فسادات سے حفاظت و بچاؤ کمپنی کے تحت القدرہ ہے لیکن دوسری صورت میں حفاظت غیر مقدر و التسلیم ہوتی ہے، اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ صرف فسادات کی متوقعہ بربادیوں سے جان و املاک کے تحفظ کے لئے انشورنس کی اجازت دی جاسکتی ہے کیونکہ اس صورت میں انشورنس کرانا دراصل ایک جائز و مشروع عقد کفالت کا معاملہ ہوتا ہے کیونکہ اس انشورنس یعنی کفالہ میں مکفول بہ، یعنی حفاظت مقدر و التسلیم ہوتی ہے، اور اسی چیز کا کمپنی التزام کرتی ہے جس کے وفا پر اسے قدرت ہوتی ہے تو اس طرح اولاً اور قصداً یہ محض ایک صحیح عقد کفالہ ہوا، گوضمناً اور تبعاً ربوا و قمار سے تلوث بھی ہوتا ہے۔

بخلاف دوسری صورت کے، یعنی قدرتی آفات و حادثات سے جان و املاک کی حفاظت وہ کمپنی کے اختیار سے باہر کی بات ہے، جسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس صورت میں مکفول بہ، یعنی حفاظت کی تسلیم خارج از قدرت ہے اور عقد کفالہ کی صحت کی شرط ہی مفقود ہے، ایسی صورت میں انشورنس کرانا کسی عقد صحیح کی طرف بڑھنا نہیں، بلکہ اولاً و قصداً ہی ربوا و قمار کا معاملہ کرنا لازم آتا ہے، اس لئے اس کی اجازت دینی مشکل ہے، بلکہ ”التزام ما لا يقدر علی وفائہ باطل“ کے قاعدہ کے مطابق اسے بالکل یہ عقد باطل ہی کہا جاسکتا ہے۔

اس طرح خلاصہ یہ نکل آیا کہ موجودہ دور میں صرف فسادات سے جان و املاک کی حفاظت کے ارادے سے انشورنس ایک مسلمان کرا سکتا ہے، اور پھر فسادات ہی کے نتیجے میں اگر جان و املاک کی بربادی ہو تو حسب معاہدہ بیمہ کمپنی سے جتنی بھی رقم ملے بطور ہرجانہ و تاوان پالیسی

ہولڈر، یا اس کے ورثہ کو کل رقم لینا اور اپنے استعمال میں لانا جائز کہا جاسکتا ہے، لیکن قدرتی آفات و حادثات سے اگر بربادی ہو جائے تو پالیسی ہولڈر، یا اس کے ورثہ کو اتنی ہی رقم لیننی جائز ہوگی جتنی انہوں نے مختلف اقساط میں جمع کی ہوگی، زائد رقم کو ربو و قمار کے ذریعہ حاصل شدہ سمجھ کر صدقہ کرنا ضروری ہوگا، اور یہی حکم اس صورت میں بھی ہوگا، جبکہ پالیسی ہولڈر اپنی طبعی موت سے مر جائے، خواہ کل اقساط کے جمع کرنے سے پہلے مرے، یا بعد میں۔

۲- اگر کوئی شخص انشورنس کرائے تو محض فسادات سے تحفظ کے لئے، مگر ہلاکت و بربادی ہو جائے قدرتی آفات و حادثات سے اور کمپنی کا قاعدہ ہے کہ املاک، یعنی دکان، مکان اور گاڑی وغیرہ کے انشورنس کی صورت میں مدت معینہ میں وہ املاک کسی طرح برباد نہ ہو تو جمع کردہ رقم بالکل سوخت ہو جاتی ہے اسے واپس نہیں ملتی جسے تحفظ و اطمینان کا معاوضہ کہا جاتا ہے، ہمارا خیال ہے کہ املاک کے انشورنس کی شکل میں قدرتی آفات و حادثات سے اگر بربادی ہو جائے تو کمپنی سے ملنے والی رقم میں سے صرف جمع کردہ اقساط والی رقم لے لے بقیہ کو واجب التصدق سمجھے۔

۳- سرکاری ملازمین کے جبری بیمہ زندگی کے نتیجے میں گورنمنٹ کے ضابطہ کے مطابق جب اور جتنی رقم ملے اسے پروویڈنٹ فنڈ پر قیاس کر کے ملازمین یا اس کے ورثہ کا اسے لینا اور استعمال کرنا جائز کہا جاسکتا ہے۔

۴- حمل و نقل کا کام انجام دینے والی کمپنیاں جب سامان کا انشورنس کرتی ہیں تو اس کی حیثیت ہمارے خیال میں حفاظت بالا جرۃ کے معاملہ کی قرار دی جاسکتی ہے اور اس کا حکم مودع بالا جرۃ یا اجیر مشترک جیسا ہونا چاہئے، یعنی اگر سامان کی بربادی میں اس کی تعدی، یا حفاظت میں کوتاہی کو دخل ہوگا تو مکمل نقصان کا معاوضہ بہ طور تاوان لینا جائز ہوگا، ورنہ دیانتہً اسے اپنی جمع کردہ رقم کے برابر ہی لینا صحیح ہوگا، گو اس میں بھی ایک خلجان ہے، مگر معاہدہ کے سبب اس رقم کی واپسی کی گنجائش ہو سکتی ہے، لیکن زائد رقم کو تو بہر حال واجب التصدق سمجھنا ہوگا، کیونکہ یہ ربو و قمار کی راہ سے حاصل شدہ ہوگا، بقیہ دیگر قسم کے انشورنس کا جواز ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

## انشورنس کے شرعی احکام

مفتی عزیز الرحمن فتح پوری، ممبئی

اس امر میں تو کسی قسم کا شک بھی ممکن نہیں کہ شریعت اسلامیہ ایک محکم، ہمہ گیر، کامل و مکمل، دائمی اور ہر دور، ہر معاشرے اور ہر خطے کے تقاضوں کے عین مطابق ہے، نیز پیش کرنے والی تمام ممکنہ حالتوں اور سوالوں کا حل اپنے اندر رکھتی ہے، اس میں بھی شک نہیں کہ شریعت کے بنیادی اصولوں میں سے کتاب و سنت کو اصل مرجع کی حیثیت حاصل ہے۔ اور کتاب و سنت، آثار و اجماع ہی کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرات مجتہدین و فقہاء امت نے ایک مکمل قانونی مجموعہ مرتب کر کے امت کو دے دیا ہے، تاکہ وہ ہر قدم پر شریعت کے حکم سے واقف ہو کر اس کے مطابق زندگی گزار سکیں، تاہم ہر عہد کی معاشرتی سطح، معاملات وغیرہ ایسی صورتیں بھی پیش کرتی رہی ہے جن کا تصور اس سے پہلے نہ تھا، حضرات فقہاء کرام ایسی صورتوں کو ”حوادث الفتاویٰ“ کا نام دیتے ہیں اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس طرح کی پیش آمدہ صورتوں میں یہ حضرات شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے کتاب و سنت کی اصولی ہدایتوں اور فقہی جزئیات کو سامنے رکھ کر ان حوادث اور جدید معاملات کا شرعی حکم بھی واضح کرتے چلے آئے ہیں جو عام لوگوں کے لئے رہنمائی کا سبب بنا، آج بھی ایسے معاملات درپیش ہیں اور آئندہ بھی ایسی صورتیں سامنے آتی رہیں گی جو حوادث الفتاویٰ کا مصداق کہلائیں گے۔ اور بحمد اللہ اسلامی شریعت نے جس طرح ماضی میں ان معاملات کا حل پیش کیا ہے، اور حال اور مستقبل میں بھی قیامت تک اس میں یہ صلاحیت مسلم ہے۔

”انشورس“ یعنی بیمہ کا معاملہ بھی ایسا ہی ایک معاملہ ہے جس کا وجود قرونِ اولیٰ اور فقہاء متقدمین کے دور میں ہرگز نہیں تھا، بعد کے سالوں میں بھی اس کا اتہ پتہ کہیں نہیں ملتا، یہی وجہ ہے کہ فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں بھی اس سے تعرض نہیں کیا گیا۔ علامہ شامیؒ نے سب سے پہلے اس کا تذکرہ کیا ہے اور وہ بھی اس کی ایک ابتدائی صورت تھی جس میں وہ تمام مفاسد بھی نہیں تھے جو انشورس کی موجودہ شکلوں میں پائے جاتے ہیں۔

موجودہ دور میں انشورس کی سینکڑوں اقسام ہیں جن کو تین قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱- املاک کا بیمہ، ۲- ذمہ داریوں کا بیمہ، ۳- زندگی کا بیمہ۔

بہ ظاہر ان کے کچھ فوائد بھی نظر آتے ہیں اور اس سے کہیں زیادہ بیان کئے جاتے ہیں، مگر جہاں تک فوائد کی بات ہے اصلاً یہ حکم شرعی کی بنیاد نہیں بنتے۔

سب سے پہلی شرط ہوتی ہے مفاسد شرعیہ سے خالی ہونا، قرآن نے خمر و میسر کے متعلق ”فیہما اثم کبیر و منافع للناس“ کہہ کر اس طرح تمام ذہنی کاوشوں کے لئے سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی، کچھ فوائد ضرور ہو سکتے ہیں، مگر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں، بیمہ کی ہیئت ترکیبی کو دیکھتے ہی یہ سمجھ میں آ جاتا ہے کہ جو خرابیاں اس میں پائی جاتی ہیں وہ نصِ قطعی کی رو سے ناجائز ہیں، اور کتاب و سنت نے دو ٹوک الفاظ میں ان کی قباحت و شاعت اور قطعی حرمت کو بیان کر دیا ہے۔

سب سے پہلی چیز تو ربوہ ہے جس کی حرمت قرآن و حدیث کی واضح تصریحات سے ثابت ہے، اللہ رب العزت نے حرام ربوہ کہہ کر قیامت تک کے واسطے اس کے حرام ہونے کا اعلان فرما دیا ہے، حدیثِ پاک میں سودی کاروبار میں ملوث تمام ہی اشخاص کو لعنت کا مورد قرار دیا گیا ہے، ایک دوسری روایت کے مطابق سود کے ستر درجے ہیں جن میں سے ادنیٰ درجہ کا گناہ ماں کے ساتھ بدکاری کے مثل ہے، یہاں یہ بحث بھی فضول اور محض ذہنی اتج ہے کہ جو زیادہ رقم حاصل ہوتی ہے اس پر شرعی ربوہ کا اطلاق ہوگا یا نہیں، اس لئے کہ لغوی و اصطلاحی ہر لحاظ سے یہ وہی ربوہ ہے جسے شرع نے حرام اور ناجائز کہا ہے اور جس کی حرمت کو بڑے شد و مد کے ساتھ

قرآن وحدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

سود کے علاوہ یہ معاملات قمار کو مشتمل ہیں جس کی حرمت میں کسی کو کلام نہیں اور جسے قرآن کریم نے گندگی اور شیطانی عمل کا مصداق بتایا ہے، ربوا اور قمار کے علاوہ بھی بعض امور ایسے ہیں جو کسی بھی عقد کو فاسد کر دیں، مثلاً یہ شرط کہ بیمہ پالیسی لینے والا اگر کچھ قسطیں بھرنے کے بعد روک دے تو اس کی تمام جمع شدہ رقم ضبط ہو جائے گی، یہ تو وہ بنیادی امور ہیں جن کی حرمت روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے اور جنہیں انشورس کی موجودہ صورتوں کے لئے اجزائے ترکیبی کی حیثیت حاصل ہے، ان کے علاوہ دیگر نقصانات اور خرابیوں کو شمار کرنا چاہیں تو وہ بھی کچھ کم نہیں، جن میں سے ہر ایک بذاتِ خود بیمہ کے ظاہری فائدوں والے روشن پہلو کو تارک سے تارک بنا دینے کے لئے کافی ہے، مگر موضوعِ نفسِ بیمہ کے بجائے بعض مخصوص حالات میں اس کی اجازت سے متعلق ہے، اس لئے ضرورت تو مندرجہ بالا سطور کی بھی نہیں تھی، تاہم ایسے مفاسد پر مشتمل معاملے پر کسی درجہ میں بھی گفتگو سے پہلے بہر حال ان ساری باتوں کو ذہن میں رہنا ہی چاہئے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ہندو پاک ہی نہیں تقریباً تمام اسلامی دنیا کے تمام علماءِ بیمہ کے عدم جواز کے قائل ہیں، بجز معدودے چند اشخاص کے، جن کے دلائل بھی نص کے مقابلہ میں طفلِ تسلیوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے، تاہم مسئلہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے اکابر جو اسی ایک مسئلہ میں نہیں، الحمد للہ تمام ترقیبی مسائل میں حد درجہ محتاط ہیں اور اس سلسلے میں نہ تو وہ جذبات کی رو میں بہکتے ہیں، نہ شرعی اصولوں سے انحراف کرتے ہیں، نہ ہی ان کے یہاں کوئی بے ضرورت غیر شرعی پلک پائی جاتی ہے، جب انہوں نے تقسیم کے بعد ہونے والے منصوبہ بند فسادات کے تسلسل کا مشاہدہ کیا اور اچھی طرح محسوس کر لیا کہ اس منصوبے کے پس پشت مسلمانوں کو تباہ کرنے کی ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔

چنانچہ فسادات کا حملہ زیادہ تر انہیں علاقوں میں پہلے ہوتا ہے جہاں کسی لحاظ سے مسلمان مالی حیثیت سے کچھ بہتر ہوں، یا مقامی طور پر کوئی صنعت و حرفت ان کے پاس ہو اور اسی پر بس نہیں کہ بلوائی آکر لوٹ مار، غارت گری اور کشت و خون کر کے چلے جاتے ہیں، بلکہ کہیں



کہیں تو یہ سلسلہ مہینوں چلتا رہتا ہے اور حکومت کے جو ادارے اس کو روکنے کے ذمہ دار ہیں وہ ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہتے ہیں۔

مزید ستم یہ کہ اکثر و بیشتر اداروں سے تعلق رکھنے والے افراد بلوائیوں سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ سطح تک کوئی ایکشن ان پر نہیں لیا جاتا، محسوس یہ ہوتا ہے کہ گویا نیچے سے اوپر تک سب یہی چاہتے ہیں کہ جس طرح ہو سکے مسلمانوں کی معیشت، معاشرت اور ان کے تشخص کو تباہ کر دیا جائے، اس دردناک حقیقت کو یہ چشم خود ملاحظہ کر لینے کے بعد ہمارے ان محتاط ترین اکابر نے بھی مسلمانوں کو یہ اجازت دی ہے کہ ان حالات میں وہ اپنے املاک وغیرہ کا بیمہ کرا سکتے ہیں، اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ ذمہ دار ادارے جب یہ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کی تباہی کا پورا بار حکومت یا قومی خزانے پر پڑ رہا ہے اور جو مقصد تھا وہ بھی حاصل نہیں ہو پاتا تو فسادات کو روکنے کی منصوبہ بندی کریں گے، اس طرح ممکن ہے کہ موجودہ صورت حال تبدیل ہو جائے، ثنائاً: اس تباہ کاری کے نتیجے میں جو لوگ بالکل تہی دست ہو جاتے ہیں اور حالات ان کو اس مقام پر لاکھڑا کرتے ہیں کہ جو کل تک خود صدقہ خیرات کرتے رہتے تھے آج صدقات و خیرات اور ریلیف کی رقوم حاصل کر کے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور شرعاً وہ صدقات واجبہ کے مستحق بن جاتے ہیں، بیمہ کی صورت میں اس تباہ کاری سے محفوظ رہیں گے اور جو لوگ بالکل تہی دست ہو چکے ہوں بیمہ کے ذریعہ ان کے نقصانات کی تلافی ہو سکے گی۔

قانونی دشواریوں وغیرہ کی بنا پر جو بیمہ کرانا پڑے اس کی اجازت بھی ان حضرات نے دی ہے۔ مفتی نظام الدین صاحبؒ بیمہ کے عدم جواز کا حکم تحریر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

”البتہ اگر بقائے ملازمت کی خاطر قانون حکومت سے مجبور ہر کر بیمہ زندگی کرانا پڑے یا کسی خطہ کے ملکی حالات ایسے خراب و خطرناک ہو جائیں کہ بغیر بیمہ کے جان و مال کا تحفظ مشکل ہو جائے تو ان مجبوریوں میں بوجہ مجبوری اس بیمہ کی اجازت ہوگی، البتہ اس بیمہ میں جمع کی ہوئی اپنی رقم سے زائد رقم ملے اس کو مسلم غرباء و مساکین کو دے دینا ضروری ہے“ (نظام الفتاویٰ ۴۰۲)۔

مفتی عبدالرحیم صاحب لاچپوریؒ فرماتے ہیں: قانون ”الضرر یزال“ کے پیش نظر

خطرے کی چیزوں کا بیمہ کر لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اس شرط کے ساتھ کہ زیادہ رقم جو ملے وہ غرباء اور محتاجوں میں تقسیم کر دی جائے، اپنے کام میں ہرگز نہ لی جائے، ہاں اگر خدا نخواستہ خود ہی محتاج ہو جائے تو علماء کرام سے فتویٰ حاصل کر کے بہ قدر ضرورت اپنے استعمال میں لینے کی گنجائش ہے اور یہ نیت رکھی جائے کہ اقتصادی حالت درست ہو جانے پر یہ رقم غرباء کو دے دی جائے گی (فتاویٰ رجمیہ ۶/۱۳۳)۔

”مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ“ کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ ضرورت شدیدہ کے پیش نظر اگر کوئی شخص اپنی زندگی یا اپنے مال یا جائداد کا بیمہ کرے تو مذکورہ بالا ائمہ کرام کے قول کی بنا پر شرعاً اس کی گنجائش ہے۔ لہذا پہلے سوال کا جواب یہی ہے کہ موجودہ حالات میں جبکہ ملک کا کوئی خطہ محفوظ نہیں رہا اور کچھ کہا نہیں جاسکتا ہے کہ کب کہاں کیا ہو جائے، مسلمانوں کو املاک وغیرہ کے بیمہ کی اجازت دینی ہی چاہئے اور انھیں بھی چاہئے کہ اجتماعی پیش رفت کر کے ان خطرات کو دفع کرنے کی یہ بھی ایک کوشش کریں۔

۲- زائد رقم کے استعمال کے سلسلہ میں محتاط قول تو وہی ہے جو حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوروی کے فتاویٰ میں ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی شخص یا اس کے پسماندگان فساد کے نتیجے میں بالکل محتاج ہو جائیں تو یہ رقم استعمال کر سکتے ہیں، بے ضرورت نہ استعمال کی جائے، بلکہ اسے صدقہ کر دیا جائے۔

البتہ فقہاء کے نزدیک ”ضمنان بالسبب والدلالات“ کا قول بھی ہے، جیسا کہ ”تنقیح الفتاویٰ الحامدیہ“ کی عبارت ہے:

”سئل فیمن تعلق برجل و خاصمه فسقط من المتعلق به شئی فضاع، هل یضمن المتعلق (الجواب) نعم یضمن المتعلق به، كما صرح بذلك فی العمادیہ، من أنواع الضمانات بالسبب والدلالات ومثله فی الفصولین“

اس کتاب میں یہ بھی ہے:

”علی الساعی ضمان ما هلك بسعایتہ ویعلو بمنزلة المودع إذا دل

السارق على سرقة الوديعة صيانة لأموال الناس الخ، والفتوى اليوم بوجوب الضمان على الساعي والفتوى على قول محمد في زماننا زجراً لهم وصيانة لأموال الناس“ (۱۶۴/۲-۱۶۵)۔

ان عبارتوں کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر کسی مقام پر فسادات میں سرکاری ادارے ملوث پائے جائیں اور حکومت فریضہ حفاظت سرانجام نہ دے تو ظاہر ہے کہ نیچے والے عموماً اوپر کے اشارے کے بغیر کچھ نہیں کیا کرتے۔

لہذا اس صورت میں یہ رقم جان و مال کا معاوضہ تصور کیا جائے، اور حضرات علماء کرام کو شرح صدر ہو جائے تو استفادہ کو درست قرار دے دیں، مگر یہ اجازت فسادات کی تباہ کاریوں ہی کے ساتھ خاص ہوگی، عمومی حکم نہیں لگایا جاسکتا ہے۔

۳- ”جبری بیمہ“ کی جو صورت بہ طور مثال تحریر کی گئی، یعنی سرکاری ملازمین کا بیمہ پر قانونی طور سے مجبور ہونا، اس میں بہ درجہ مجبوری بیمہ پالیسی کی تو گنجائش ہے، مگر زائد رقم کے استعمال کو جائز کہنے کی یہاں کوئی وجہ نہیں پائی جاتی، نہ ضمان بالسبب والدلالات وغیرہ کی کوئی صورت ہے اور نہ ہی ضرورت یا حاجت، کہ اس زائد رقم کا استعمال پالیسی لینے والے کے لئے جائز کہا جاسکے، اسے پراویڈنٹ فنڈ پر قیاس کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں، دونوں کی حقیقت جدا جدا ہے، اول یہ ملحوظ خاطر رہے کہ جن حضرات نے پراویڈنٹ فنڈ میں زائد رقم کو جائز کہا ہے ان کے بقول یہ زائد رقم کسی طرح بھی شرعی ربو نہیں، بلکہ حقیقتاً عطیہ سلطان کے قبیل کی چیز ہے۔

ان حضرات نے پراویڈنٹ فنڈ کی رقم کا اس طرح تجزیہ کیا ہے، جزو تنخواہ سے وضع کر کے جمع کر لیا گیا اس پر ملنے والی زائد رقم جو کمپنی اپنی طرف سے ملاتی ہے اور ان دونوں قسم کی رقم پر بنام سود دی جانے والی مزید رقم اجیر کے قبضہ سے پہلے جو رقم تنخواہ سے وضع کر کے کمپنی نے جمع کر لی، ہنوز وہ اس کا حقیقی مالک ہی نہیں بنتا، زائد رقم جو کمپنی نے ملائی وہ بھی اس کی ملک نہیں ہے۔

لہذا سود کے نام پر جو مزید رقم دی گئی وہ کسی حقیقت یا ملکیت پر زیادتی ہے ہی نہیں کہ

اسے سو د کہا جائے۔ ”بدائع“ میں ہے:

”منها أن لا يكون ملكاً لأحد المتبايعين فإنه لا يجزى الربا“ (امداد

الفتاویٰ میں متعلقہ بحث)۔

جبکہ انشورنس کی زائد رقم متفقہ طور پر شرعی ربوا ہے۔ ایک بات اور بھی ملحوظ رہے، پراویڈنٹ کی زائد رقم کے مجوزین کے ذہن میں اس کا یہ پس منظر بھی تھا کہ وہی کمپنی کا تنخواہ یا ادارہ سے ایک جزء وضع کرتا ہے وہی زائد رقم ملاتا ہے اور وہی اپنی طے کی ہوئی رقم پرسود کے نام سے مزید رقم جمع کرتا ہے، اس صورت میں اس پرسود کی تعریف صادق ہی نہیں آتی۔ ”جبری انشورنس“ میں یہ بات بھی نہیں، وضع تنخواہ دوسرے کا کام ہے اور سود وغیرہ دینا دوسرے کا کام ہے، اس بنیاد پر بھی اس قیاس کی کوئی گنجائش نہیں نظر آتی۔

۴- کار، تجارتی سامان وغیرہ کے بیمہ کی صورت، ”سوکرہ“ والی صورت سے تقریباً ملتی جلتی ہے، جسے علامہ شامی نے ناجائز ہی کہا ہے، ضمان اور حاجت وغیرہ کا بھی یہاں کوئی وجود نہیں ہے کہ استعمال کر لینے کی گنجائش نکل سکے۔

۵- سوال کا آخری جزء کہ حمل و نقل کا کام انجام دینے والی جو کمپنیاں ہیں وہی خود متعلقہ سامان کا انشورنس کریں اور اجرت سے زائد رقم لے کر یہ معاملہ کریں کہ بہ صورت ضیاع، نقصان کے ہم ذمہ دار ہیں (ڈاکخانہ وغیرہ میں کاغذات و رجسٹری وغیرہ کا انشورنس اسی قبیل سے) اس صورت میں، البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب اس نے حفاظت کا معاوضہ الگ سے لیا تو ضائع ہو جانے کی صورت میں ضمان لازم ہو جائے گا، حضرت تھانویؒ کے یہاں بھی اس کا جواز ہے۔ اور علامہ شامی کی اس عبارت سے بھی یہی سمجھا جاسکتا ہے جو ”سوکرہ“ ہی کی بحث میں ہے:

”إن المودع إذا اخذ أجره على الوديعة يضمنها إذا هلكت“

اور اسی خاص صورت میں نقصان کا معاوضہ لینے کا جواز مطلقاً ہی ہوگا۔



## موجودہ حالات میں انشورنس

مفتی سعید احمد پالنپوری ☆

عصر حاضر میں وسائل راحت کی غیر معمولی فراوانی سے خطرات میں بھی غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے، آج ہر چیز محل خطر میں ہے، ہر شخص کسی بھی وقت کسی بڑے حادثہ سے دوچار ہو سکتا ہے، اس لئے عصر حاضر میں تائمن (بیمہ) کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، آج غیر ترقی یافتہ تہذیبوں میں اگرچہ یہ بات ممکن ہے کہ ایک شخص انشورنس سے دامن بچائے ہوئے پوری زندگی گزار دے، مگر ترقی یافتہ ممالک کی صورت حال بالکل مختلف ہے، وہاں انسان قدم قدم پر بیمہ پالیسی لینے پر مجبور ہوتا ہے، بیمہ کا حال بنک جیسا ہو گیا ہے، بنک بھی عصر حاضر کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

ادھر یہ امر واقعہ ہے کہ اسلام ایک کامل و مکمل دین ہے، وہ ہر زمانے اور ہر جگہ کی ضروریات کی تکمیل کی اپنے اندر وافر صلاحیت رکھتا ہے، اس کے اصولوں میں وہ جامعیت ہے کہ زمانہ چاہے کتنی ہی کروٹیں بدل لے، ان اصولوں کی تطبیق میں ذرا بھی دشواری پیش نہیں آتی، مگر خلافت اسلامی کے زوال اور مسلمانوں کے تشننت و افتراق نے امت مرحومہ کو غیروں کا دست نگر بنا دیا، وہ نہ تو بنگلہ کا کوئی اسلامی نظام رائج کر سکے اور نہ تائمن کا اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ کوئی عادلانہ نظام برپا کر سکے، صرف غیر مسلم اشخاص اور لادینی حکومتیں ہی ماضی بعید سے بنگلہ

اور بیمہ کے سلسلہ میں کوشش کرتی رہیں، علامہ شامیؒ نے ”سوکرہ“ (SECURITY) کا جو ذکر کیا ہے وہ غیر مسلموں کا رائج کیا ہوا ایک نظام تھا۔ آج وہ لوگ اتنے آگے نکل گئے ہیں کہ ساری انسانی دنیا ان کے باطل نظام کی لپیٹ میں آچکی ہے، اور ظاہر ہے کہ غیر مسلم اپنے کسی بھی رائج کردہ نظام میں اسلامی اصولوں کی رعایت ملحوظ نہیں رکھ سکتے، اگر کہیں ایسی کوئی موافقت نظر آئے تو وہ محض ایک اتفاقی امر ہوتی ہے۔

غرض جب تک اسلامی اصولوں کے مطابق بنگلہ اور تائیمین کی شکلیں وجود میں نہیں آتیں سبھی مسلمان چاہے وہ اسلامی ممالک کے باشندے ہوں، یا غیر اسلامی ممالک کے شہری، دشواریوں سے دوچار رہیں گے، مگر اسلامی ممالک کے باشندوں کے لئے تو باطل نظام سے موافقت، یا ان سے کام چلانے کی کسی درجہ میں بھی گنجائش نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ آزاد بااختیار ہیں۔ امت مسلمہ کی حیثیت سے ان کا یہ اولین فریضہ ہے کہ وہ بنگلہ اور تائیمین کے اسلامی طریقے رائج کرنے کی جدوجہد کریں، ہاں ہندوستان جیسے غیر اسلامی ملک کی صورت حال اسلامی ممالک سے مختلف ہے۔ یہاں اگر کسی بستی میں مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم ہو، یا کسی مسلمان کا کاروبار غیر مسلموں کے علاقہ میں ہو اور ظن غالب یہ ہو کہ کسی بھی وقت اس کی جان و مال کو دشمنوں کی نظر بد لگ سکتی ہے تو یہ واقعہ ایک ایسی مجبوری ہے جس میں جان و مال کے بیمہ کی گنجائش ہو سکتی ہے، مگر عام طور پر بیمہ کو فسادات سے حفاظت کی تدبیر کے طور پر اختیار کرنا کسی طرح قطعی قرین مصلحت معلوم نہیں ہوتا۔ اگر یہ بات عام ہوگئی تو قلوب میں وہن اور بزدلی پیدا ہو جائے گی اور فسادات کے موقع پر لوگ اپنی املاک کی حفاظت کے لئے سینہ سپر نہیں ہوں گے، جہاں حفاظت ممکن ہوگی وہاں بھی لوگ یہ خیال کر کے بیٹھ رہیں گے کہ ہمیں بہتر معاوضہ ملے گا۔ پھر املاک تباہ ہو جانے کے بعد جب جان کی باری آئے گی تو وہی بزدلی اور کم ہمتی مدافعت عن النفس کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گی اور صرف پالیسی ہولڈر ہی ختم نہیں ہوں گے، بلکہ ان کے ورثاء کا بھی صفایا ہو جائے گا اور کوئی بیمہ پالیسی کرنے والا باقی نہیں رہے گا۔

غرض ہندوستان کی نسبت سے بیمہ کو فسادات روکنے کی تدبیر کے طور پر، یا نقصان کی تلافی کے لئے تجویز کرنے میں جہاں فوائد ہیں وہاں اس طریقہ علاج میں مضرت بھی بہت بڑی ہے۔ اور غور کرنے سے مضرت کا پہلو منفعت کے پہلو پر غالب معلوم ہوتا ہے، اس لئے ”ائمہما اکبر من نفعہما“ کے اصول کے مطابق فسادات سے بچنے کے لئے بیمہ کی اجازت دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا، اس مقصد کو حاصل کرنے کی تو واحد تدبیر: ”من قتل دون ماله فہو شہید ومن قتل دون دمہ فہو شہید“ ہے، موت کی خواہش ہی میں زندگی کا راز مضمحل ہے اور جینے کی آرزو تو تباہی کا پیش خیمہ ہے۔

اس کے بعد بیمہ اور بینک سے متعلق دوسرے سوالات کے جوابات لکھنے سے پہلے یہ طور تمہیدیہ بات جان لینی ضروری ہے کہ ربوا کا تحقق معاوضات ہی میں ہوتا ہے، جس کے لئے عقد شرط ہے، اگر عقد کے بغیر کوئی شخص دوسرے کو اپنے ضوابط کے مطابق، یا اپنی مرضی سے منافع یا سود کے نام سے کوئی زائد رقم ادا کرے تو اس کو سود کی تعریف شامل نہیں ہوگی، حدیث شریف میں اس اجیر کا قصہ آیا ہے جو اپنی اجرت چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ مستأجر نے اس معمولی رقم کو استعمار کے ذرائع سے بہت بڑھا دیا تھا، پھر عرصہ بعد جب وہ اجیر اپنی اجرت طلب کرنے آیا تو مستأجر نے اس اجرت کی رقم سے حاصل کردہ سارا نفع اس کو پیش کر دیا تھا اور وہ بندہ خدا سارا ہی نفع لے کر چل دیا تھا۔ اس کے بعد امور مستفسرہ کے جوابات درج ذیل ہیں:

۱- اگر ہندوستان کے مخصوص حالات میں کوئی شخص جان کا بیمہ کرائے پھر مدت پوری ہونے سے پہلے پالیسی ہولڈر کسی حادثہ کا شکار ہو جائے تو بیمہ کمپنی جمع کی ہوئی اقساط سے زائد جو رقم ادا کرے گی وہ واجب التصدق ہوگی، کیونکہ یہ زیادتی عقد کے ضمن میں حاصل ہوئی ہے، پالیسی ہولڈر نے بیمہ پالیسی اسی زیادتی کو حاصل کرنے کے لئے لی ہے، اس لئے وہ سود ہے اور واجب التصدق ہے، البتہ متونی کے وارثوں میں جو غیر مستحق زکوٰۃ ہوں وہ حسب اصول یہ زائد رقم استعمال کر سکتے ہیں، اسی طرح اگر پالیسی ہولڈر مقررہ مدت پوری کر لیتا ہے تو جمع کی ہوئی اقساط

سے زائد رقم جو حسب معاہدہ ملتی ہے وہ بھی سود ہوگی اور واجب التصدق ہوگی۔

۲- فسادات کی صورت میں پالیسی ہولڈر کی طرف سے ادا کی ہوئی رقم سے زائد رقم جو انشورنس کمپنی مستحقین و متاثرین کو کمپنی کے ضابطوں کے مطابق ادا کرتی ہے اس پر بھی سود کی تعریف صادق آتی ہے، کیونکہ یہ بھی عقد کے ضمن میں حاصل ہوئی ہے، اس کو جان کا معاوضہ تصور نہیں کیا جاسکتا۔ رہا یہ شبہ کہ اصلاً حکومت جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہے اور بیمہ کمپنیاں سرکاری ملک ہیں تو اس زائد رقم کی حکومت کی طرف سے نقصان کی تلافی کیوں نہ قرار دی جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی بھی تاویل کے لئے محل قابل ضروری ہے، ورنہ تاویل بارد سے زیادہ اس کی حیثیت نہ ہوگی، اور چون کہ یہ زیادتی عقد معاوضہ کے ضمن میں حاصل ہوئی ہے، اس لئے مذکورہ تاویل کی کسی طرح گنجائش نہیں ہے، مثلاً سرکاری بنکوں میں عقد معاوضہ کے ضمن میں سود ادا کرتے ہیں ان میں تبرع کی تاویل نہیں کی جاسکتی، اگرچہ وفاہی کام کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، البتہ اگر بغیر عقد معاوضہ کئے ہوئے حکومت کے آرڈر سے بنک غریبوں کا تعاون کریں تو وہ محض تبرع ہے، اسی طرح حکومت کی ہدایت کے مطابق اگر بیمہ کمپنیاں متاثرین کو، یا ان کے پس ماندگان کو بغیر کسی سابقہ عقد کے کوئی رقم ادا کریں تو وہ محض تعاون اور تبرع ہوگا، اس کو جان و مال کا معاوضہ قرار دیا جاسکتا ہے، مگر جو ادائیگی جبری اور عقد معاوضہ کے ضمن میں ہو اور جس کے حصول کے لئے دعویٰ کیا جاسکتا ہو، اس میں تلافی مافات کی تاویل کسی طرح درست نہیں ہو سکتی۔

۳- ”جبری انشورنس“ یعنی سرکاری ملازمین کی تنخواہ سے بیمہ کی مد میں جو ماہ ب ماہ ایک متعین حصہ کٹا رہتا ہے اور ملازمت کے اختتام پر حسب ضابطہ گورنمنٹ جمع شدہ رقم پر جو اضافہ کر کے دیتی ہے اس کا لینا درست ہے، کیونکہ مشاہرہ کا وہ حصہ جو بیمہ کے عنوان سے کاٹ لیا گیا ہے وہ مکمل طور پر ملازم کے قبضہ میں نہیں آیا ہے، اسی لئے قبضہ کے بعد اس مال کی سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی اور نہ ہی ملازم نے سود حاصل کرنے کے لئے کوئی عقد معاوضہ کیا ہے، بلکہ وہ حسب قاعدہ تنخواہ کا ایک حصہ کٹوانے پر مجبور ہے، اس لئے اس پر سود کی تعریف نہیں آتی، اور اس



کی نظیر پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والی زیادتی ہے جو درست ہے۔

۴- املاک کے بیمہ کی حقیقت یہ ہے کہ پالیسی ہولڈر سے جو اقساط وصول کی جاتی ہیں وہ ایک طرح کا قومی فنڈ کے لئے چندہ ہوتا ہے، اس کی نظیر وہ رقم ہے جو ہوائی جہاز کے ٹکٹ میں بیمہ کے نام سے لی جاتی ہے، تاکہ امکانی حادثہ کی صورت میں اس جمع شدہ فنڈ سے متاثرین کی مدد کی جاسکے، اسی طرح املاک کے بیمہ میں جو اقساط وصول کی جاتی ہیں، وہ بھی ایک طرح کا چندہ ہے، چنانچہ وہ اقساط کسی حال میں واپس نہیں کی جاتیں۔ رفتہ رفتہ چندہ سے ایک فنڈ اکٹھا ہوتا رہتا ہے، پھر اس کو ذرائع استثماری سے بڑھا یا بھی جاتا ہے اور متوقع نقصان کی صورت میں اس فنڈ سے چندہ دینے والے کا بڑی رقم کے ذریعہ تعاون کیا جاتا ہے، غرض املاک کے بیمہ کی صورت میں جو بدل ملتا ہے وہ محض ایک طرح کا تبرع ہوتا ہے، مگر اس کے حصول کے لئے قومی فنڈ کی ممبری شرط ہوتی ہے، جو اقساط ادا کرتا ہے وہ اس بیت المال کا ممبر ہوتا ہے اس لئے اگر وہ قومی فنڈ ہے، یعنی بیمہ کمپنی سرکاری، یا نیم سرکاری ہے تو اس کی طرف سے بہ طور تعاون تلافی مافات کا التزام درست ہے اور وہ التزام مالا بلیزم نہیں ہے، کیونکہ حکومت پر بہر حال تلافی مافات کی اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، البتہ اگر یہ کاروبار شخصی ہے تو وہ ”سوکرہ“ ہے جس کو علامہ شامی نے التزام مالا بلیزم کے اصول سے ناجائز قرار دیا ہے۔

۵- جو غیر سرکاری کمپنیاں نقل و حمل کا کام انجام دیتی ہیں وہ خود اجرت سے زائد رقم لے کر سامان کا انشورنس کریں اور ضیاع یا نقصان کی صورت میں تلافی مافات کی ذمہ داری قبول کریں تو یہ بعینہ ”سوکرہ“ والی صورت ہے جو درست نہیں ہے، البتہ حکومت، یا اس کا کوئی محکمہ مثلاً ڈاک خانہ یہ عمل کرے تو یہ درست ہے۔



## مجبوری کی حالت میں انشورنس کی اجازت

☆ مفتی جنید عالم ندوی قاسمی ☆

۱- ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں فرقہ وارانہ فسادات کے پیش نظر عام حالات میں عمومی اور اجتماعی طور پر انشورنس کرانے کی شرعاً اجازت نہیں ہے، خواہ جان کا انشورنس ہو، یا مال کا، مستقبل کے متوقع خطرات اس کے جواز کی بنیاد نہیں بن سکتے ہیں، اس لئے:

(الف): بیمہ کی ابتداء گوامداد باہمی اور تعاون علی الخیر کے جذبہ سے ہوئی، لیکن آج اس کی ترقی یافتہ شکل خالص سرمایہ کاری اور رباء کے نظام پر قائم ہے، اس کی بعض صورتیں قمار پر بھی مشتمل ہیں، چونکہ رباء اور قمار کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے، اس لئے مسلمانوں کو ان دونوں سے بچنا بہر حال لازم ہے، شریعت نے رباء اور شہ رباء دونوں سے بچنے کی تاکید کی ہے۔

ارشاد نبوی: ”الحلال بین والحرام بین وبينهما مشبهات لا يعلمهن كثير من الناس فمن اتقى الشبهات استبرأ لدينه وعرضه ومن وقع فى الشبهات وقع فى الحرام“ (مشکوٰۃ کتاب البیوع باب کسب الحلال ۲۴۱) کے پیش نظر مشتبہ چیزوں سے بچے بغیر دین کی مکمل حفاظت مشکل ہے، ربا اور قمار کی وعیدیں جس وقت ہمارے سامنے آتی ہیں اس وقت دل دہل جاتا ہے اور رو ٹگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ڈر لگتا ہے کہ کہیں مجرمین کی صف میں ہم بھی کھڑے نہ ہو جائیں۔

(ب): مذکورہ صورت میں حاجت کو ضرورت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ انشورنس کی موجودہ شکل جس نظام پر قائم ہے اس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے اور جس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہو اس میں حاجت کو ضرورت کا درجہ دینا صحیح نہیں ہے، علامہ ابن نجیم مصری نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ”الاشباہ والنظائر“ میں اس بات کی صراحت کر دی ہے: ”مشقت اور حرج کا اعتبار ان جگہوں میں ہے جہاں نص موجود نہ ہو، اگر اس کے خلاف نص موجود ہو تو پھر اس کا کوئی اعتبار نہیں۔“

”والمشقة والحرج إنما يعتبر في موضع للنص فيه، وأما مع النص بخلافه فلا“ (الاشباہ والنظائر ۱۳۸)۔

(ج): انشورنس فسادات کو روکنے کا متعین اور یقینی ذریعہ نہیں ہے، اس لئے کہ جو طبقہ انشورنس کے نظام پر حاوی ہے اسی طبقہ کی طرف سے تو جان و مال کی ہلاکت کا خطرہ رہتا ہے، یہ ممکن ہے کہ فساد کے موقع سے پورے خاندان کو صاف کر دیا جائے کہ نہ کوئی فرد بچے اور نہ انشورنس کی رقم لے، یا لاش ہی غائب کر دی جائے، پھر یہ کہ انشورنس کی رقم حاصل کرنے میں جو دشواریاں سامنے آتی ہیں اور اس کے لئے جو رشوت دینی پڑتی ہے وہ بھی مخفی نہیں، نیز فسادات کی ساری ذمہ داری غیر مسلموں ہی پر نہیں ڈال سکتے ہیں، بلکہ فسادات کی آگ بھڑکانے میں ایک بہت بڑا حصہ مسلمانوں کا بھی ہوتا ہے۔

(د): انشورنس کے عمومی جواز میں سود کا دروازہ کھل جائے گا جس کا انسداد بہر حال ضروری ہے ”سد ذرائع“ شریعت کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصل ہے جس کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اور احکام میں اس کی کافی رعایت رکھی گئی ہے، اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

(ه): اگر انشورنس کے عمومی جواز کا فتویٰ دیا جائے تو پھر مسلمانوں کی نگاہیں اسلامی اصول تجارت ”شرکت“ اور ”مضاربت“ سے ہٹ جائیں گی اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا، اس لئے ضروری ہے کہ سودی نظام سے ہٹ کر خالص اسلامی نظام قائم کیا جائے، اور اسلامی اصول تجارت کو کسی بھی حال میں نظر انداز نہ کیا جائے۔

## ۲- مجبوری کی حالت میں انشورس کرا سکتے ہیں:

البتہ چونکہ اضطراری حالت میں ناجائز اور حرام چیزوں کے استعمال کی بھی شرعاً اجازت ہے، جیسا کہ مخصہ کی حالت میں ”اکل مدیہ واکل خنزیر“ جائز ہے۔ لقمہ گلہ میں پھنس جائے اور پانی وغیرہ موجود نہ ہو تو بہ قدر ضرورت شراب کے استعمال کی اجازت ہے، اس لئے اگر کہیں پر جان و مال کی ہلاکت کا شدید خطرہ لاحق ہو، یا کوئی قانونی مجبوری ہو، انشورس کرائے بغیر ملازمت نہ ملتی ہو یا ملازمت خطرہ میں ہو تو پھر مجبوراً ”الضرورات تبیح المحظورات“ اور ”إذا ضاق الأمر اتسع“ جیسے اصول کے پیش نظر جان و مال ہر طرح کے انشورس کرانے کی شرعاً اجازت ہوگی، اس لئے کہ جان و مال کی حفاظت جس طرح بھی ہو سکے لازم ہے۔ چنانچہ کتب فقہ میں یہ جزئیہ صراحتاً موجود ہے:

”اگر دشمن مسلمانوں کا محاصرہ کر لیں اور مال پر مصالحت کا مطالبہ کریں تو چونکہ اس میں ایک طرح کی ذلت ہے، اس لئے امام وقت ان کو مال دے کر مصالحت نہیں کرے گا، البتہ اگر اپنی یا مسلمانوں کی جان کی ہلاکت کا خطرہ ہو تو پھر مال دے کر مصالحت کر سکتا ہے، کیونکہ دفع ہلاکت جس طرح بھی ممکن ہو واجب ہے“

ملاحظہ ہو ہدایہ کی عبارت:

”ولو حاصر العدو المسلمین وطلبوا الموائعة علی مال یدفعه المسلمون إلیهم لا یفعل الإمام لما فیہ من إعطاء الدیة والحاق المذلة بأهل الإسلام إلا إذا خاف الهلاک لأن دفع الهلاک واجب بأی طریق یمکن“۔

ہمارے اکابرین میں سے مفتی عبدالرحیم لاچپوری، مفتی محمود، اور مفتی نظام الدین صاحب نے بھی جان و مال کے خطرہ یا قانونی مجبوری کی صورت میں انشورس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ مفتی محمود صاحب ایک استفتاء کے جواب میں فرماتے ہیں:

”بیمہ میں سود بھی ہے اور جو ابھی، یہ دونوں چیزیں شرعاً ممنوع ہیں، لیکن اگر کوئی شخص

ایسے مقام پر اور ایسے ماحول میں ہو کہ بغیر بیمہ کرائے جان و مال کی حفاظت ہی نہ ہو سکتی ہو، یا قانونی مجبوری ہو تو بیمہ کرنا درست ہے“ (فتاویٰ محمودیہ ۲۰۲۰ء)۔

مفتی نظام الدین صاحب کا جواب اس سے بھی واضح ہے۔ وہ ایک تفصیلی استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں:

”اس لئے ’لائف انشورنس‘ کو جائز نہیں کہا جاسکتا، البتہ شدید مجبوری کی بات دوسری ہے، مثلاً قانوناً لازم ہو جائے یا مثلاً کسی مقام کے حالات ایسے خراب ہو جائیں کہ بغیر انشورنس کے جان و مال کی حفاظت مشکل ہو جائے، یا مثلاً ملازمت نہ ملے یا ملازمت برقرار و بحال نہ رہے اور بغیر ملازمت کے گزارہ مشکل ہو یا معاشرہ قائم نہ رہے تو بوجہ مجبوری کے محض مجبوری کے بہ قدر گنجائش نکل سکتی ہے“ (نظام الفتاویٰ ۲۵۱/۲)۔

بہر حال مجبوری کی حالت میں ضرورۃً انشورنس کے جواز کی گنجائش نکلتی ہے، لیکن یہ اجازت انفرادی ہوگی اور مہتملی بہ علماء کے مشورہ سے یہ طریقہ اختیار کر سکتا ہے۔

### ۳- عام حالات میں انشورنس کی زائد رقم کا استعمال جائز نہیں:

اگر کسی شخصی نے ضرورتِ شدیدہ کی بنیاد پر اپنی جان و مال کا انشورنس کرایا اور وہ طبعی موت مر گیا یا اس کے مال و اسبابِ فرقہ و رارانہ فسادات کے علاوہ کسی وجہ سے ہلاک ہو گئے، یا مدت گزر چکی اور وہ زندہ رہا تو ایسی صورت میں زائد رقم سود ہوگی جس کی حرمت نصوص صریحہ سے ثابت ہے، اس کو نکال کر بلا نیت ثواب صدقہ کرنا ہوگا۔

### ۴- فسادات میں نقصان کی صورت میں زائد رقم کا استعمال جائز ہے:

البتہ چونکہ حکومت عام انسانوں کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہے، قانون ساز مجلسوں اور حکومت کے محکموں کی بہتات، جرائم کی روک تھام کے لئے قدم قدم پر پولیس چوکیاں اس بات پر بین ثبوت ہے کہ حکومت پر تمام انسانوں کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

اگر کہیں فسادات ہوتے ہیں، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوتا ہے، لوگوں کی جانیں جاتی ہیں، مال و اسباب برباد کئے جاتے ہیں۔ مکانوں اور دکانوں کو جلا کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کیا جاتا ہے تو یہ تمام تر حکومت کی کمزوری، لاپرواہی اور فرائض سے غفلت، بلکہ بددیانتی اور بے ایمانی کی وجہ سے ہے، یہی وجہ ہے کہ حکومت اخلاقی طور پر اپنی کمزوری تسلیم کرتے ہوئے مناسب یا غیر مناسب معاوضہ ادا کرتی ہے۔

اس لئے بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے، بلکہ حقیقت ہے کہ جان و مال کی بربادی، عزت و آبرو کی حفاظت میں ناکامی کی صورت میں حکومت ہی ذمہ دار اور جوابدہ ہے، درمیان میں یہ کہنا بھی بہت ہی مناسب ہوگا کہ موجودہ حکومت بہار نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ فسادات کی ذمہ دار حکومت ہی ہے۔ اگر حکومت نہ چاہے تو کہیں فسادات نہ ہوں، اس لئے موجودہ صورت حال میں ضرورت شدیدہ کی بنیاد پر حکومت کے پروگرام کے مطابق اگر جان و مال کا بیمہ کرایا گیا اور فسادات میں جان و مال کا نقصان ہو تو پالیسی ہولڈر، یا اس کے ورثہ کے لئے اصل رقم کے علاوہ زائد رقم کا استعمال شرعاً جائز ہوگا اور حکومت کی طرف سے یہ ایک طرح کا تاوان سمجھا جائے گا، بشرطیکہ بیمہ کمپنی حکومت کی ہو اور حکومت نے الگ سے کوئی معاوضہ ادا نہ کیا ہو، اگر حکومت الگ سے کوئی مناسب معاوضہ ادا کر دے تو پھر انشورس کی اضافی رقم جائز نہ ہوگی، اس کی نظیر عاقلہ پر دیت کی ہے۔

اگر کسی شخص نے کسی کو قتل کر دیا تو مقتول کی دیت قاتل کے مال سے ادا کرنے کی بجائے اس کے عاقلہ کے مال سے ادا کی جاتی ہے، جبکہ اصل مجرم قاتل ہے، نہ کہ عاقلہ، حتیٰ کہ اگر عاقلہ موجود نہ ہو تو بیت المال سے اس کی دیت ادا کی جائے گی، اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ کوئی شخص کسی کے قتل کی جرأت اپنے خاندان، رشتہ دار اور قریبی لوگوں کی طاقت کی بنیاد پر کرتا ہے کہ وہ لوگ بہ وقت ضرورت اس کی مدد کریں گے، قریبی لوگوں کی کوتاہی، کمزوری اور اس کی حفاظت نہ کرنے کی وجہ سے وہ اس طرح کا اقدام کرتا ہے، اس لئے قریبی لوگوں کے مال میں

دیت واجب ہوتی ہے کہ ان لوگوں نے اس کو کھلی چھوٹ کیوں دے دی۔ علامہ شامی لکھتے ہیں:  
 ”إن العاقلة يتحملون باعتبار تقصيرهم وتركهم حفظه ومراتبته“  
 (رد المحتار کتاب المعامل ۲۱۰/۵)۔

جب عاقلہ کی کوتاہی اور غفلت کی وجہ سے ان کے مال میں دیت واجب ہو سکتی ہے کہ اصل مجرم قاتل ہے تو حکومت پر جان و مال کے نقصان کا تاوان کیوں نہیں آسکتا ہے جبکہ فسادات کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے اور ہندوستان میں اسلامی نظام بھی قائم نہیں ہے کہ عاقلہ کے مال سے دیت دلائی جائے، نیز یہ فسادات اجتماعی طور پر منظم سازش کے تحت ہوتے ہیں، اس لئے قاتل کا پتہ بھی نہیں چلتا۔

علامہ ابن نجیم نے جس جگہ یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ ”جب کسی واقعہ میں مباشر (اصل فاعل) اور متسبب (جو فعل کا سبب ہونا ہو) دونوں جمع ہوں تو حکم کی نسبت مباشر کی طرف کی جائے گی“ وہیں پر اس قاعدہ سے کچھ جزئیات کو مستثنیٰ بھی کیا ہے۔

ان جزئیات پر نظر ڈالنے سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ متسبب اگر کسی طرح کی کوتاہی اور دھوکہ بازی سے کام لے تو ایسی صورت میں حکم کی نسبت مباشر کے بجائے ”متسبب“ کی طرف کی جائے گی، جیسا کہ مودع (جس کے پاس ودیعت رکھی جاتی ہے) اگر چور کو ودیعت کی طرف رہنمائی کر دے تو وہ ضامن ہوگا، اس لئے کہ اس نے حفاظت ترک کر دی (الاشباہ والنظائر ۲۳۷)۔ اسی طرح حکومت بھی اپنی رعایا کی جان و مال کی حفاظت میں کوتاہی کی وجہ سے جان و مال کی ضامن ہوگی، نقصان کی صورت میں میں تاوان دینا ہوگا۔

## ۵- جبری بیمہ (گروپ انشورنس):

جبری بیمہ جسے ”گروپ انشورنس“ کہتے ہیں، اس کی صورت بھی درحقیقت پراویڈنٹ فنڈ کی طرح ہوتی ہے اور پراویڈنٹ فنڈ کی اضافی رقم کے جواز کی جو علت بیان کی جاتی ہے وہی علت گروپ انشورنس میں بھی پائی جاتی ہے، اس لئے کہ دونوں صورتوں میں ملازمین کی تنخواہ سے

جبراً و قانوناً کچھ رقم ماہ بہ ماہ وضع کر لی جاتی ہے اور اسے دو گونی کر کے محفوظ کر دی جاتی ہے جو ملازمین کے انتقال یا ریٹائر ہونے کے بعد خود ملازمین کو یا ان کے ورثہ کو اضافہ کے ساتھ ملتی ہے، چونکہ رقم ملازمین کے قبضہ میں آنے سے قبل ہی جبراً وضع کر لی جاتی ہے جس کی وجہ سے اس پر سود کی تعریف صادق نہیں آتی، اس لئے علماء نے اس کو حکومت کی طرف سے ایک طرح کا انعام اور تبرع و احسان قرار دے کر جواز کا فتویٰ دیا ہے، لہذا پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر قیاس کرتے ہوئے ”گروپ انشورنس“ کی اضافی رقم بھی جائز قرار پائے گی۔

## ۶- کار اور تجارت وغیرہ کا جبری بیمہ:

کار اور تجارت وغیرہ کا جبری بیمہ کرایا جاسکتا ہے، شرعاً اس کی اجازت ہوگی، البتہ عام حالات میں نقصانات کی صورت میں اپنی اصل رقم کے علاوہ زائد رقم کا استعمال شرعاً جائز نہ ہوگا، اور فسادات میں نقصان کی صورت میں جائز ہوگا، جیسا کہ اس سے پہلے گز چکا۔

## ۷- نقل و حمل کمپنی کے بیمہ کی شرعی حیثیت:

جو کمپنیاں نقل و حمل کا کام انجام دیتی ہیں اور متعلقہ سامان کا بیمہ بھی کرتی ہیں ان سے بیمہ کرانا جائز ہے یا نہیں؟ اور نقصان کی صورت میں وہ ضامن ہوں گی، یا نہیں؟ اس سوال کا جواب دینے سے قبل ہم ان کمپنیوں کی حیثیت متعین کر لیں کہ مذکورہ صورت میں ان کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟ پھر سوال کا جواب آسان ہو جائے گا، اگر نقل و حمل کا کام انجام دینے والی کمپنیاں ہی بیمہ کرتی ہیں، یا بیمہ کرنے والی کوئی دوسری کمپنی ہوتی ہے، لیکن دونوں کمپنیاں یا تو ایک شخص کی ہوتی ہیں یا ایک ہی حکومت کی، اس طرح کی کمپنیوں کی دو حیثیت ہوتی ہے، یا تو یہ مودع (جس کے پاس ودیعت رکھی گئی ہو) کی حیثیت رکھتی ہیں، یا اجیر مشترک کی:

الف: اگر مودع کی حیثیت ہے تو ودیعت رکھنے والے کو شرعاً یہ اختیار ہے کہ مودع کو ودیعت کرنے کی اجرت دے کر اس بات کا پابند بنا دے کہ ہلاکت، یا نقصان کی صورت میں



ضمان دینا ہوگا، اور مودع اگر حفاظت کرنے کی اجرت لے لے تو پھر نقصان کی صورت میں ضامن بھی ہوگا۔

” (وهی أمانة) (فلا تضمن بالهلاک) إلا إذا كانت الودیعة بأجر -  
 أشباه معزیا للزیلعی“ (رد المحتار علی ہاشم رد المحتار، کتاب الإیذاع ۴/۳۹۴)۔

ب: اگر مذکورہ صورت میں مذکورہ کمپنیوں کی حیثیت اجیر مشترک کی ہے تو ایسی صورت میں یہ بحث سامنے آتی ہے کہ اجیر مشترک نقصان کی صورت میں ضامن ہوگا، یا نہیں؟ اس سلسلہ میں مختلف اقوال نقل کئے جاتے ہیں، جن میں سے صحیح قول یہ ہے کہ اگر اجیر مشترک کی طرف سے کسی طرح کی زیادتی، یا سامان کی حفاظت میں کوئی کوتاہی نہیں پائی گئی تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ ضامن نہیں ہوگا، قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے، اس لئے کہ مال اس کے پاس امانت ہے اور بغیر کسی زیادتی و کوتاہی کے امانت ضائع ہو جائے تو کوئی تاوان نہیں ہے، صاحبین کے نزدیک وہ ضامن ہوگا الا یہ کہ سامان ایسے حادثہ سے نقصان ہو جائے کہ اس سے حفاظت کرنا اس کے بس سے باہر ہو، صاحبین کا قول استحساناً ہے، فقہاء نے دونوں قول کو صحیح اور مفتی بہ قرار دیا ہے، کتب فقہ کی عبارتیں مختلف ہیں، اصحاب المتون نے امام صاحب کے قول کو اختیار کیا ہے، جبکہ ”فتاویٰ خیریہ“، ”تبیین“ اور دیگر کتب فقہ حنفی میں صاحبین کے قول کو مفتی بہ قرار دیا گیا ہے (رد المحتار ۵/۴۰-۴۱)۔

میرے نزدیک یہ اختلاف تغیر احوال و زمان کی بنیاد پر ہے، امام صاحب کے وقت میں اجیر مشترک امین و صادق ہوا کرتے تھے، اس لئے انھوں نے عدم ضمان کا فتویٰ دیا، اور صاحبین کے وقت میں حالات بدلے، لوگوں کے مزاج میں بگاڑ آیا اور اجیر صادق و امین ہونے کی بجائے خائن و غاصب بن گئے تو صاحبین نے وجوب ضمان کا فتویٰ دیا۔

” وفي التبیین وبقولہما یفتی لتغیر أحوال الناس، وبہ یحصل صیانة  
 أموالہم اہ لأنه اذا علم أنه لا یضمن ربما یدعی أنه سرق أو ضاع من یدہ“  
 (رد المحتار ۵/۴۰-۴۱)۔

علامہ شامی نے ”فتاویٰ خیریہ“ سے بعض لوگوں کا یہ قول نقل کیا ہے کہ امام صاحب کا قول عطاء اور طاؤس کا ہے اور یہ دونوں تابعین میں سے ہیں اور صاحبین کا قول حضرت عمرؓ اور

حضرت علیؓ کا ہے، اور یہ دونوں صحابی رسول ہیں، چونکہ ان دونوں حضرات کا مقام و مرتبہ بڑھا ہوا ہے، اس لئے صاحبین ہی کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا (رد المحتار ۴۰/۵)۔

چونکہ اس وقت حالات پہلے سے زیادہ بدل چکے ہیں، لوگوں میں پہلے سے زیادہ خرابی آچکی ہے، امانت و صداقت کی جگہ خیانت و بددیانتی لے چکی ہے، مادیت کا دور ہے۔ جائز و ناجائز کی تمیز ختم ہو چکی ہے، اگر اس وقت امام صاحب اور ان کے شاگرد موجود ہوتے تو وہ بھی متفقہ طور پر یہ فتویٰ دیتے کہ اجیر مشترک پر ضمان واجب ہے، اس لئے میرے نزدیک حالات کے پیش نظر نقصان کی صورت میں اجیر مشترک ضامن ہوگا، اگر اجیر مشترک حفاظت کے لئے الگ سے اجرت لے لے تو بدرجہ اولیٰ ضامن ہوگا۔

” قال فی الحامدیة ویظہر من هذا أنه إذا كسر قفل الدکان و أخذ المتاع یضمن الحارس“ (رد المحتار ۴۰/۵)۔

صاحب ”الاشباہ والنظائر“ نے ضمان کی شرط لگانے کی صورت میں وجوب ضمان پر اجماع نقل کیا ہے (حوالہ سابق)۔

مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں اگر نقل و حمل کا کام انجام دینے والی کمپنیاں ہی بیمہ کرتی، یادوں کمپنیاں الگ الگ ہیں، لیکن دونوں ایک ہی شخص کی، یا ایک ہی حکومت کی ملک میں تو وہ یا تو مودع قرار پائیں گی یا اجیر مشترک، بہر دو صورت اپنے مال کی حفاظت کے لئے ان سے بیمہ کرانا از روئے شرع جائز ہوگا اور نقصان کی صورت میں یہ کمپنیاں ضامن ہوں گی اور ان سے نقصان کا معاوضہ لینا جائز ہوگا، یہ جواز عام حالات میں بھی ہوگا، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ”امداد الفتاویٰ“ میں اور حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب نے ”جواہر الفقہ“ میں ایسی صورت میں اجیر مشترک کو ضامن قرار دیتے ہوئے بیمہ کرانے اور نقصان کی صورت میں معاوضہ لینے کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

البتہ اگر نقل و حمل کا کام انجام دینے والی اور بیمہ کرانے والی کمپنیاں دونوں علیحدہ علیحدہ شخصوں کی ہوں تو پھر ربا، قمار، غرر اور التزام مالا یلزم کی وجہ سے بیمہ کرانے اور نقصان کی صورت میں نقصان کا معاوضہ لینے کی شرعاً اجازت نہیں۔

## جان و مال کی حفاظت کے پیش نظر انشورنس

☆ مولانا انیس الرحمن قاسمی ☆

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انشورنس فکری و نظریاتی طور پر امداد باہمی کا نظام ہے، اور امداد باہمی کا اصول اسلام کی نگاہ میں مستحسن ہے، مگر بایں ہمہ انشورنس عملی طور پر اس وقت تمار و خطر اور سود کے نظام پر قائم و رائج ہے اور یہ اپنے مفاسد کی بنا پر شریعت کی نگاہ میں حرام ہے، اس لئے تمام مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ سودی نظام سے بچیں اور امداد باہمی کے اصول پر صحیح اسلامی طریقہ پر انشورنس کے نظام کو قائم کریں اور جہاں اس نظام کے شیوع و عموم سے بچنا مشکل ہو وہاں ضرورت شدیدہ کی بنیاد پر اس نظام کی حرمت اور مفسدہ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے بہ قدر ضرورت اختیار کریں۔

فقہ اکیڈمی کی طرف سے جاری کردہ سوال نامہ میں ہندوستان کے موجودہ خاص فرقہ دارانہ صورت حال کے پس منظر میں انشورنس اختیار کرنے کے بارے میں جو سوال کیا گیا ہے اس بارے میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے:

۱- جہاں جان و مال کی ہلاکت کا خطرہ غالب ہو اور انشورنس کرا لینے کی صورت میں اس خطرہ کے ٹلنے یا ہلاکت کے بعد ہونے والے نقصانات کی تلافی ہو جانے کا امکان بھی غالب ہو تو ایسی حالت میں ضرورت کی بنا پر جان و مال کا بیمہ کرایا جاسکتا ہے، ورنہ نہیں، لیکن یہ اجازت

انفرادی ہوگی اور میتلی بہ علماء کے مشورہ سے یہ طریقہ اختیار کر سکتا ہے۔  
 لیکن اسے اجتماعی حاجت نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ انشورنس فسادات کو روکنے کا متعین ذریعہ نہیں ہے۔ کیونکہ جس طبقہ کی طرف سے جان و مال کی ہلاکت کا خطرہ ہے وہی طبقہ سرکاری وغیر سرکاری بیمہ کے نظام پر حاوی ہے، اس لئے ایسا ممکن ہے کہ فسادات میں پورے خاندان کو ختم کر دیا جائے کہ نہ کوئی فرد باقی رہے اور نہ بیمہ کی رقم حاصل کر سکے۔ علاوہ ازیں انشورنس کی رقم حاصل کرنے میں جو دشواریاں ہیں اور جن مختلف مرحلوں میں رشوت کی ادائیگی کرنی پڑتی ہے اس کی وجہ سے رقم کا بڑا حصہ ختم ہو جاتا ہے، علاوہ ازیں مسلمانوں کی معاشی ابتری میں اس سے سدھار کے بجائے اضافہ ہوگا، جیسا کہ بیمہ کے نظام پر مبنی اعداد و شمار کے نظریہ سے ظاہر ہے، اسی لئے یہ بیمہ اس وقت کمپنی کی طرف سے ایک نفع بخش تجارت اور استعمال اور استحصال کا ذریعہ بن گیا ہے، لہذا اجتماعی طور پر اس کی اجازت میں مفاسد کثیرہ ہے اور متعین حاجت نہ ہونے کی بنا پر وجہ جواز بھی نہیں ہے۔

۲- ضرورت شدیدہ کی بنا پر جس شخص نے اپنی جان یا مال کا بیمہ کرایا اور وہ مدت کی تکمیل سے پہلے یا بعد مار ڈالا گیا، یا اس کی دکان و جائداد کو تباہ کر دیا گیا تو اس صورت میں بیمہ کے طور پر جمع شدہ رقم کے علاوہ جو رقم انشورنس کمپنی کی طرف سے ملے بہ شرطیکہ وہ کمپنی سرکاری ہو تو اس زائد رقم کا استعمال پالیسی ہولڈر، یا اس کے ورثہ کے لئے جائز ہوگا، لیکن اگر جان و مال کا معاوضہ حکومت کی طرف سے الگ سے مل جائے تو پھر زائد رقم کا استعمال پالیسی ہولڈر خود یا اس کے ورثہ نہ کریں، بلکہ صدقہ کر دیں کہ یہ رقم فی نفسہ ”ربا الفضل“ یا ”ربا النسیئہ“ ہے اور بہ درجہ مجبوری ضرورت شدیدہ کے پیش نظر وہ جائز ہے اور ضرورت کے بارے میں اصول یہ ہے:

”الضرورات تبیح المحظورات“ (مجلۃ الاحکام العدلیہ ۱۸ ماہ ۲۱)۔

”الضرورة تقدر بقدرها“ (حموی علی الاشبہ ۱/۲۷۶)۔

۳- اگر پالیسی ہولڈر طبعی موت مرا تو اس صورت میں بیمہ پالیسی میں جمع کردہ رقم کے علاوہ

ملنے والی زائد رقم اس کے ورثہ کے لئے واجب التصدق ہوگی، کیونکہ وہ ربوا ہے اور ربوا حرام ہے، اور یہاں ضرورت موجود نہیں ہے۔

۴- ”جبری بیمہ“ جسے گروپ انشورنس کہتے ہیں، اسے پراویڈنٹ فنڈ پر قیاس کیا جاسکتا ہے، پراویڈنٹ فنڈ میں جمع شدہ اصل رقم کے علاوہ سود کے نام پر ملنے والی رقم ملازمین کے لئے اس لئے جائز ہے کہ اس پر سود کی تعریف صادق نہیں آتی ہے، کیونکہ ملازم کی تنخواہ کا جو حصہ اسے ملا نہیں وہ اس کی ملک نہیں، اس لئے یہ سمجھا جائے گا کہ حکومت اپنے ملازمین کے مفاد کے پیش نظر اجرت میں اضافہ کر کے ایک مشت رقم ادا کرتی ہے، چاہے یہ رقم مدت ملازمت کی تکمیل کے بعد ملے یا قبل کسی حادثہ کی وجہ سے اسے یا اس کے ورثہ کو ملے، اور چونکہ جبر کی وجہ سے ملازم اپنے اختیار سے کوئی عقد نہیں کرتا ہے، اور گروپ انشورنس میں قمار کی وہ شکل بھی نہیں ہے جو بیمہ زندگی میں ہے، اس لئے یہ جائز ہوگا۔

۵- کارود دیگر موٹر گاڑیوں کے جبری بیمہ کو اختیار کیا جاسکتا ہے اور یوں سمجھا جائے گا کہ وہ سرکاری ٹیکس ہے، یا جبری کی وجہ سے ایک مجبوری ہے، اور گاڑی رکھنا حاجت ہے، لہذا ایسا بیمہ جائز ہے، لیکن حادثات کی صورت میں ملنے والی رقم کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ بھی پراویڈنٹ فنڈ کی طرح ہے درست نہیں ہے، یہاں زائد ملنے والی رقم درحقیقت سود و قمار ہے، اس لئے ایسی رقم واجب التصدق ہوگی، الا یہ کہ حادثہ کا شکار مشقت و حرج شدیدہ میں مبتلا ہو تو اس کے لئے اس کا استعمال مع الکرہت جائز ہوگا۔

۶- اگر نقل و حمل کی کمپنی ہی بیمہ کی ذمہ داری لے، یا بیمہ کمپنی اور نقل و حمل کی کمپنی دونوں ایک شخص یا کسی حکومت کی ملکیت ہو تو پھر نقل و حمل کے لئے بیمہ کرنا جائز ہوگا اور اس صورت میں اگر نقصان ہو جائے تو پھر ملنے والی رقم جائز ہوگی، کیونکہ حفاظت کی اجرت کی وجہ سے مال مضمون ہو گیا۔ اور ایسا اجیر جو حفاظت کی اجرت لے وہ ضامن ہوتا ہے۔

” قال فى الحامدية ويظهر من هذا أنه إذا كسر قفل الدكان وأخذ المتاع يضمن الحارس“ (ردالمحتار ۵/۲۰۵)۔

اس لئے ایسی صورت میں بلاشبہ جائز ہوگی، البتہ جہاں نقل و حمل کی کمپنی الگ ہو اور بیمہ کمپنی دوسری، تو اس صورت میں بیمہ کا جواز درست نظر نہیں آتا کہ یہ التزام مالا یلزم اور قمار و غرر میں داخل ہے۔



## انشورنس کی شرعی حیثیت

مفتی نسیم احمد قاسمی ☆

سائنس و ٹکنالوجی کی غیر معمولی ترقی اور نئے نئے انکشافات، ایجادات و اختراعات کے نتیجے میں اقتصادیات، معاشیات، سماجیات اور دیگر شعبہ ہائے حیات میں جو اہم سوالات پیدا ہو رہے ہیں، ضرورت تھی کہ اصحاب فقہ و فتاویٰ ایک ساتھ بیٹھ کر فقہ اسلامی کی تشکیل نو کا فریضہ انجام دیں۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کے روح رواں حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب قابل تبریک ہیں کہ انہوں نے فقہ اکیڈمی کے پلیٹ فارم سے ماہرین فقہ و فتاویٰ کو اس فرض منصبی کی ادائیگی کا زریں موقع عنایت کیا، اب تک اکیڈمی ماہرین شریعت اور ماہرین علوم عصریہ کے تعاون سے تین اہم فقہی سمینار کراچی ہے، جس میں دور حاضر کے اہم اور نازک مسائل: اعضاء کی پیوند کاری، دکان اور مکان کی پگڑی، ضبط تولید، کرنسی نوٹوں کی شرعی حیثیت، ترقیاتی قرضے و سودی لین دین، اسلامک بینکنگ سسٹم، مال و خرید و فروخت کی حقیقت اور بیع حقوق وغیرہ پر قابل قدر فیصلے ہو چکے ہیں۔

چوتھے فقہی سمینار (منعقدہ ۹ تا ۱۲ اگست ۹۱ء حیدرآباد) کے لئے بھی اکیڈمی نے وقت کے ایک اہم اور نازک مسئلہ پر علماء اور اصحاب فقہ و فتاویٰ کو خامہ فرسائی کا موقع دیا۔

☆ سابق نائب ناظم، امارت شرعیہ، بھلواڑی شریف، پٹنہ۔

ہندوستان کے موجودہ فرقہ وارانہ اور کشیدہ ماحول میں جبکہ ہندوستانی مسلمانوں کی جان و املاک کو سخت خطرات کا سامنا ہے، جگہ جگہ ملک دشمن عناصر فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعہ مسلمانوں کی نسل کشی اور معاشی و اقتصادی اعتبار سے انہیں مفلوج کرنے کی سرگرمیوں میں مشغول ہیں، ضرورت تھی کہ مسلمانوں کی جان و املاک کے تحفظ و بقا کی راہ تلاش کی جاتی، اکیڈمی نے وقت اور حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ہندوستان کے موجودہ ماحول میں ”انشورنس کی شرعی حیثیت“ پر مختلف سوالات مرتب کر کے اہل فقہ و فتاویٰ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے، سوال نامہ کے جواب لکھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انشورنس سے متعلق چند بنیادی اور اہم باتیں عرض کر دیں جائیں، پھر سلسلہ وار جواب دیا جائے۔

### ۱۔ بیمہ کی حقیقت:

بیمہ انگریزی کے لفظ انشور (INSURE) کا ترجمہ ہے جس کے معنی یقین دہانی کے آتے ہیں، عربی زبان میں بیمہ کے لئے ”تأمین“ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو ”امن“ سے ماخوذ ہے۔ اہل لغت اسے مختلف معنوں میں استعمال کرتے ہیں، مگر قدر مشترک کے طور پر طمانیت قلب اور خطرے سے محفوظ رہنے کا مفہوم پایا جاتا ہے، قرآن کریم میں ہے:

”رَب اجعل هذا البلد اٰمنا“

(اے رب! اس شہر (مکہ) کو امن و امان کی جگہ بنا دے) (التائین وموقف الشریعۃ الاسلامیہ

منہ۔ محمد السید الدسوقی / ۱۵)۔

بیمہ کے ذریعہ انسان اپنے کو مستقبل کے بعض خطرات و حوادث اور نقصانات سے محفوظ کر لیتا ہے، اس لئے اسے تأمین کہا جاتا ہے۔

”بیمہ“ ایک معاملہ ہے جو بیمہ کے طالب اور بیمہ کمپنی کے مابین طے پاتا ہے، اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ بیمہ کمپنی کے طالب سے ایک متعین رقم حسب شرائط بالاقساط وصول کرتی رہتی ہے اور ایک معینہ مدت کے بعد وہ رقم اسے، یا اس کے نامزد اشخاص یا قانونی ورثاء کو (حسب



شرائط) واپس کر دیتی ہے۔ ساتھ ہی مقررہ شرح فیصد کے حساب سے اصل رقم کے ساتھ کچھ زائد رقم بہ طور سود ”بونس“ کے نام سے دیتی ہے۔

مصری قانون مدنی کی دفعہ ۷۴۷ میں بیمہ کی تعریف اس طری کی گئی ہے:

”یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جس کی رو سے تحفظ دینے والے پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس شخص کو جس نے پالیسی خریدی ہے، یا وہ مستفید جس کی خاطر پالیسی خریدی گئی ہے، ایسی مخصوص رقم یا طے شدہ منافع یا کوئی دوسرا مالی معاوضہ، حادثہ یا معاہدہ میں بیان کردہ نقصان کے پہنچنے کی صورت میں، بیمہ دار کی طرف سے تحفظ فراہم کرنے والے کو ادا کردہ قسط، یا کسی دوسری مالی ادائیگی کی نسبت سے ادا کرنے“ (بیمہ کی شرعی حیثیت۔ ڈاکٹر حسین حامد حنان۔ ترجمہ: عبدالرحیم اشرف بلوچ ص ۱۶)۔

## ۲- بیمہ کا آغاز و ارتقاء:

بیمہ کا رواج اور اس کا آغاز کب ہوا؟، اس سلسلہ میں حتمی فیصلہ کرنا دشوار ہے، بیمہ کی ترقی یافتہ صورت موجودہ دور کی پیداوار ہے، البتہ بیمہ اپنی سادہ شکل میں صدیوں سے رائج ہے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ نظریہ بیمہ کی یافت زمانہ قدیم میں اہل مصر، ہند اور عرب نے کی، البتہ اس وقت نظریہ بیمہ صرف امداد باہمی اور آپسی تعاون و تضامن سے عبارت تھا۔ اس میں سرمایہ کاری اور حصول زر کا عنصر نہیں تھا، چنانچہ قدیم ”روما“ میں بعض امداد باہمی کی ایسی انجمنیں قائم ہوئیں جو اپنے ممبروں سے متعین رقم بالا قسط وصول کرتیں اور اس کے عوض میں اپنے ممبران کی وفات کے وقت ان کے پسماندگان کا تعاون کرتیں۔ اور اگر ممبران خود زندہ ہوتے اور معاشی اعتبار سے بے دست و پا ہو جاتے تو ان کا تعاون کرتیں بعض فلاحی تنظیمیں بھی قائم ہوئیں جو سن رسیدہ، یتیم اور بے سہارا افراد کا تعاون کرتیں (التائین وموقف الشریعۃ الاسلامیہ ص ۱۱)۔

بعض مورخین کا کہنا ہے:

”سمندری بیمہ کا آغاز، اٹلی کے تاجرانِ اسلحہ سے ہوئی، ان لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ

بعض تاجروں کا مال تجارت سمندر میں ضائع ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ تنگ دستی کا شکار ہو کر رہ جاتے اس صورت حال کا حل یہ نکالا کہ اگر کسی شخص کا مال تجارت سمندر میں ضائع ہو جائے تو تمام تاجر مل کر اس کی معاونت کے طور پر اسے ہر ماہ، یا ہر سال ایک معین رقم ادا کیا کریں، یہی تحریک ترقی کر کے جہازوں کے بیمہ تک پہنچی کہ ہر ایک ممبر ایک مقررہ رقم ادا کرے تاکہ اس قسم کے حوادث و خطرات کے موقع پر نقصان کا کچھ نہ کچھ تدارک کیا جاسکے“ (جواہر الفقہ ۲/۱۹۵-۱۹۶)۔

بحری بیمہ کے رواج پانے کے بہت دنوں بعد بری بیمہ کی ابتدا ہوئی، ڈاکٹر جاد عبدالرحمن نے بری بیمہ کی ابتداء پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

”سترہویں صدی میں اس کی ابتداء ہوئی، جس کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۶۶۶ء میں لندن میں ایک بھیانک آتش زدگی ہوئی جو مسلسل چار دنوں تک جاری رہی، جس کے نتیجے میں مکان، دکان اور فیکٹریاں خاکستر ہو کر رہ گئیں، دس ملین سے زیادہ کا مالی نقصان ہوا۔ اس واقعہ کے بعد وہاں کے لوگوں نے بری بیمہ کی طرح ڈالی، اٹھارہویں صدی میں اس کی نئی شکلیں وجود میں آئیں اور اس نے ایک مستحکم نظام کی شکل اختیار کر لی، بیسویں صدی بیمہ کا دور ارتقائی ہے، اسی دور میں اس کی مروجہ شکلیں سامنے آئیں“ (التائین وموقف الشریعہ ۱۳)۔

سلطنت عثمانیہ کے زمانہ میں جب حکومت ترکی کے تجارتی تعلقات یورپ کے ملکوں سے قائم ہوئے تو یورپین تاجروں کے توسط سے بیمہ اسلامی ملکوں میں داخل ہوا اور اس کے بارے میں اہل فقہ و فتاویٰ سے استفسارات شروع ہوئے (بحوالہ جواہر الفقہ ۲/۱۹۸)۔

بیمہ کی ابتدا جس جذبہ کے تحت ہوئی اور جس طرح وہ ارتقاء کے مختلف ادوار سے گزرا اس کی تفصیل گزر چکی ہے، لیکن اس کا انجام ابوزہرہ کے الفاظ میں قابل ملاحظہ ہے:

”اگرچہ اس کی اصلیت تعاون محض تھی، لیکن اس کا انجام بھی ہر اس ادارہ سا ہوا جو یہودیوں کے ہاتھ میں پڑا، یہودیوں نے اس نظام کو جس کی بنیاد ”تعاون علی البر والتقویٰ“ پر تھی، اسے ایک ایسے یہودی نظام میں تبدیل کر دیا جس میں قمار، ربوادوںوں پائے جاتے ہیں“ (التائین وموقف الشریعہ الاسلامیہ منہ ۱۳)۔

## ۳- بیمہ کی قسمیں:

بیمہ کی چار قسمیں ہیں:

(الف) زندگی کا بیمہ (ب) املاک کا بیمہ (ج) ذمہ داری کا بیمہ (د) سندات و کاغذات کا بیمہ۔

**الف: زندگی کا بیمہ:** اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بیمہ کمپنی اپنے ڈاکٹر کے ذریعہ بیمہ کی پالیسی خریدنے والے کا معائنہ کراتی ہے اور ڈاکٹر اس کی جسمانی حالت دیکھ کر یہ اندازہ کرتا ہے کہ اگر کوئی ناگہانی آفت پیش نہ آئی تو یہ شخص اتنے سال، مثلاً بیس سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔

میڈیکل رپورٹ پر کمپنی بیس سال کے لئے اس کی زندگی کا بیمہ کر لیتی ہے اور طالب بیمہ اور بیمہ کمپنی کے درمیان ایک رقم مقرر ہو جاتی ہے جو بالاقساط بیمہ دار کمپنی کو ادا کرتا رہتا ہے، اور ایک معینہ مدت میں جب وہ رقم ادا کر دیتا ہے بیمہ مکمل ہو جاتا ہے۔ اب اس کے بعد اگر بیمہ دار اپنی مدت کے بعد انتقال کر جاتا ہے جس کا اندازہ کمپنی کے ڈاکٹر نے کیا تھا تو کمپنی اس کے پسماندگان میں سے جسے وہ نامزد کر دے، یا اگر نامزد نہ کرے تو قانونی ورثاء کو وہ جمع شدہ رقم مع زائد رقم کے جس کو بونس (BONUS) کہتے ہیں، یکمشت ادا کر دیتی ہے۔

اور اگر وہ مدت مذکورہ سے پہلے مر جائے، خواہ طبعی موت سے، یا کسی حادثہ وغیرہ سے تو بھی کمپنی اس کے پسماندگان کو حسب تفصیل مذکور پوری رقم مع زائد رقم کے ادا کرتی ہے، البتہ اس صورت میں شرح سود زیادہ ہوتی ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ وہ شخص مدت مذکورہ کے بعد بھی زندہ رہے، اس شکل میں بھی اسے رقم مع منافع ملتی ہے، مگر شرح منافع کم ہوتی ہے (بحوالہ جواہر الفقہ ۱۹۸۲)۔

بعض شارحین قانون زندگی کے بیمہ کی تین صورتیں بیان کرتے ہیں:

۱- تاحیات بیمہ، ۲- میعادی بیمہ، ۳- بیمہ بشرط بقاء۔

## ۱- تاحیات بیمہ:

اس صورت میں کمپنی بیمہ کی رقم، بیمہ زندگی کے حاصل بیمہ دار کی وفات پر ادا کر دیتی ہے، چاہے اس کی وفات کسی بھی وقت ہو، یہ غیر میعادی بیمہ کہلاتا ہے، اس لئے کہ یہ پالیسی بیمہ زندگی کے پالیسی ہولڈر کی تمام زندگی پر حاوی رہتی ہے اور وہ بیمہ کی رقم کا حقدار اس وقت تک نہیں بنتا جب تک کہ اس کی وفات نہ ہو جائے، چاہے اس کی عمر کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو جائے۔

## ۲- میعادی بیمہ:

اس صورت میں بیمہ کمپنی بیمہ کی رقم اس وقت ادا کرتی ہے جب بیمہ زندگی کی پالیسی لینے والا شخص ایک مقررہ مدت کے اندر فوت ہو جاتا ہے اور اگر اس مقررہ مدت کے اندر وہ فوت نہیں ہوا تو کمپنی بری الذمہ ہو جاتی ہے اور بیمہ کی اقساط جو اس نے وصول کی ہیں اسی کی ہو جاتی ہیں۔

## ۳- بیمہ زندگی بشرط بقاء:

اس صورت میں تحفظ فراہم کرنے والا مستفید کو بیمہ کی رقم اس صورت میں ادا کرتا ہے جب بیمہ دار اس (مستفید) سے پہلے مر جائے اور اگر مستفید بیمہ دار سے پہلے فوت ہو گیا تو بیمہ ختم ہو جاتا ہے، تحفظ فراہم کرنے والا بیمہ کی رقم سے محفوظ ہو جاتا ہے اور جو اقساط وہ وصول کر چکا ہوتا ہے وہ اسی کی ہو جاتی ہیں (بیمہ کی شرعی حیثیت ۲۸-۲۹)۔

## (ب) املاک کا بیمہ:

اس وقت مکان و دکان، کارخانہ، موٹر وغیرہ ہر قسم کی املاک کے بیمہ کارواج ہو گیا ہے، اور عام طور پر لوگ پیش آمدہ خطرات و مضرات سے حفاظت کی خاطر اپنی املاک کا بیمہ کرا لیتے ہیں تاکہ حادثات کی صورت میں اپنا بچاؤ کر سکیں۔

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بیمہ دار ایک معینہ مدت کے لئے ایک مقرر رقم بالا قسطاً ادا کرتا ہے اور ایک معینہ مدت کے بعد اسے وہ رقم مع کچھ زائد رقم کے واپس کرتی ہے اور اگر کسی حادثہ کی وجہ سے بیمہ شدہ املاک تلف ہو جائے، مثلاً کارخانہ میں یکا یک آگ لگ جائے، یا جہاز غرق ہو جائے یا موٹر کسی حادثہ میں ٹوٹ جائے تو کمپنی اس نقصان کی تلافی کرتی ہے اور اصل رقم کے ساتھ کچھ مزید رقم زیادہ شرح فیصد کے حساب سے بیمہ کرانے والے کو دیتی ہے (جو اہر الفقہ ۲/۲۹)۔

### (ج) - ذمہ داریوں کا بیمہ:

اس قسم کے بیمہ میں بچہ کی تعلیم، شادی اور اس طرح کی مختلف ذمہ داریوں کا بیمہ ہوتا ہے۔ کمپنی ان کاموں کی ذمہ دار ہوتی ہے، رقم کی ادائیگی اور وصولی کی صورتیں وہی ہوتی ہیں جو اوپر ذکر کی گئیں اس قسم کے بیمہ میں آدمی خود کو اس نقصان سے محفوظ رکھنے کے لئے بیمہ کراتا ہے جو اس کے مال کو اس ذمہ داری کی بنا پر پہنچ سکتا ہے۔

### (د) - سندات و کاغذات کا بیمہ:

اس میں سندات و کاغذات کا بیمہ کرایا جاتا ہے اس کا رواج قدیم ہے، موجودہ دور میں ان چیزوں کا بیمہ عام ہے، محکمہ ڈاک و تار وغیرہ سندات و کاغذات وغیرہ کا بیمہ کرتے ہیں اور ضیاع و نقصان کی صورت میں محکمہ نقصان کی تلافی کرتا ہے۔

اس تمہید کے بعد ترتیب وار سوالات کے جوابات تحریر کئے جاتے ہیں:

۱- بیمہ خواہ جان کا ہو یا املاک کا، اس پالیسی میں قمار، ربا اور غرر و مخاطرہ کی شکلیں پائی جاتی ہیں اور قمار و ربا کی حرمت قرآن پاک سے منصوص ہے، اللہ کی شریعت قمار و ربا کو حرام اور سنگین قسم کا جرم قرار دیتی ہے۔ بیمہ پالیسی خریدنے والے دونوں گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

الف- اس میں قمار یا شبہ قمار پایا جاتا ہے۔

ب- اس کی تمام شکلوں میں ربا پایا جاتا ہے کہ بیمہ پالیسی خریدنے والا بالا قسطاً جمع کی

ہوئی رقم سے زیادہ بونس کے نام پر بیمہ کمپنی سے وصول کرتا ہے۔

ج۔ اس میں غرر پایا جاتا ہے اور غرر کے ساتھ عقود مالیہ درست نہیں ہوتے ہیں، لہذا فی نفسہ یہ معاملہ شرعاً ناجائز ہے۔ لیکن سوال کے اندر ہندوستان میں آئے دن کے فسادات اور جان و مال کے جن خطرات و نقصانات کی طرف نشاندہی کی گئی ہے وہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔

آج ہندوستان کے طول و عرض میں مسلم دشمن عناصر ہندوستانی مسلمانوں کی عزت و آبرو پامال کرنے، ان کے وجود و تشخص اور ملی امتیازات کو مٹانے، اقتصادی اور معاشی اعتبار سے ان کو مفلوج اور بے دست و پا کرنے کی جو منظم کوشش کر رہے ہیں اور جس طرح مسلمانوں کی نسل کشی ہو رہی ہے اور فسادات میں چین چین کر مسلمانوں کے املاک، مکانوں، صنعتوں، کارخانوں اور لہلہاتی کھیتیوں کو خاکستر اور تباہ و برباد کیا جاتا ہے وہ کوئی پوشیدہ امر نہیں ہے، حکومت جو آئینی اور دستوری اعتبار سے بلا تفریق مذہب و ملت یہاں کے تمام باشندوں کی جان و املاک کے تحفظ و بقا کی ذمہ دار ہے، وہ مسلمانوں کے تحفظ کی فکر نہیں کرتی، بلکہ اس کی مشنری اور ذمہ داران امن و امان کھلے عام فساد یوں اور فرقہ پرستوں کے ساتھ مل کر لوٹ مار اور قتل و غارتگری میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، نسل کشی اور املاک لوٹنے کی پوری اجازت دی جاتی ہے، حالات اس حد تک سنگین ہیں کہ فسادات کے دوران مسلمانوں کے معاہد، معاہد اور شعائر اسلام تک محفوظ نہیں رہتے، فسادات کے دوران سینکڑوں مساجد کو جلایا گیا، قرآن کے اوراق نذر آتش کئے گئے، مساجد پر قبضہ کر کے ان میں مورتیاں رکھی گئیں۔

ہندوستان کے موجودہ روح فرسا حالات ضرورتاً شدیدہ کا حکم رکھتے ہیں جس کی بنیاد پر ایک محظور شرعی اور حرام فعل بھی مباح ہو جاتا ہے، لہذا ان حالات میں حاجت و ضرورت کی بنا پر محض اپنی جان و املاک کی حفاظت اور دفع مضرت کی نیت سے، یا قانونی مجبوریوں کی وجہ سے اپنی جان و املاک کا ”الضرورات تبیح المحظورات“، ”الحاجة قد تنزل منزلة الضرورة“، ”الضرر يزال“ کے فقہی قاعدے کے تحت بیمہ کرانے کی گنجائش ہوگی، کیونکہ بیمہ کرا لینے کی صورت میں عموماً فساد یوں کی نظر سے املاک وغیرہ محفوظ ہو جاتی ہیں۔

## ۲- بیمہ دار کے لئے زائد رقم کا استعمال:

انشورنس فی نفسہ حرام و ممنوع ہے، فقہاء نے ”الضرر یزال“ اور ”الضرورات تبیح المحظورات“ کے قاعدے کے تحت ملکی حالات کے پیش نظر اس کی اجازت دی ہے، اس لئے بیمہ دار کے لئے بالاقساط اپنی جمع کردہ رقم سے زائد رقم کا استعمال جائز نہ ہوگا۔ اور بونس (BONUS) کے نام پر ملنے والی زائد رقم سود قرار پائے گی، جسے بیمہ کمپنی سے وصول کر کے بلا نیت ثواب اس کی مضرت اور وبال سے بچنے کی نیت سے مصارف سود پر صرف کرنا ضروری ہوگا، چنانچہ مفتی نظام الدین صاحب لائف انشورنس کے ایک استفتاء کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”کسی مقام کے حالات ایسے خراب ہو جائیں کہ بغیر انشورنس کے جان و مال کی حفاظت مشکل ہو جائے تو بوجہ مجبوری کے محض مجبوری کے بقدر گنجائش نکل سکتی ہے، مگر شرط یہ ہوگی کہ جمع کی ہوئی رقم سے زائد رقم جو ملے اس کو ثواب کی نیت کے بغیر، بلکہ اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے محتاج غرباء و مساکین کو دے دیا جائے“ (نظام الفتاویٰ ۱۵۱/۲-۱۵۲)۔

البتہ اگر بیمہ پالیسی خریدنے کے بعد کسی حادثہ کی وجہ سے بیمہ دار کی املاک و معیشت تباہ و برباد ہو جائے اور اس کی اقتصادی حالت اس قدر ناگفتہ بہ ہو جائے کہ بالاقساط جمع کی ہوئی رقم سے زائد رقم اگر استعمال نہ کرے تو اس کے لئے کاروبار کا از سر نو شروع کرنا ممکن ہی نہ ہو تو اس صورت میں بقدر ضرورت زائد رقم کے استعمال کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

”الضرر یزال“ کے پیش نظر خطرہ کی چیزوں کو بیمہ کرا لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اس شرط کے ساتھ کہ بیمہ کمپنی میں جو رقم جمع کرائی ہے اس سے زیادہ جو رقم ملے وہ غربا اور محتاجوں میں بلا نیت ثواب تقسیم کر دی جائے، اپنے کام میں ہرگز نہ لائی جائے، ہاں اگر خدا نخواستہ خود ہی محتاج ہو جائے تو علمائے کرام سے فتویٰ حاصل کر کے بقدر ضرورت اپنے

استعمال میں لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، فقہی قاعدہ ہے ”الضرورات تیج المحظورات“ اور یہ نیت رکھی جائے کہ اقتصادی حالت درست ہو جانے پر یہ رقم غرباء کو دے دی جائے گی“ (فتاویٰ رحیمیہ ۱۳۲۶-۱۳۳-۱۳۳۳)۔

### ۳- بیمہ دار کے ورثہ کے لئے زائد رقم کا استعمال:

پالیسی ہولڈر بیمہ کی مدت پوری کرنے سے پہلے مر جائے تو اس کے نامزد شخص، یا قانونی ورثہ کو بیمہ میں جمع کردہ رقم اضافے کے ساتھ ملتی ہے، یہ اضافی رقم بھی سودی رقم ہے، اس کا استعمال مرحوم کے ورثہ کے لئے جائز نہ ہوگا، بیمہ کمپنی سے نکال کر فقراء و مساکین پر بلا نیت ثواب اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے تصدق واجب ہوگا، البتہ اگر ورثہ اس طرح محتاج ہو جائیں کہ ان کے لئے زائد رقم کا استعمال ناگزیر ہو جائے تو جواب نمبر (۲) میں ذکر کردہ تفصیل کے مطابق زائد رقم کے استعمال کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

### ۴- فسادات میں جان و املاک کا ضیاع:

بیمہ کی صورت میں ملنے والی اضافی رقم کا اوپر جو حکم ذکر کیا گیا ہے وہ عام حالات میں ہے، اگر فسادات کے نتیجے میں پالیسی ہولڈر کی جان و املاک تباہ و برباد ہو جائے تو اس صورت میں چونکہ بیمہ کمپنی عموماً سرکاری ہوتی ہیں اور حکومت کی ذمہ داری اور فرض منصبی ہے کہ وہ مسلمانوں کو تحفظ دے، ان کی جان و املاک کی حفاظت کا بندوبست کرے، فسادات خود حکومت کی غفلت و بے پرواہی اور نظم و انصرام پر کنٹرول نہ رکھنے کی وجہ سے ہوتے ہیں، اس لئے اس صورت میں ملنے والی اضافی رقم کو ہم جان و املاک کی ضیاع کا عوض قرار دے سکتے ہیں اور اس کا استعمال پالیسی ہولڈر کے ورثہ کے لئے اور املاک کی ضیاع کی صورت میں خود پالیسی ہولڈر کے لئے جائز ہوگا۔



### ۵- سرکاری ملازمین کا جبری انشورنس:

سرکاری ملازمین کا ”جبری انشورنس“ ہوتا ہے۔ حکومت اپنے ملازمین پر ان کے مصالح اور پیش آمدہ خطرات سے تحفظ کے پیش نظر اسے ضروری قرار دیتی ہے، جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جبراً ملازمین کی تنخواہ کا ایک متعین حصہ ماہ بہ ماہ بیمہ پالیسی کے لئے کٹا رہتا ہے اور حسب ضابطہ گورنمنٹ ملازمت کے اختتام پر جمع شدہ رقم مع زائد رقم واپس کرتی ہے، یا ملازمت کے اختتام سے پہلے حسب ضابطہ بالاقساط بیمہ پالیسی کے لئے جمع شدہ رقم مع اضافہ کے واپس کرتی ہے، جبری انشورنس میں ملازم اپنی رضامندی اور اختیار سے بیمہ کا معاملہ نہیں کرتے، بلکہ پراویڈنٹ فنڈ (P.F.) کی طرح ایک متعین رقم ماہ بہ ماہ خود ہی بیمہ کے نام سے ان کی تنخواہ سے وضع کر لی جاتی ہے، اس لئے اس صورت میں ملازمین کو بالاقساط جمع شدہ سے زائد رقم ملے گی وہ سودی رقم نہ ہوگی، بلکہ (P.F.) ہی کی طرح تنخواہ کا ایک جزء ہوگی اور دونوں صورتوں میں اس کا استعمال ملازمین کے لئے جائز ہوگا۔ حضرت تھانوی پراویڈنٹ فنڈ (P.F.) میں ملنے والی اضافی رقم کا حکم ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”تنخواہ کا کوئی جزء اس طرح وضع کر دینا اور پھر یک مشت وصول کر لینا اگرچہ اس کے ساتھ سود کے نام سے کچھ رقم ملے یہ سب جائز ہے، کیونکہ درحقیقت یہ سود نہیں ہیں، اس لئے کہ تنخواہ کا وہ جزء جو وصول نہیں ہوا وہ اس ملازم کی ملک میں داخل نہیں ہوا، پس وہ زائد رقم اس کی مملوک شئی پر منتفع ہونے پر نہیں دی گئی، بلکہ تبرع ابتدائی ہے، گورنمنٹ اس کو اپنی اصطلاح میں سود ہی کہے“ (امداد الفتاویٰ ۱۵۹/۳)۔

### ۶- موٹر کار وغیرہ کا جبری انشورنس:

”جبری انشورنس“ کی ایک صورت یہ ہے کہ ملکی قانون کی رو سے اگر کوئی شخص بس، ٹرک، موٹر کار وغیرہ خریدتا ہے تو اسے اس کا انشورنس کرانا ہوتا ہے، انشورنس کرا لینے کے بعد اگر

کوئی حادثہ پیش آجائے تو بیمہ کمپنی اس حادثے کی تلافی کرتی ہے اور مقررہ رقم ادا کرتی ہے جبکہ حادثہ پیش نہ آنے کی صورت میں بیمہ کمپنی ادا کردہ اقساط واپس نہیں کرتی، بلکہ صرف کارو غیرہ کی مرمت کی اجرت دیتی ہے۔

ان چیزوں کے انشورنس میں اگرچہ قانونی اعتبار سے انسان مجبور ہوتا ہے، مگر انشورنس کا معاملہ وہ خود اپنے ارادہ و اختیار سے کرتا ہے، اس لئے اس صورت میں ملنے والی اضافی رقم سودی رقم قرار پائے گی اور اس کا استعمال جائز نہ ہوگا، فقراء و مساکین پر اس کا تصدق واجب ہوگا، جبر کی وجہ سے صرف یہ فائدہ ہوگا کہ انشورنس کرانے کی صورت میں عند اللہ مواخذہ سے بری ہوگا۔

۷۔ ٹرانسپورٹ کمپنی کا متعلقہ سامان کا انشورنس کرنا:

اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

الف۔ حمل و نقل کا کام انجام دینے والی کمپنیاں متعلقہ سامان کا خود انشورنس کر رہی ہیں، اس صورت میں انشورنس کا تعلق متعلقہ سامان کے مالک سے براہ راست نہیں ہے، بلکہ یہ انشورنس کمپنی اور ٹرانسپورٹ کمپنی کا نجی معاملہ ہے کہ پیش آمدہ خطرات و مضرات سے حفاظت کی خاطر وہ کمپنیاں متعلقہ سامان کا انشورنس کراتی ہیں تاکہ نقصان کی تلافی کر سکیں۔

ب۔ حمل و نقل کا کام انجام دینے والی کمپنیاں متعلقہ سامان کے مالک سے متعینہ اجرت سے زائد رقم لے کر یہ معاہدہ کرتی ہیں کہ ضیاع و نقصان کی صورت میں نقصان کی تلافی کریں گی۔

پہلی صورت میں انشورنس کا تعلق ٹرانسپورٹ کمپنی اور انشورنس کمپنی سے ہے، یہ ان دونوں کمپنیوں کا نجی اور ذاتی معاملہ ہے، اس سے سامان کے مالک کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دوسری صورت میں جبکہ ٹرانسپورٹ کمپنیاں اجرت سے زائد رقم لے کر تلافی نقصان کی ذمہ داری لیتی ہیں تو یہ معاملہ شرعاً جائز ہے اور ضیاع و نقصان کی صورت میں مذکورہ کمپنیوں سے متعلقہ سامان کا عوض وصول کرنا جائز قرار پائے گا۔

یہ معاملہ فقہ اسلامی کی رو سے ”اشتراط الضمان علی الأجير المشترك“

کے قبیل سے ہے، سامان کا مالک متعینہ اجرت سے زائد رقم دے کر یہ معاملہ کرتا ہے کہ سامان کے ضیاع و نقصان کی صورت میں ٹرانسپورٹ کمپنی اس نقصان کا تاوان ادا کرے گی، اسی کو فقہ کی اصطلاح میں ”اشتراط الضمان علی الأجير“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ وجوب ضمان ہر دو صورت میں ہوگا یا صرف اس صورت میں جبکہ متعلقہ سامان کے ضیاع و نقصان میں کمپنی کی تعدی و بے پرواہی کو دخل ہو، اس سلسلے میں کتب فقہ میں یہ تفصیل ملتی ہے:

”اگر شئی مستأجرہ کی ہلاکت کا سبب ایسی چیز ہو جس سے عموماً احتراز کیا جاسکتا ہے، جیسے غصب، سرقت وغیرہ تو ایسی صورت میں امام ابوحنیفہؒ، امام زفر اور امام حسن عدم وجوب ضمان کے قائل ہیں، جبکہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ وجوب ضمان کے“۔

”ملتقى الاجر“ میں اجیر مشترک پر وجوب ضمان کا حکم ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”و حکمہ اَنَّهُ آمین والمتاع فی یدہ أمانة لا یضمن إن هلك المال بلا صنعه، سواء امکن التحرز منه أولا عند أبی حنیفة والحسن وزفر وهو القیاس.... وعندهما یضمن إن هلك بشئى أمکن التحرز منه كالغصب والسرقه“ (ملتقى الاجر ۲/۳۹۱-۳۹۲)۔

علامہ شامی نے ”تبيين الحقائق“ کے حوالے سے صاحبین کے قول کو مفتی بہ قرار دیتے

ہوئے لکھا ہے:

”لوگوں کے حالات بدل جانے کی وجہ سے صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے اور اسی قول کو اختیار کرنے کی صورت میں لوگوں کے اموال کو تحفظ حاصل ہو سکتا ہے، کیونکہ اجیر مشترک جب یہ سمجھے گا کہ اس پر ضمان واجب نہیں ہوگا تو بسا اوقات وہ چوری یا گم شدگی کا دعویٰ کرے گا“ (رد المحتار ۶/۶۵)۔

صاحب ”خلاصۃ الفتاویٰ“ نے فقہاء کی آراء کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

”اگر کسی شخص نے صاحبِ حمام کو اپنا کپڑا اتار کر دیا اور اس کی حفاظت کی اجرت متعین کر کے یہ شرط لگا دی کہ اگر اس کا کپڑا ضائع ہو جائے تو اسے تاوان دینا ہوگا، فقہ ابو بکر کہتے ہیں کہ اشتراطِ ضمان کی صورت میں اجتماعی طور پر صاحبِ حمام پر وجوبِ ضمان ہوگا، امام ابو حنیفہؒ سے جو عدمِ ضمان کا قول منقول ہے وہ عدمِ اشتراط کی صورت میں ہے، فقہ ابو جعفر اشتراطِ ضمان اور عدمِ اشتراطِ ضمان کے مابین کوئی فرق نہیں کرتے اور ہر دو صورت میں وجوبِ ضمان کے قائل ہیں۔ فقہ ابو الیث کا یہی مسلک ہے اور صاحبِ خلاصۃ الفتاویٰ نے بھی اسی پر فتویٰ دیا ہے“ (خلاصۃ الفتاویٰ ۱۳۵/۳)۔

ان تفصیلات کی روشنی میں صاحبین کے مسلک کو اختیار کرنا اولیٰ اور راجح ہوگا اور ہر دو صورت میں وجوبِ ضمان ہوگا۔

### خلاصہ جو ابات

- ۱- ہندوستان کے موجودہ حالات میں شرعاً انشورنس کی گنجائش ہے۔
- ۲- انشورنس میں ملنے والی اضافی رقم سود ہے، جس کا غریب و مساکین پر صدقہ کرنا ضروری ہے۔
- ۳- فسادات کی صورت میں ملنے والی اضافی رقم جان و املاک کی ہلاکت و ضیاع کا معاوضہ قرار پائے گی، لہذا اس کا استعمال جائز ہوگا۔
- ۴- جبری انشورنس کی صورت میں سرکاری ملازمین کو بالاقساط جمع شدہ رقم سے زائد جو رقم ملتی ہے، وہ تنخواہ کا ایک جزء ہے (P.F.) کی طرح اس کا استعمال جائز ہے۔
- ۵- کارو غیرہ کے جبری انشورنس کی صورت میں ملنے والی اضافی رقم سودی رقم قرار پائے گی اس کا استعمال جائز نہ ہوگا، بلکہ اس کا تصدق واجب ہوگا۔
- ۶- ٹرانسپورٹ کمپنیوں پر ہر صورت میں ضمان واجب ہوگا۔

## ہندوستانی حالات میں بیمہ کی حیثیت

مفتی احمد خان پوری ☆

۱- بیمہ کی حقیقت کے سلسلہ میں حضرات مفتیان کرام اس بات پر متفق ہیں کہ وہ سود اور قمار کا مجموعہ ہے اور ان دونوں کی حرمت منصوص ہے، اس لئے عام حالات میں اس کا اختیار کرنا ناجائز و حرام ہے اور اس کی حقیقت مذکورہ کے پیش نظر بیمہ کمپنی کے سرکاری، یا غیر سرکاری ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

البتہ ہمارے ملک میں جو حالات درپیش ہیں خصوصاً ماضی قریب سے جو صورت حال پیدا ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے استیصال کی باقاعدہ اسکیمیں تیار کی جا رہی ہیں اور ان پر منظم طریقہ سے عمل ہو رہا ہے، جس میں سرکاری مشنری بھی پورے طور پر شامل ہے، جس کے نتیجہ میں مسلمان اپنے طور پر اگر اپنے جان و مال کی حفاظت کرنا چاہیں تو اس کی اجازت نہیں دی جاتی، بلکہ جان و مال کا شدید نقصان مسلمانوں کو پہنچانے کے ساتھ انہی پر جھوٹے مقدمات قائم کر کے انہیں قید و بند میں بھی ڈالا جاتا ہے اور قانون کے نام سے ان پر شدید مظالم ڈھائے جاتے ہیں، ان حالات میں اگر مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت اور ان کی جان و مال کو پہنچائے جانے والے نقصانات کی وصولیابی کی یہی صورت رہ جاتی ہے کہ وہ بیمہ کرائیں تو ان حالات میں فساد زمان کے پیش نظر اس کی گنجائش ہوگی اور ان کی جان و مال کو جتنا نقصان پہنچا ہے اس کی مقدار بیمہ کے

ذریعہ وصول کر کے اس کو اپنے استعمال میں لاسکتا ہے، اور اس کے ذریعہ دوبارہ اپنی تجارت کو جاری کرسکتا ہے، فقہ میں ایک مسلم اصول ہے کہ ضمان مباشر پر واجب ہوتا ہے متسبب پر نہیں، لیکن جب ایک وقت ایسا آیا کہ حکام تک جھوٹی شکایتیں پہنچا کر ان کے ہاتھوں مسلمانوں کے اموال کو ہلاک کیا جانے لگا تو ہمارے فقہائے حنفیہ نے ایسے لوگوں کی زجر و توبیح اور اموال مسلمین کی حفاظت کے پیش نظر فتویٰ دیا کہ ان سے تاوان وصول کیا جائے، یہاں تک کہ ایسا آدمی اگر انتقال کر چکا ہو تو اس کے ترکہ میں سے بھی تاوان وصول کرنے کی اجازت دی، تو موجودہ حالات میں غیر مسلم حکومت سے تاوان وصول کرنے کی جب یہ صورت ممکن ہے کہ مسلمان اپنی جان و مال کا بیمہ کرائیں تو اس کی گنجائش اور اجازت ہوگی، البتہ یہ اجازت اسی ملک میں اور موجودہ حالات کے ساتھ مخصوص ہے، اگر حالات میں تبدیلی رونما ہو تو پھر اس کے مطابق غور و فکر کر کے حکم لگایا جاسکتا ہے۔

۲- جان کے بیمہ میں پالیسی ہولڈر مدت بیمہ پوری ہونے سے پہلے انتقال کر جائے اور اس کی یہ موت طبعی ہے یا حادثاتی موت ہے، لیکن فساد یوں کے ہاتھوں نہیں ہوئی تو اس صورت میں ادا کردہ اقساط سے زائد رقم مرحوم کے وارثوں کے لئے جائز نہیں ہے، اور مدت پوری کر لینے کی صورت میں جمع کردہ رقم کے ساتھ ملنے والی زائد رقم کا استعمال اس کے لئے جائز نہیں ہے، یہ زائد رقم سود ہی ہے۔ بنک کے سود کا جو حکم ہے وہی اس رقم پر جاری ہوگا۔

۳- سرکاری محکمہ اپنے ملازمین کی تنخواہ میں سے جو مقدار بیمہ زندگی کے نام سے ہر ماہ جبری طور پر کاٹ لیتا ہے پھر حسب ضابطہ اختتام ملازمت پر یا اس سے پہلے جبراً کاٹی ہوئی رقم کی واپسی کے ساتھ جو زیادتی دیتا ہے اس پر شرعاً سود کی تعریف صادق نہیں آتی، اور اس کی رقم کو پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والی زائد رقم کی طرح محکمہ کا تبرع و انعام، یا تنخواہ کا جزء مؤجل قرار دیا جائے گا۔ لہذا ملازم کے لئے اس زائد رقم کی وصولیابی اور اس کا استعمال درست ہے۔

۴- کار، ٹرک وغیرہ اور تجارتی سامان کا جو بیمہ جبری کرانا ہوتا ہے یہ بھی شرعاً سود اور قمار

ہے، اس لئے اس میں بھی ادا کردہ رقم سے زائد رقم سود ہی شمار ہوگی، جس کو خود استعمال نہ کرتے ہوئے بنک کے سود کی طرح فقراء مسلمین کو بلا نیت ثواب دے دے۔

۵- نقل و حمل کا کام انجام دینے والی کمپنی اجیر مشترک کے حکم میں ہے اور نقل و حمل سے متعلق مال کا ضیاع اگر اجیر (یا اس کے آدمی) کے ذریعہ ہوا ہے تو ائمہ ثلاثہ حنفیہ کے نزدیک بالاتفاق اجیر مشترک پر ضمان ہلاک واجب ہے، چاہے اس کی بے احتیاطی کو دخل ہو یا نہ ہو، اور اگر مال کا ضیاع اجیر کے ذریعہ نہیں ہوا، بلکہ اجنبی کے فعل سے ہوا ہے تو اگر وہ حادثہ ایسا تھا جس سے بچاؤ ممکن نہ تھا تو بالاتفاق ائمہ ثلاثہ اجیر ضامن نہیں تھا اور اگر وہ حادثہ ممکن الاحتراز تھا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اجیر ضامن نہیں ہے، جبکہ صاحبین کے نزدیک اس پر ضمان واجب ہے۔

”إعلم أن الهلاك إما بفعل الأجير أولاً، والأول إما بالتعدى أولاً، والثاني إما يمكن الاحتراز عنه أولاً، ففي الأول بقسميه يضمن اتفاقاً، وفي ثاني الثاني لا يضمن اتفاقاً، وفي أوله لا يضمن عند الإمام مطلقاً ويضمن عندهما مطلقاً“ (شامی ۴۵/۵)۔

جن صورتوں میں اجیر مشترک ضامن ہوتا ہے ان صورتوں میں اس ضمان کی شرط لگانا اور نقصان و ضیاع کی صورت میں اس سے معاوضہ لینا جائز اور درست ہے، اور یہ جواز ہر حال میں ہوگا، مخصوص حالات کے ساتھ خاص نہیں ہے، البتہ جان کے ضمان کی شرط لگانا اور بہ صورت ضیاع اس کا معاوضہ لینا جائز نہیں۔

”ولا يضمن به بنى آدم ممن غرق فى السفينة أو سقط عن الدابة، و إن كان بسوقه أو قوده، لأن الأدمى لا يضمن بالعقد بل بالجناية ولا جناية لإذنه فيه“ (در مختار ۴۵/۵)۔

جن صورتوں میں اجیر پر ضمان کی شرط لگانا درست ہے ان میں بیمہ کے نام سے دی جانے والی رقم کو نقل و حمل کی اجرت شمار کیا جائے گا۔

## سرکاری وغیر سرکاری رائج بیمہ کا حکم

مولانا مفتی اسماعیل ☆

۱- کسی بھی قسم کے رائج الوقت اختیاری بیمہ کی فقہی حقیقت کے متعلق مفتیان کرام اور علماء فقہ اس بات پر متفق ہیں کہ بیمہ میں صریح طور پر سود اور قمار کا تحقق ہوتا ہے اور سود و قمار کی حرمت نصوص قطعیہ سے ثابت ہے، لہذا عام حالات میں اس کا عام حکم تو یہی ہے کہ کسی بھی قسم کا اختیاری بیمہ لینا ناجائز اور حرام ہے، اور بیمہ کمپنی چاہے سرکاری ہو یا غیر سرکاری ہو، شرعاً بیمہ رائج الوقت کی حقیقت و حکم میں کوئی فرق نہیں ہوگا، جیسا کہ (جوہر الفقہ ۲/ ۱۸۶، ۲۳۴) پر اس کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔

دکان و مکان وغیرہ املاک کے سرکاری بیمہ کو حراست و حفاظت کا عقد اجارہ قرار دینا بھی مشکل ہے، کیونکہ اولاً تو بیمہ کا معاملہ کسی حادثہ سے ہونے والے نقصان کا معاوضہ دینے کے عنوان سے ہوتا ہے، اجارہ حراست بشرط ضمان علی الاجیر کے عنوان سے نہیں ہوتا ہے، اور ثانیاً بیمہ ہولڈر کی خاص بیمہ شدہ املاک کی حفاظت کے لئے حکومت کا بیمہ ہونے کی صورت میں حکومت کی جانب سے کوئی خصوصی حفاظتی نظم بھی نہیں ہوتا، بلکہ اگر بیمہ ہولڈر خطرہ کی حالت میں سرکار سے حفاظتی نظم طلب کرے تو شاید حفاظتی نظم کا خرچ بھی اسی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

البتہ جو شخص ایسے مقام پر رہتا ہو اور اس کی املاک ایسے مقام پر ہو کہ جہاں فساد ہوتا



رہتا ہے، یا آئندہ ہونے کا قوی خطرہ ہے اور فساد کی وجہ سے جان و مال کے ضائع ہونے کا اور بیمہ لینے سے جان و مال کی حفاظت کا غالب گمان ہے تو ایسے مقام میں رہنے والے شخص کے لئے جان و مال کا بیمہ لینا بدرجہٴ مجبوری جائز ہے، جیسا کہ حضرات اکابر مفتیان کرام نے ایسے شخص کے لئے بیمہ لینے کی گنجائش بتلائی ہے (کفایت المفتی ۸/۸۰-۸۳، فتاویٰ محمودیہ ۲۴۰/۲، نظام الفتاویٰ ۱/۳۲۷، فتاویٰ رحیمیہ ۱۳۱/۶)۔

۲- جب تفصیل بالا سے یہ بات ثابت ہو چکی کہ بدرجہٴ مجبوری کیا جانے والا سرکاری، یا غیر سرکاری بیمہ کا معاملہ بھی شرعاً سود و قمار ہی کا معاملہ ہے اور وہ صرف بالواسطہ حفاظتی دباؤ بڑھانے کی غرض سے کیا جائے گا، اور وہ اجارہٴ حفاظت بشرطِ ضمان کا معاملہ نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ بیمہ شدہ جان و مال کو کوئی نقصان نہ پہنچنے کی صورت میں مدت پوری ہونے پر بیمہ کمپنی کی طرف سے اگر بہ طور بیمہ فیس اپنی ادا کردہ رقم کے ساتھ بنام بونس یا منافع یا سود کوئی زائد رقم ملتی ہے تو وہ شرعاً سود ہی کی رقم شمار ہوگی اور اسی طریقہ سے بیمہ شدہ جان و مال کو کوئی نقصان پہنچنے کی صورت میں معاوضہٴ نقصان کے طور پر ملنے والی رقم میں اپنی ادا کردہ رقم کی مقدار سے زائد مقدار میں جو رقم ملے گی وہ زائد رقم بھی شرعاً سود ہی شمار ہوگی، لہذا اپنی ادا کردہ رقم سے زائد رقم کا حکم یہی ہوگا کہ بلا نیت ثواب حرام مال سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی نیت سے مسلم فقراء کو دے دیا جائے اور اس کو اپنے استعمال میں نہ لایا جائے، الا یہ کہ وہ خود مجبور و محتاج ہو (البتہ اپنی ادا کردہ رقم کی مقدار بلا مجبوری اور احتیاج کے بھی اپنے جس جائز استعمال میں لانا چاہے لاسکتا ہے، کیونکہ ادا کردہ مقدار کی رقم اس کی اپنی ملوک اور جائز رقم ہے وہ سود کی رقم شمار نہ ہوگی) جیسا کہ مجبوری کی وجہ سے بینک میں جمع کردہ رقم پر بنام سود ملنے والی زائد رقم کا حکم باتفاق مفتیان کرام یہی ہے، چاہے باعتبار مصرف اس میں جزوی اختلاف موجود ہے۔

۳- سرکاری محکمہ سرکاری ملازمین کی تنخواہ میں سے جو حصہ تنخواہ بیمہ زندگی کے نام سے ماہ بہ ماہ جبری طور پر کاٹ لیتا ہے، پھر حسبِ ضابطہ ملازمت کے اختتام پر، یا ملازمت کے اختتام سے

پہلے جمع شدہ رقم کی واپسی کے ساتھ جو اضافہ ملتا ہے اس اضافہ پر پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر ملنے والی زائد رقم کی طرح شرعاً سود کی تعریف صادق نہیں آتی ہے اور اس رقم کو بھی پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والی زائد رقم پر قیاس کرتے ہوئے محکمہ کا تبرع و انعام یا تنخواہ کا جزء مؤجل قرار دیا جائے گا، لہذا ملازم کے لئے اس اضافہ کی رقم کو وصول کرنا اور اس کو اپنے استعمال میں لانا جائز ہوگا، جیسا کہ پراویڈنٹ فنڈ کے اضافہ کا حکم حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنے رسالہ بنام ”پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا شرعی“ میں تفصیل سے تحریر فرمایا ہے اور اس پر مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کے ارکان علماء کرام کے تصدیقی دستخط موجود ہیں۔

۴- کار، ٹرک وغیرہ ذرائع نقل و حرکت اور تجارتی سامان قانونی ”جبری بیمہ“ (جس میں کوئی حادثہ پیش نہ آنے کی صورت میں بطور پریمیم (PREMIUM) ادا کردہ رقم بیمہ ہولڈر کو واپس نہیں ملتی ہے) یہ بیمہ بھی شرعاً سود و قمار ہی کا معاملہ ہے اور اس قسم کے بیمہ کا لینا اگرچہ قانونی مجبوری کی وجہ سے جائز ہے، مگر کوئی حادثہ پیش آنے کی صورت میں اپنی ادا کردہ رقم سے زائد جو رقم حاصل ہو وہ زائد رقم شرعاً سود اور قمار ہی کی رقم شمار ہوگی جس کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے اور بینک کے سود کی طرح اس زائد رقم کو وصول کر کے مسلم فقراء کو بلائیت ثواب دے دینی ضروری ہے، اور اس صورت بیمہ میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہئے کہ کار، ٹرک وغیرہ کا بیمہ اگرچہ سرکاری قانون کی وجہ سے جبری ہو، لیکن کار وغیرہ خریدنا اختیاری ہے۔

۵- نقل و حمل کا کام انجام دینے والی کمپنی فقہی نقطہ نظر سے اجیر مشترک ہے اور نقل و حمل سے متعلق مال کے ضائع، یا نقصان زدہ ہونے کی بہت سی صورتوں میں باتفاق ائمہ ثلاثہ حنفیہ اجیر مشترک مال کا ضامن ہوتا ہے اور ناممکن الاحتراز حادثہ نقصان کی صورت میں بالاتفاق اجیر ضیاع و نقصان کا ضامن نہیں ہوتا اور جس صورت میں مال کا نقصان کسی ایسے حادثہ سے ہو جس میں اجیر کے فعل کو کوئی دخل نہ ہو، بلکہ غیر اجیر کے فعل سے وہ حادثہ نقصان ہوا ہو اور وہ حادثہ ممکن الاحتراز ہو تو اس صورت میں حضرت امام صاحبؒ اور صاحبینؒ کے درمیان اجیر کا ضامن ہونا مختلف فیہ

ہے، صاحبینؒ اس کو ضامن ٹھہراتے ہیں (ردالمحتار ۵/۴۰)۔

آج کل مذکورہ کمپنیوں کے اکثر نقصان رساں حادثات کمپنی کے عملہ کی غفلت اور بے احتیاطی کی وجہ سے پیش آتے ہیں اور حادثہ نقصان کی تحقیق میں ہر فریق عموماً اپنے بچاؤ کا پہلو اختیار کرتا ہے، چاہے وہ خلاف واقعہ ہو، لہذا لوگوں کے قابل نقل و حمل سامان کی حفاظت کی غرض سے مختلف فیہ صورت میں حضرات صاحبینؒ کے مسلک پر عمل کیا جاسکتا ہے، علامہ شامیؒ نے بعض فقہاء سے اس کا مفتی بہ ہونا بھی نقل فرمایا ہے (حوالہ سابق)۔

جن صورتوں میں اجیر مشترک ضیاع و نقصان مال کا ضامن ہوتا ہے ان صورتوں میں اس پر مال کے ضمان کی شرط ٹھہرانا اور نقصان کی صورت میں کمپنی سے معاوضہ لینا جائز اور درست ہے اور یہ جواز ہر صورت حال میں ہوگا، فسادات جیسے مخصوص حالات کے ساتھ یہ جواز مخصوص نہ ہوگا (تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاویٰ ہندیہ ۴/۵۰۰)۔

البتہ جان کے ضمان کی شرط لگانا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس کا ضمان اجیر پر عائد نہیں ہوتا

ہے (درمختار ۵/۴۲)۔

اشتراط ضمان علی الاجیر کے جواز کی صورتوں میں بیمہ کے عنوان سے دی جانے والی زائد رقم کو نقل و حمل کی اجرت شمار کیا جائے گا، جیسا کہ حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ نے ڈاک سے متعلق بیمہ کی رقم کو اجرت ڈاک کی زیادتی قرار دیا ہے (امداد الفتاویٰ ۱۶۱/۳)۔

مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی صاحب مدظلہ نے جہاز راں کمپنی سے بیمہ کا مال لے کر اس کو

نقصان کا ضامن بنانے اور نقصان کا معاوضہ لینے کو جائز لکھا ہے (جواہر الفقہ ۲/۲۳۷)۔

## فرقہ وارانہ فسادات کے پیش نظر جان و مال کا بیمہ

سید امین الحسن رضویؒ (دہلی)

جن حالات سے ہندوستان کے مسلمان آزادی وطن کے بعد سے گزرتے چلے آئے ہیں اور جن کا نہایت اجمالی خاکہ آپ نے اپنے اس استفتاء میں پیش فرمایا ہے، عین اس وقت تو حالات و خدشات سابق کے مقابلہ میں کہیں زیادہ شدید ہو گئے ہیں اور میری رائے میں صورت حالات اس مقام کو پہنچ چکی ہے کہ اسے ”مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ“ کے فیصلہ کے الفاظ میں ”ضرورت شدیدہ“ لازماً کہا جاسکتا ہے اور اس بنا پر میری رائے ہے کہ مسلمانوں کو اپنی جان و مال کا بیمہ کرانے کی درج ذیل دو شرطوں کے ساتھ اجازت دی جانی چاہئے۔

۱- جان و مال کا بیمہ صرف فرقہ وارانہ فسادات کے دوران اتلاف ہی کی بابت کرایا

جائے۔

۲- جان و مال کا بیمہ صرف سرکاری انشورس کمپنیوں ہی سے کرایا جائے۔

شرط نمبر ۲ کے عائد کرنے میں میرے پیش نظر وہ مصلحت ہے جس کا ذکر آپ کے استفسار نامہ کے ساتھ منسلک نوٹ کے (صفحہ ۵ کی آخری دس سطروں) میں کیا گیا ہے، یعنی یہ بات کہ اس کا بار ایک طرح سے حکومت پر پڑے گا جو اصلاً شہریوں کی جان و مال کے تحفظ کی ذمہ دار ہے اور اس وجہ سے بھی کہ اس کا امکان ہے کہ اس صورت میں امن و قانون برقرار رکھنے کی سرکاری ایجنسیوں سے حکومت کا احتساب سخت ہوگا جو اب تقریباً مفقود ہے اور نتیجتاً وہ فرقہ وارانہ

فسادات کے دوران زیادہ غیر جانب داری اور فرض شناسی کے ساتھ فساد کو پھیلنے سے روکنے کی کوشش کریں گی۔

اب میں ان دو سوالوں کا جواب عرض کرتا ہوں جو استفسار نامہ کے (صفحہ ۷) پر قائم کئے گئے ہیں، لیکن اس سے پہلے یہ عرض کر دوں کہ میرا تاثر یہ ہے کہ ان سوالات کے قائم کرنے میں ایک ہلکا سا تسامح ہو گیا ہے، لگتا ایسا ہے کہ املاک کے بیمہ کے طریقہ کار کو بھی عام بیمہ زندگی کے طریقہ کار پر قیاس کر لیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے، عام بیمہ زندگی کے بارے میں طریقہ کار یہ ہے کہ جتنی رقم کا بیمہ کروایا جا رہا ہو، بیمہ کروانے والے کی عمر اور صحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بیمہ کی کل رقم کو اس شخص کے باقی ماندہ متوقع عرصہ حیات سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ (مثلاً بیمہ کی رقم ۱۰۰۰،۰۰۰، ÷ ۴۰ = ۲۵۰۰۰ روپیہ - متوقع عرصہ حیات) اور حاصل تقسیم کو سالانہ پریمیم (PREMIUM) قرار دیا جاتا ہے، اس صورت میں اگر پالیسی ہولڈر (بیمہ کرانے والا) پوری چالیس قسطیں ادا کرنے سے قبل کسی وقت فوت ہو جائے (خواہ اس نے صرف پہلی قسط ہی کیوں نہ ادا کی ہو) تو انشورنس کمپنی اس کے ورثاء کو بیمہ کی پوری رقم، یعنی ایک لاکھ روپیہ ادا کرتی ہے، ورنہ وہ شخص پورے چالیس سالوں تک ۲۵۰۰ روپیہ سالانہ بہ طور پریمیم (قسط) بیمہ کمپنی کو ادا کرتا رہے گا اور چالیس سال گزر جانے کے بعد (جس کو اصطلاحاً پالیسی کا (MATURE) ہونا کہتے ہیں) اس شخص کو اپنے ادا کردہ ایک لاکھ روپیہ مع سود واپس ملیں گے۔ یہ زائد رقم، خواہ بہ عنوان بونس ادا کی جائے، خواہ بہ عنوان سود، صریحاً سود ہے اور اس سے استفادہ ناجائز ہے۔

املاک کے اتلاف کے بیمہ کی صورت میں بیمہ کروانے والے کو سالانہ اقساط ادا نہیں کرنی ہوتی ہیں، بلکہ پریمیم کی رقم ایک ہی دفعہ اور یکمشت ادا کرنی ہوتی ہے، یہ انشورنس ایک متعینہ مدت کے لئے ہوتا ہے، اس مدت میں اگر بیمہ شدہ جائیداد پر اتلاف واقع نہ ہو تو انشورنس کمپنی بیمہ کروانے والے کو کوئی رقم ادا نہیں کرتی، بلکہ اس مدت کے انقضاء کے بعد نیا انشورنس بہ ادائے پریمیم کروانا ہوتا ہے۔

املاک کے بیمہ کی صورت میں پرییم کی رقم (جو ایک ہی دفعہ اور ایک مشت ادا کرنی ہوتی ہے) بہت معمولی، یعنی بیمہ کی مالیت کا لگ بھگ سوانی صد ہوتی ہے، گویا اگر ملک بیمہ شدہ بشمول سامان تجارت وغیرہ کا بیمہ، مثلاً ایک لاکھ روپیہ کا کروایا جائے تو پرییم کی رقم صرف ۱۲۵۰ روپیہ ہوگی۔

اس وضاحت کے بعد (صفحہ ۷) پر دوسرا سوال آپ نے قائم فرمایا ہے، اس کا جواب عرض کرتا ہوں، یعنی فسادات کے نتیجہ میں ملک کے ضیاع کی صورت میں ”انشورنس کمپنی کی طرف سے پالیسی ہولڈر کی طرف سے ادا کی ہوئی (پرییم کی) رقم سے زائد رقم (یعنی جس رقم کا بیمہ کروایا گیا ہو۔ مثلاً ایک لاکھ روپیہ) متاثرین کو ضابطہ کے مطابق ادا کرے تو اس زائد رقم سے استفادہ اور تصرف کو درست قرار دیا جائے یا نہیں؟“ میری رائے میں اس زائد رقم سے استفادہ اور تصرف کو درست قرار دینا چاہئے، ورنہ اگر صرف پرییم کی صورت میں ادا کی ہوئی رقم ہی سے استفادہ اور اس کے تصرف کی اجازت دی جائے تو انشورنس کروانے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا جس کے پیش نظر ان غیر معمولی حالات کے باعث اس کی اجازت دینی مقصود ہے، اور ملک بیمہ شدہ کے اتلاف کے نقصان کی تلافی نہیں ہو پائے گی اور نہ ہی وہ مصلحت پوری ہوگی، یعنی حکومت کو زیر بار کرنا جو جملہ دیگر وجوہ پیش نظر ہے۔

بیمہ زندگی کی صورت میں اس شرط کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں کہ اسے صرف بہ صورت فسادات ہی کروانے کی اجازت دینی چاہئے۔ اس معاملہ میں بھی وہی صورت واقع ہوگی، یعنی پرییم کی رقمیں سالانہ اقساط میں نہیں، بلکہ ایک ہی دفعہ اور ایک مشت رقم ادا کرنی ہوگی (جس طرح املاک کے بیمہ کی صورت میں) اور جس بنیاد پر املاک کے بیمہ کی پوری رقم لینے اور اس سے استفادہ اور اس پر تصرف کو میں نے اوپر درست قرار دیا ہے، اسی بنیاد پر بیمہ زندگی کی صورت میں بھی دوران فساد جان کے زیاں کی صورت میں مقتول کے ورثاء کے لئے بیمہ کی پوری رقم انشورنس کمپنی سے لے کر اس سے استفادہ اور تصرف کو میں درست سمجھتا ہوں۔

البتہ اس ذیل میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس پر غور کرنا ضروری ہے، مسلمان کئی برسوں سے حکومت سے یہ مطالبہ کرتے آ رہے ہیں کہ فسادات میں ہلاک ہونے والوں کی جان کا معاوضہ ادا کیا جائے، اس سلسلہ میں اب تک کوئی قانون تو منظور نہیں ہوا ہے، لیکن ادھر کچھ دنوں سے عملاً یہ ہو رہا ہے کہ بعض ریاستی حکومتیں فسادات میں ہلاک ہونے والوں کے ورثاء کو قلمی امداد دینے کا اعلان کرتی ہیں اور بعض صورتوں میں یہ رقم ادا ہو بھی جاتی ہے، اب قابل غور بات یہ رہ جاتی ہے کہ اگر کسی شخص نے فساد کے نتیجے میں ہلاک ہو جانے کی بابت اپنی جان کا بیمہ کروایا ہو اور وہ ہلاک ہو جائے اور حکومت اپنے اعلان کے مطابق مہلک کے ورثاء کو نقد معاوضہ بھی ادا کرنا چاہے جبکہ اس نے اپنی جان کا بیمہ کروا رکھا ہے اور بیمہ کمپنی بھی اس کے ورثاء کو بیمہ کی رقم ادا کرنے والی ہو تو کیا ان ورثاء کو دونوں جگہ سے رقم لینا درست ہوگا یا نہیں، اور اس صورت میں ان ورثاء کو کیا عمل کرنا چاہئے؟۔ اس مسئلہ پر علماء غور فرمائیں اور رہنمائی دیں۔

ان دو اصل سوالوں پر اپنی رائے عرض کرنے کے بعد اب ان دو ضمنی سوالوں پر مبنی اپنی رائے پیش کرتا ہوں جن کا تعلق جبری بیمہ زندگی اور موٹر کار، لاری، پینجر بس اور اسکوٹر وغیرہ کے جبری بیمہ سے ہے۔

حکومت کی طرف سے سرکاری ملازمین کے جبری بیمہ زندگی کا جہاں تک تعلق ہے وہ چونکہ جبری ہے اور شخص متعلقہ اس پر مجبور ہے، اس لئے بیمہ زندگی کا جو ماہوار پریمیم اس کی تنخواہ سے وضع کیا جاتا ہے اس حد تک تو اس کو معذور سمجھنا چاہئے، لیکن اگر اس کی پالیسی کے (MATURE) ہونے سے قبل اس کا انتقال ہو جائے تو اس کے ورثاء کے لئے صرف اتنی ہی رقم کو لینا اور اس سے استفادہ کرنا جائز ہوگا جو متوفی کے انتقال سے قبل تک پریمیم کے طور پر اس کی تنخواہ سے وضع ہو کر حکومت کے پاس جمع ہو چکی ہو، اس سے زائد رقم کا لینا اور اس سے استفادہ کرنا ورثاء کے لئے میری رائے میں جائز نہیں ہے، جس طرح سود دینا تو بعض صورتوں میں بدرجہ مجبوری بہاؤ ہو جاتا ہے، لیکن سود کا لینا کسی بھی صورت میں روا نہیں ہوتا، جہاں تک

اس زائد رقم کو پراویڈنٹ فنڈ کے قانون کے تحت اصل رقم (رأس المال) سے زائد ملنے والی رقم پر قیاس کرنے اور اس بناء پر اسے جائز قرار دینے کا سوال ہے، میری عرض ہے کہ اول تو اس صورت معاملہ کو پراویڈنٹ فنڈ کے معاملہ پر قیاس کرنا ہی درست نہیں، دوسرے یہ کہ پراویڈنٹ فنڈ کے ضابطہ کے تحت آجر اور اجیر کی طرف سے ماہ بہ ماہ جمع شدہ جملہ رقم سے جو زائد رقم کارکن کو ادا کی جاتی ہے وہ بہ عنوان سود ہی ادا کی جاتی ہے، اور میری رائے میں وہ زائد رقم صریحاً سود ہی ہے، اس لئے اس سے استفادہ ناجائز ہے۔

البتہ اس معاملہ کا ایک ذیلی پہلو ہے جو قابل غور ہے اور وہ یہ کہ ملازم سرکار جس کی تنخواہ سے جبری بیمہ زندگی کی بابت ماہ بہ ماہ پر بیمہ کی رقم وضع کی جاتی ہو وہ اگر طبعی موت سے ہٹ کر فرقہ وارانہ فساد میں ہلاک ہو جائے تو اس بارے میں کیا حکم ہوگا؟۔ میری رائے میں صرف اس صورت میں اس کے ورثاء کے لئے اس بات سے قطع نظر کہ متوفی نے پر بیمہ کے طور پر کتنی رقم ادا کی تھی وہ کل رقم حکومت سے لینا اور اس سے استفادہ کرنا جائز ہونا چاہئے جس کی بابت اس کا بیمہ ہوا تھا، یہ اس لئے کہ دوسرے تمام شہریوں کی طرح ملازم سرکاری کی جان کے تحفظ کی بھی حکومت ذمہ دار ہوتی ہے اور اس ذمہ داری کو پورا نہ کرنے میں قصور کی بابت حکومت معاوضہ ادا کرنے کی ذمہ دار ہے، اس پہلو سے علماء حضرات غور فرمائیں۔

اوپر جبری بیمہ زندگی کے تعلق سے جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہی عرض موٹر کار، لاری، پنجر بس، موٹر سائیکل اور اسکوٹر کے جبری بیمہ کے تعلق سے بھی ہے۔ ان کے اتلاف کی صورت میں بھی جتنی رقم بہ طور پر بیمہ ادا کی جا چکی ہو اس سے زائد رقم کا لینا میری دانست میں ناجائز ہے (اس لئے کہ اس سے قمار کا حکم متعلق ہوگا)۔

مال تجارت، یا دوسرے سامان کے حمل و نقل کی صورت میں اگر بار بردار ادارہ (CARRIER COMPANY) خود بیمہ کرتا ہو تو صرف اس سے بیمہ کروانا میری رائے میں جائز ہوگا (اس لئے کہ اس کی صورت ضمان کی ہوگی) اور اس صورت میں بھی اتلاف مال کی



انشورنس

﴿۳۵۳﴾

اس صورت میں بیمہ کی رقم (CARRIER COMPANY) سے لینا صرف اس صورت میں  
جائز ہونا چاہئے جبکہ اتلاف کا سبب (CARRIER) کمپنی یا اس کے عمال کی غفلت و لاپرواہی  
سے ہوا ہو، نہ کہ کسی اور آفت ارضی و سماوی کے باعث یا کسی اتفاقی حادثہ کے سبب۔

☆☆☆

## انشورنس کسی بھی حال میں جائز نہیں

☆ مولانا محمد آدم پالپوری ☆

۱- بیمہ خواہ زندگی کا ہو یا املاک کا، چونکہ سود و قمار پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ گناہ بھی بڑے سنگین ہیں جن کو حلال سمجھنا کفر ہے، اس لئے اس کی عمومی اجازت ہندوستان کے موجودہ حالات میں بھی دینا جائز نہیں، کیونکہ عمومی اجازت دینے میں اس کا مظنہ ہے کہ لمبے عرصہ کے بعد عام لوگوں کے ذہنوں سے اس کی قباحت نکل جائے۔

البتہ جس شخص کو اپنی جان، یا مال کی حفاظت ہی بیمہ کے بغیر مشکل معلوم ہوتی ہو، اور بیمہ کرائی لینے کی صورت میں مفسدوں کی نظر بد سے جان و مال کی حفاظت بہ ظن غالب ہو جاتی ہو تو قانون فقہ ”الضرر یزال“ کے پیش نظر خطرے کی چیزوں کا بیمہ کرائی لینے کی گنجائش ہے۔ اسی طرح قانونی مجبوری کی صورت میں بھی بیمہ کرائی لینے کی گنجائش ہے (فتاویٰ محمودیہ ۲۴۰/۲، نظام الفتاویٰ ۴۰/۱، فتاویٰ رحیمیہ ۱۳۳/۶، کفایۃ المفتی ۸۴/۸)۔

۲- ضرورت شدیدہ میں یا مسئلہ نہ جاننے کی بنا پر اگر کسی نے زندگی کا غیر جبری بیمہ کرایا اور مدت بیمہ پوری ہونے سے پہلے مر گیا تو زائد رقم کا استعمال و ارشین کے لئے جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ صورۃ رشوت ہے، جیسا کہ حضرت تھانویؒ نے (امداد الفتاویٰ ۱۶۱/۳) میں تحریر فرمایا ہے:

”لأن المال فیہ عوض من غیر متقوم وهو النفس“۔

اور حقیقتاً یہ رقم سود ہے اور سود اور رشوت کی رقم وارثوں کے لئے بھی حرام ہے، اور دوسرے حضرات کے نزدیک قمار بھی ہے اور قمار بھی حرام ہے۔

اور اگر بیمہ کرانے والے نے اپنی مقررہ مدت پوری کر لی تو خود اس کے لئے بھی یہ زائد رقم استعمال کرنا حرام ہے، کیونکہ اس صورت میں یہ زائد رقم سود ہے۔

اور املاک کے اختیاری و جبری دونوں بیوں میں بھی زائد رقم کا استعمال بیمہ دار کے لئے حرام ہے، کیونکہ وہ صورت تلف شدہ مال کا عوض ہے، اس بنا پر وہ قمار ہے۔

”لأنه تعليق الملك على الخطر والمال في الجانبيين“

اور حقیقتاً بالاقساط جمع کردہ رقم کا عوض ہے اور اس بنا پر وہ سود ہے ”لعدم اشتراط

المساواة فيما يجب فيه المساواة“۔

۳- فسادات کی صورت میں بیمہ شدہ جان و مال کی ہلاکت یا ضیاع ہو جائے اور انشورس کمپنی متاثرین کو زائد رقم ادا کرے اور ہم یہ تصور کریں کہ یہ زائد رقم ہلاک شدہ جان و مال کا معاوضہ ہے، تب بھی اس سے استفادہ درست نہیں ہو سکتا، کیونکہ بیمہ املاک میں زائد رقم ہر حال میں صورت تلف شدہ مال کا عوض ہی ہوتی ہے جس سے اس پر صورت قمار کی تعریف ”تعليق الملك على الخطر والمال في الجانبيين“ صادق آتی ہے۔

اور بیمہ زندگی میں زائد رقم ہر حال میں صورت تلف شدہ جان کا عوض ہوتی ہے، جس سے اس پر صورت رشوت کی تعریف ”كون المال فيه عوضاً من غير متقوم وهو النفس“ صادق آتی ہے، جیسا کہ حضرت تھانویؒ نے (امداد الفتاویٰ ۱۶۱/۳) پر تحریر فرمایا ہے۔

لہذا زائد رقم کو جان و مال کا معاوضہ تصور کرنے سے بھی وہ قمار و رشوت کے حدود سے خارج نہ ہوگی، بلکہ معاوضہ تصور کرنا اس زائد رقم کے قمار و رشوت ہونے کو اور مستحکم کر دے گا۔

بلاشبہ حکومت اپنے شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہے اور اسی بنا پر فسادات کی صورت میں متاثرین کی امداد بھی کرتی ہے، اس امداد کو تو حکومت کا عطیہ قرار دیا جاسکتا

ہے، لیکن بیمہ کی بنیاد پر بیمہ داروں کو جو رقمیں دیتی ہے وہ ربوا و قمار اور رشوت ہی کے دائرے میں آتی ہیں، اسی بنا پر یہ رقمیں غیر بیمہ داروں کو نہیں دیتی، اور اول الذکر عطیہ دونوں کو دیتی ہے جس سے دونوں کا معیار الگ الگ ہونا معلوم ہوتا ہے۔

البتہ اگر فسادات کی وجہ سے بیمہ دار خود ہی محتاج ہو جاوے تو علماء کرام سے فتویٰ حاصل کر کے بیمہ کی بنیاد پر ملی ہوئی زائد رقم کو غربت کی وجہ سے بہ قدر ضرورت اپنے استعمال میں لاسکتا ہے، کیونکہ سودی رقم کو انتہاء درجے کی مجبوری اور اضطراری حالت کے بغیر اپنے استعمال میں لانا حرام ہے (فتاویٰ رحمیہ ۱۳۳۶)۔

۴- سرکاری ملازمین کے ”جبری بیمہ زندگی“ کو پراویڈنٹ فنڈ پر قیاس کرنا صحیح ہے اور اس میں زائد رقم عطیہ ہوگی اور علت جامعہ ”جبر“ یعنی اپنے اختیار سے حرام معاملہ نہ کرنا ہے۔

”لأن مالهم مباح برضا هم وإنما يلحق في بعض الصور اثم العقد ولا

عقد بالجبر“ (امداد الفتاویٰ ۱۳۸۳)۔

البتہ کار و غیرہ، نیز تجارتی سامان کے جبری انشورنس کو پراویڈنٹ فنڈ پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، لہذا اس میں زائد رقم غریب کو بلا نیت ثواب کے دے دینا لازم ہوگا۔

اور ان دونوں میں وجہ فرق یہ ہے کہ کار اور تجارتی سامان کے بیمہ میں اپنے اختیار سے سودی و قماری معاملہ کا عقد کرتا ہے گو قانونی جبر کی وجہ سے معذور سمجھا جائے گا (آخرت میں مواخذہ نہ ہوگا) لیکن زائد رقم بوجہ عقد کے سود و قمار ہی کہلائے گی، عطیہ نہیں ہوگی، برخلاف جبری بیمہ زندگی کے کہ اس میں اس کے سودی عقد کے بغیر خود حکومت ہی اس کی تنخواہ میں سے مقررہ رقم وضع کر لیتی ہے، اس لئے اس میں وہ معذور بھی سمجھا جائے گا اور زائد رقم عطیہ بھی ہوگی۔

ایک بات قابل وضاحت یہ ہے کہ املاک کے ”جبری انشورنس“ میں معذور اسی شخص کو قرار دیا جائے گا جو اس چیز کو اختیار کرنے پر مجبور ہو جس کے لئے جبری انشورنس کا قانون ہے، لہذا جو شخص اس چیز کو اختیار کرنے پر مجبور نہ ہو، جس کے لئے جبری انشورنس کا قانون ہے وہ

معذور نہیں سمجھا جائے گا، مثلاً ایک مسلمان تاجر بڑے پیمانے پر تجارت کرنا چاہتا ہے اور اس کے سامنے اس کی دو صورتیں ہیں، ایک صورت یہ ہے کہ بین الاقوامی منڈیوں میں مال بیچے (جس کے لئے مال کا انشورڈ ہونا لازم ہے) اور دوسری صورت یہ ہے کہ بین الاقوامی منڈیوں میں مال نہ بیچے (جس میں جبری انشورنس کے قانون سے بچ جاتا ہے) تو اس پر لازم ہے کہ دوسری صورت کو اختیار کر لے، اگر پہلی صورت اختیار کرے گا تو وہ اپنے اختیار سے ربا و قمار کا مرتکب کہلائے گا، اور معذور نہیں قرار دیا جاوے گا، کیونکہ سرکاری جبری بیمہ قانون میں اس نے اپنے کو باختیار خود داخل کیا، بالفاظ دیگر حلال طریقہ کار کو باختیار خود چھوڑ کر حرام طریقہ کار میں داخل ہوا، و قس علیٰ هذا۔

۵- حمل و نقل کا کام انجام دینے والی ٹرانسپورٹ کمپنیاں اگر خود متعلقہ سامان کا انشورنس کریں اور اجرت سے زائد رقم لے کر یہ معاملہ کریں کہ بہ صورت ضیاع و نقصان ہم ذمہ دار ہیں تو اس صورت میں معاملہ کرنے والی کمپنیوں سے نقصان کا معاوضہ لینا درست ہے۔

کیونکہ اس کی حقیقت سود و قمار نہیں ہے، بلکہ یہ عقد اجارہ ہے، ٹرانسپورٹ کمپنیاں اجیر ہیں اور بیمہ زیادتِ اجر ہے اور تلافی نقصان کی ذمہ داری اشتراط ضمان علی الاجیر المشتراک ہے جس کو بعض فقہاء نے جائز کہا ہے، بخلاف سرکاری بیویوں کے کہ کمپنی اس مال و جان میں کوئی عمل نہیں کرتی، ان میں یہ تاویل محتمل نہیں۔

اور یہ جواز بہ قول ”اشباہ“ ہر حال میں ہوگا جبکہ حمل و نقل کا کام کرنے والی ٹرانسپورٹ کمپنیاں خود بیمہ کریں (تفصیل کے لئے دیکھئے: الدر المختار باب ضمان الاجیر ۴/۵۴۳، شامی ۴/۵۴۳، امداد الفتاویٰ ۳/۱۶۱، ۳۱۰)۔



## موجودہ حالات کی وجہ سے بیمہ کرانا

مفتی جمیل احمد ندیری ☆

۱- حالاتِ مذکورہ میں زندگی، تجارت، صنعت، مکانات اور مساجد و مدارس کا بیمہ کر لینے کی گنجائش ہے۔

ویسے فسادات میں جانی نقصان زیادہ تر معمولی اور درمیانی درجہ کے مسلمانوں کا ہوتا ہے، بیمہ کرانے کی سکت اُن میں نہیں ہوتی کہ قسط وار رقم جمع کر سکیں، لہذا رقم ادا کرنے کے اندیشہ سے حکومت فسادات کو روکے گی، یہ محض امید موہوم ہے۔

املاک و جائداد کا نقصان بھی زیادہ معمولی اور درمیانی درجہ کے مسلمانوں کا ہوتا ہے، بعض بڑے مسلمانوں کا بھی ہو جاتا ہے۔ بہر حال بیمہ کرانے کی سکت عام طور پر اس طبقہ میں نہیں ہوتی ہے جسے فسادات کا زیادہ وار سہنا پڑتا ہے۔

۲- زائد از جمع رقم، خواہ مدت پوری ہونے سے قبل مرنے پر ملے، یا مکمل اقساط جمع ہو جانے پر ملے، اس کو خود استعمال کرنے کی گنجائش نہیں، البتہ استعمال کی گنجائش کے معاملے میں مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب کے اس فتویٰ کی طرف احقر کا بھی رجحان ہے:

”ہاں اگر خدا نخواستہ خود ہی محتاج ہو جائے تو علماء کرام سے فتویٰ حاصل کر کے بقدر ضرورت اپنے استعمال میں لینے کی گنجائش ہے، فقہی قاعدہ ہے: ”الضرورات تبیح المحظورات“

☆ ناظم جامعہ عربیہ عین الاسلام، مبارکپور، اعظم گڑھ

(ضرورت ناجائز اشیاء کو مباح کر دیتی ہے) اور یہ نیت رکھی جائے کہ اقتصادی حالت درست ہو جانے پر یہ رقم غرباء کو دے دی جائے گی۔“  
چند سطروں کے بعد پھر لکھتے ہیں:

”اور اگر بہ حالتِ اضطرار کچھ اپنے کام میں لینے پر مجبور ہو جائے تو خوش حال ہونے پر اسے بھی خیرات کر دے“ (فتاویٰ رجیمیہ ۱۳۲/۶، ۱۳۵)۔

۳- فسادات کی صورت میں جان و مال کی ہلاکت و ضیاع اور اس کے نتیجے میں انشورنس کے تحت ملنے والی زائد جمع رقم کو حکومت کی امداد اور معاوضہ جان و مال نہیں تصور کیا جاسکتا، کیونکہ انشورنس پالیسی کے مطابق یہ رقم تو اسے ہر حال میں ملنی تھی، خواہ فساد میں مرتا یا کسی اور حادثہ میں، یا طبعی موت۔

لہذا اگر فسادات کے موقع پر ملنے والی زائد رقم کو حکومت کی امداد یا حکومت کے طرف سے جان و مال کا معاوضہ تصور کیا جائے تو فسادات کے علاوہ موقعوں پر مرنے اور املاک کے ضائع ہونے پر اسی رقم کو کیا قرار دیا جائے؟، ایک ہی جگہ سے ایک ہی نوعیت سے ملنے والی رقموں کی الگ الگ توجیہ محل نظر ہے۔

۴- جبری انشورنس کی صورت میں بھی زائد رقم کو انشورنس کرانے والا، یا اس کے ورثاء استعمال نہیں کر سکتے بلایت ثواب محض تفریح ذمہ کے لئے غرباء کو صدقہ کر دیں یا پھر اسی صورت میں استعمال کریں، جو فتاویٰ رجیمیہ (۱۳۲/۶، ۱۳۵) کے حوالہ سے جواب نمبر ۲ کے تحت گزری۔

۵- اگر وہ متعین حصہ سرکاری ملازمین کو ملے بغیر کٹ کر ”جبری بیمہ“ کے فنڈ میں جمع ہوتا رہے تو جمع شدہ رقم یا مع اضافہ پراویڈنٹ فنڈ پر قیاس کرتے ہوئے جائز ہے اور سرکاری ملازمین اسے لے کر اپنے جس مصرف میں چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔

۶- زائد رقم کا اس صورت میں بھی وہی حکم ہے جو (جواب نمبر ۲ و ۴) کے تحت تفصیل سے گزرا۔

۷- اس صورت میں نقل و حمل کا کام کرنے والی کمپنیوں اور اداروں سے نقصان کا معاوضہ لینا ہر حال میں جائز ہے، نہ کہ صرف مخصوص حالات میں۔

درمختار میں ہے: ”فلا تضمن بالهلاك إلا إذا كانت الوديعة بأجر“

(۴۹۴/۴)۔

شامی میں ہے: ”ان المودع اذا اخذ الاجرة على الوديعة يضمنها اذا

هلكت“ (شامی ۳۴۵/۳)۔





## بیمہ کی شرعی حیثیت

مولانا سید مصلح الدین ☆

۱- انشورنس (بیمہ) مخاطرہ، قمار، سود وغیرہ گناہوں پر مشتمل ہے۔ قمار اور سود بہ نص کتاب و سنت حرام و ناجائز ہیں، لہذا بیمہ پالیسی اختیار کرنا دونوں قسم کے گناہوں کا موجب ہے، اس لئے جان و مال کا بیمہ کرنا فی نفسہ شرعاً ناجائز اور واجب الاحتراز ہے۔

لیکن آج کل ہندوستان میں مسلمانوں کی املاک، دکانوں، مکانوں، صنعتوں، کارخانوں، کھیتوں حتیٰ کہ معابد و مساجد و اسلامی معابد و مراکز کو نشانہ بنا کر لوٹ مار، آتش زنی وغیرہ ذرائع سے تباہ و برباد کیا جاتا بھی ایک امر واقعہ اور ناقابل انکار حقیقت ہے۔

ہندوستان کا نظام حکومت سیکولر اور جمہوری ہے جس میں بلا امتیاز مذہب و ملت تمام باشندگان ملک کے جان و مال کا تحفظ حکومت ہند کی ذمہ داری ہے اس کے باوجود حکمراں طبقہ اور ذمہ داران امن و امان مسلمانوں کے جان و مال کے تحفظ کا انتظام نہیں کرتے، بلکہ مجرمانہ غفلت برتتے ہیں اور کھلی جانب داری کا ثبوت دیتے ہیں، قانونی چارہ جوئی نامزد رپورٹ اور نشاندہی کے باوجود مسلمانوں کا لوٹا ہوا مال برآمد نہیں کیا جاتا اور نہ ہی فساد یوں اور مجرموں کے خلاف کوئی تعزیری کارروائی کی جاتی ہے۔

عرصہ دراز سے مختلف مقامات کے فسادات کے تجربہ اور مشاہدہ سے یہ بات واضح

ہو جاتی ہے کہ املاک و اموال کا بیمہ ہونے کا علم فساد یوں اور مجرموں کو ہو جانے کی صورت میں وہ بیمہ شدہ املاک و اموال کو نقصان پہنچانے سے اکثر و بیشتر گریز کرتے ہیں اور اگر خدا نخواستہ نقصان کر بھی دیں تب بھی بیمہ کمپنیاں بیمہ شدہ املاک و اموال کا معاوضہ دیتی ہیں جس سے کافی حد تک نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے اور فساد یوں کی مقصد بر آری نہیں ہوتی، بہر حال مذکورہ بالا تجربہ اور مشاہدہ کے تحت یہ انشورنس (بیمہ) املاک و اموال کی تباہی و اقتصادی بد حالی سے حفاظت میں مفید و موثر ہے۔

بناء بریں اس نازک ترین صورت حال میں مسلمانوں کی املاک و اموال کو تباہی و بربادی اور اقتصادی بد حالی سے بچانے کی خاطر مجبوری اور ضرورت کے پیش نظر محض حفاظت اور دفع مضرت کی نیت سے ”الضرر یزال“ اور ”الضرورات تبیح المحظورات“ کے فقہی ضابطہ کی روشنی میں اموال و املاک کا بیمہ کرانے کی گنجائش ہے۔

لہذا مسلمانوں کو جب اپنی املاک و اموال کے سلسلہ میں شدید خطرات و نقصانات کا اندیشہ قوی ہو تو اپنے مکانات، دکانوں، جائدادوں، صنایع و کارخانوں حتیٰ کہ مساجد و مدارس و دینی معاہدہ و مراکز وغیرہ کا بیمہ کرا لینا جائز ہے۔

۲- بیمہ شدہ املاک و اموال کے فسادات میں ہلاک و تباہ ہو جانے کی شکل میں پالیسی ہولڈر کو نقصانات کی حد تک نقصان کی تلافی کے لئے بیمہ کمپنی سے معاوضہ کی رقم لینا جائز ہے، نقصان سے زیادہ رقم جائز الحصول و جائز الانتفاع نہ ہوگی، کیونکہ بیمہ املاک و اموال کا جواز صرف مجبوری اور ضرورت پر مبنی ہے اور بہ مقدار نقصان معاوضہ وصول کرنے سے وہ ضرورت پوری ہو جاتی ہے، لہذا حسب ضابطہ فقہیہ: ”الضرورة تنقدر بقدر الضرورة“ نقصان سے زیادہ رقم انشورنس کمپنی سے وصول کرنا اور اس کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

۳- ”جبری انشورنس“ میں ماہ بہ ماہ جتنی رقم کٹتی ہے اتنی ہی اصل رقم لینا جائز ہوگا، اصل رقم کے ساتھ اضافہ شدہ زائد رقم لینا جائز نہیں ہے۔

۴- حمل و نقل انجام دینے والی کمپنیاں خود متعلقہ سامان کا انشورنس کریں اور اجرت حمل و نقل سے زائد رقم لے کر بہ صورت ضیاع و نقصان اس نقصان کا معاوضہ دیں، اور اس نقصان کی تلافی کر دیں، تو اس صورت میں معاوضہ لینے کا کیا حکم ہوگا؟

اس سلسلہ میں یہ عرض ہے کہ کمپنی خود تو مال کی کسی قسم کی حفاظت نہیں کر سکتی، بے شک وہ قانونی طور پر نقصان کی ذمہ داری لیتی ہے، بایں معنی کہ کمپنی کی نظر میں جو نقصان ثابت ہو اس کو ادا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے اور اسی ذمہ داری کی بنیاد پر وہ پالیسی ہولڈر کے پاس سے وہ رقم (زائد اجرت حمل و نقل) وصول کرتی ہے اور اس رقم سے وہ اپنا کاروبار چلاتی ہے جو سودی بھی ہوتا ہے، بہر حال پالیسی ہولڈر کا تعلق اس کمپنی سے صرف اتنی حد تک ہی ہے کہ اس کو اپنے ضائع، یا نقصان شدہ مال کا معاوضہ مل جائے، بلکہ فرض کر لیجئے کہ اس کی نیت یہ ہو کہ اپنے نقصان سے زیادہ نہ لوں گا، یا جو کچھ لوں گا وہ غریبوں کو تقسیم کر دوں گا وغیرہ، مگر ان تمام امور کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک طرح کا سودی کاروبار ہے جس میں قمار کی بھی نوعیت ہے اور اسلام میں سود و قمار دونوں حرام ہیں، لہذا اس میں شرکت و تعاون جائز نہیں ہے۔

”تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“ (سورہ مائدہ: ۲)۔

۵- بیمہ زندگی (جیون بیمہ) کسی بھی نیت و مصلحت سے جائز نہیں، کیونکہ بیمہ جان کا حال بیمہ املاک و اموال سے مختلف ہے۔ اگر باب اموال و املاک کی معتد بہ تعداد کا بیمہ کرانا اور اس بیمہ کا املاک و اموال کی حفاظت میں مفید و موثر ہونا ممکن ہے، بلکہ ایک حد تک واقعہ و مشاہدہ ہے، اس کے برخلاف مسلمانوں میں اصحاب دولت و وجاہت کی تعداد مفلوک الحال غریب اور پسماندہ مسلمانوں کی تعداد کی بہ نسبت بہت کم ہے اور اب تک کا تجربہ اور مشاہدہ یہی ہے کہ فسادات میں زیادہ تر جانی نقصان مسلمان غریب طبقہ کا ہی ہوتا ہے، یہی لوگ اکثر مارے اور قتل کئے جاتے ہیں، فسادات سے جانی طور پر متاثر اس غریب طبقہ کی اکثریت جان کا بیمہ کرانے کی پوزیشن میں نہیں ہے، لہذا بیمہ جان مسلمانوں کے قتل اور نسل کشی سے تحفظ کے سلسلہ میں بیمہ املاک و اموال

کی حد تک مفید و موثر نہیں، بناء بریں بیمہ جان کو بیمہ املاک پر قیاس کر کے درج بالا فقہی اصول: ”الضرر یزال“ اور ”الضرورات تبیح المحظورات“ کی بنیاد پر جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ بیمہ جان کو مبتلی بہ (جو شخص جان کے خطرہ کے پیش نظر جیون بیمہ کرانا چاہتا ہو) کی رائے اور اپنے علاقہ کے مستند و معتبر عالم دین کے مشورہ وغیرہ کی قیود و شرائط کے ساتھ بھی جائز قرار دینا مناسب نہیں ہے، کیونکہ عام طور پر شرط و قیود نظر انداز کر دی جاتی ہیں اور عمومی تاثر یہ ہوتا ہے کہ علماء کرام نے بیمہ جان کی اجازت دے دی ہے، لہذا سد باب کے طور پر بیمہ جان کو مطلقاً ناجائز اور مسلمانوں کے لئے واجب الاحتراز قرار دینا ہی انساب و احوط ہے۔



## جان و مال کا بیمہ

مولانا ابوالحسن علی ☆

بیمہ ”انشورس“ خواہ جان کا ہو، یا مال کا اس کی تمام مروجہ صورتیں ناجائز ہیں، کیونکہ اس میں شرعاً بہت سی قباحتیں اور برائیاں پائی جاتی ہیں، یعنی سود، قمار اور مخاطرہ کو مستلزم ہے اور سود و قمار اسلام میں ایسے سخت ترین گناہ ہیں کہ اس کے تصور ہی سے ایک مومن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ان گناہوں پر سخت ترین وعیدیں وارد ہیں۔ قرآن میں اس کی حرمت پر نصوص صریح موجود ہیں۔ اس لئے بیمہ کو مباح و حلال قرار دینے کی کوئی مسلمان بھی جرأت نہیں کر سکتا ہے، لیکن ”مجمع الفقہ الاسلامی“ کی جانب سے ہندوستان کے موجودہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے جو سوالات بھیجے گئے ہیں وہ بھی یقیناً قابل توجہ ہیں۔ سوالات میں کہا گیا ہے کہ:

ہندوستان کے موجودہ حالات میں جبکہ مسلمانوں کی جان و مال محفوظ نہیں ہیں اور ہر لمحہ ان کی جان ان کا مال اور ان کی مساجد، نیز مدارس خطرہ میں ہیں اور بسا اوقات اس طرح کے واقعات میں حکومت کی غفلت یا اس کے جانب دارانہ رویہ کو بھی دخل ہوتا ہے۔

اس عبارت میں جن سنگین خطرات و حالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ واقعی قابل توجہ ہیں، آج ہمارے ملک میں اسلام دشمن جارحیت پسند طاقتوں کو کھلی چھوٹ ہے کہ وہ جب چاہیں مسلمانوں کی جان و مال پر حملہ کر کے ختم کر دیں، منصوبہ بند طریقہ پر مسلمانوں کے مکانون،

دکانوں، کارخانوں کو، نیز مساجد کو لوٹ لیا جاتا ہے اور لوٹنے کے بعد اس کو اطمینان سے جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا جاتا ہے اور حکومت کے ذمہ دار یا تو خاموش تماشاخی بنے رہتے ہیں یا پھر فساد یوں کے ساتھ مل کر ان کا ساتھ دیتے رہتے ہیں، یہ واقعات اس قدر کثرت کے ساتھ پیش آرہے ہیں کہ اس سے انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے، اسی لئے علمائے کرام نے آج کل کے انہی حالات کے پیش نظر مسلمانوں کے لئے بیمہ کرانے کی اجازت دی ہے، جیسا کہ ”مجلس تحقیقات شرعیہ“ کے فتویٰ سے ظاہر ہے، میرے نزدیک بھی موجودہ حالات میں ضرورت شدیدہ کے پیش نظر املاک کے بیمہ کرانے کی گنجائش موجود ہے، لہذا املاک خواہ دکان ہوں یا مکان، یا کارخانے اور فیکڑیاں، مسلمانوں کے لئے اس کے بیمہ کرانے کی گنجائش ہے، اور فقہی قاعدہ ”الضرر يزال“ نیز ”الضرورات تبیح المحظورات“ کے قاعدہ کے تحت اس کی اجازت اس وقت تک کے لئے دی جاسکتی ہے جب تک کہ موجودہ حالات برقرار رہتے ہیں اور ضرورت شدیدہ کا تحقق قائم رہتا ہے۔

انشورنس شدہ املاک کو فساد یا تباہ و برباد کر ڈالتے ہیں اور انشورنس کمپنی پالیسی ہولڈر کی طرف سے جمع کردہ رقم سے زائد رقم اپنے ضابطہ کے مطابق ادا کرتی ہے تو اس کو املاک کا ضمان قرار دے کر اس سے استفادہ کی اجازت دی جاسکتی ہے، بشرطیکہ انشورنس کمپنی حکومت کے زیر نگرانی ہو، یعنی وہ کمپنی نیشنلائز ہو، اگر انشورنس کمپنی غیر سرکاری ہو تو پھر اس کی اجازت نہیں ہوگی کہ زائد رقم کو خود پالیسی ہولڈر استعمال کرے، بلکہ اس صورت میں اس زائد رقم کا صدقہ کر دینا واجب ہوگا۔

اسی طرح انشورڈ شدہ املاک کو اگر آدمی خود تعدی کر کے تباہ کر دے تاکہ انشورنس کمپنی سے زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرے، جیسا کہ اس طرح کے واقعات دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں تو اس صورت میں بھی پالیسی ہولڈر نے جو رقم ادا کیا ہے اس سے زیادہ رقم اگر ان کو انشورنس کمپنی سے ملی ہے تو اس کا استعمال ان کے لئے مباح نہیں ہوگا، بلکہ اس زائد رقم کو غریبوں،

مسکینوں پر صدقہ کر دینا واجب ہوگا۔

اسی طرح اگر بیمہ کرانے والا بیمہ کی مدت پوری کرنے سے قبل طبعی موت مرجائے، یعنی فساد وغیرہ کے ماسوا کسی اور وجہ، مثلاً بیماری وغیرہ سے انتقال کر جائے اور بیمہ کمپنی مرحوم کے ورثاء کو اس کی جمع کردہ رقم سے زائد رقم ادا کرے تو ورثاء کے لئے اس زائد رقم کا استعمال جائز نہیں ہوگا، کیونکہ وہ سود ہے، لہذا ورثاء پر واجب ہوگا کہ اس زائد رقم کو بلا نیت ثواب صدقہ کر دیں۔

اگر بیمہ کرانے والا بیمہ کی مدت پوری کر لیتا ہے اور بلا قسطا جتنی رقم کا جمع کرانا ضروری تھا وہ جمع کر دیتا ہے اور اب وہ خود کمپنی سے اپنی جمع کردہ رقم سے حسب ضابطہ بیمہ کمپنی زائد رقم وصول کرتا ہے تو اس صورت میں بھی ان کے لئے یہ زائد رقم استعمال کرنا مباح نہیں ہوگا اور اس پر واجب ہوگا کہ اس زائد رقم کو صدقہ کر دے خود استعمال نہ کرے۔

”جبری انشورنس“ جس سے قانونی مجبوری کی وجہ سے پچنا آدمی کے اختیار میں نہیں ہے تو اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے، چنانچہ اس کے جواز پر تقریباً سبھی علماء اور اصحاب فتویٰ کا اتفاق ہے، کیونکہ یہ اضطرار کی صورت میں داخل ہے اور جس طرح اضطرار کی حالت میں اکل مہیتہ کی شرعاً اجازت ہے اسی طرح بیمہ کی بھی اجازت ہوگی۔

سرکاری ملازمین جن کے لئے زندگی کا بیمہ لازمی ہے اور اس کے بغیر وہ سرکاری ملازمت نہیں کر سکتے، ان کے لئے بھی جیون، یعنی زندگی بیمہ کرانا جائز ہوگا اور چونکہ حکومت ان کی تنخواہ میں ان کو تنخواہ ادا کرنے سے قبل ہی ایک مخصوص رقم بیمہ کے نام سے وضع کر لیتی ہے اور اختتام ملازمت پر ان کو وہ رقم مع اضافہ واپس کرتی ہے، تو اس صورت میں میرے نزدیک اس ملازم کے لئے وہ زائد رقم لینا اور استعمال کرنا مباح ہوگا، کیونکہ وہ سود نہیں ہے، بلکہ حکومت کی طرف سے گویا انعام ہے اگرچہ اس کو سود کے نام ہی سے دیا جائے مگر وہ حقیقت میں سود نہیں ہے، میرے خیال میں اس صورت میں اور پراویڈنٹ فنڈ والی صورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

کار اور ٹرک وغیرہ کا بیمہ بھی جبری بیمہ کی صورت میں داخل ہے، لہذا اس کو بھی مباح

قرار دیا جائے گا، اب اگر کوئی حادثہ پیش آتا ہے اور ادا کردہ رقم سے بیمہ کرانے والے کو کچھ زائد رقم ملتی ہے تو کمپنی کی طرف سے اس کو امداد و اعانت میں شمار کیا جاسکتا ہے اور اس کے لئے اس کا استعمال بھی مباح اور درست ہوگا، کیونکہ یہ زائد رقم تو ان کو صرف حادثات کے پیش آنے کی صورت ہی میں ملتے ہیں، حادثات پیش نہ آویں تو کچھ نہیں ملے گا، لہذا یہ بھی سو نہیں ہوگا۔

اب تک جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے اس کا تعلق املاک کے بیمہ سے ہے، یا املاک اور جان کے جبری بیمہ سے اس کا تعلق تھا، لیکن بلا کسی جبر کے جان کا بیمہ بھی کرایا جاسکتا ہے یا نہیں اس سلسلہ میں میرے خیالات حسب ذیل ہیں:

اب رہی یہ بحث کہ آدمی کے لئے بلا کسی قانونی مجبوری کے بھی اپنی زندگی کا یا اپنے کسی اعضا کا بیمہ کرانا جائز ہے یا نہیں، تو اس بارے میں اگرچہ علماء نے اس کی اجازت دی ہے اور ”مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ“ نے بھی اپنے فیصلہ میں اس کی اجازت دی ہے، مگر مجھے اس سلسلہ میں شرح صدر نہیں ہے اور جان کا بیمہ کرانا مجھے روح اسلام کے منافی اور عقیدہ اسلام کے خلاف معلوم ہوتا ہے، اس لئے میں اس کو ناجائز سمجھتا ہوں، جان کے بیمہ کی اجازت میں کئی باتیں قابل غور ہیں:

پہلی بات تو یہ ہے کہ بیمہ جو سود اور قمار کا مرکب ہے اس کی اجازت تو ضرورت شدیدہ کی بنا پر دی جاتی ہے تاکہ بہ ظن غالب اس سے املاک کی حفاظت ہو جائے اور فساد یوں کی نظر بد سے محفوظ رہے اور ہلاکت و بربادی کی صورت میں دوبارہ زندگی کا سہارا بن سکے، مگر جان کا معاملہ یہ ہے کہ بیمہ کرانے سے زندگی محفوظ نہیں ہو سکتی ہے، کیونکہ انشورنس کمپنی کسی کے جان کی نہ تو حفاظت کر سکتی ہے، نہ اس کی طرف سے اس قسم کا کوئی وعدہ ہی ہوتا ہے اور اگر اس طرح کا کوئی وعدہ اور گارنٹی ہو بھی تو قابل اعتبار نہیں ہوگا، کیونکہ یہ مخلوق کے دائرہ اختیار سے باہر کی چیز ہے، موت کا وقت اور اس کی صورت اور اسباب سب ہی اللہ کی طرف سے مقرر اور طے شدہ امور ہیں جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے، فساد ہی عناصر کو بھی کسی کے زندگی کے بیمہ کا علم ہونا مشکل ہے



اور اگر ہو بھی جائے تو وہ محض اس بنا پر کہ اس کی زندگی کا بیمہ ہے وہ اس پر حملہ نہیں کرے گا یہ محض واہمہ ہے جو حقائق کے خلاف ہے، اس لئے حیون بیمہ کرانے میں ایمان کا نقصان ہے اور جان کے بیمہ کرانے کی اجازت دینا گو یا مسلمانوں کے ایمان کو کمزور کرنا، اللہ پر اعتماد و بھروسہ کو ختم کرنا ہے اور ایسے اسباب سے مسلمانوں کو بچانا ضروری ہے کہ جس سے ان کا اصل سرمایہ، یعنی ایمان ہی ختم ہو جائے یا کمزور پڑ جائے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ فساد میں زیادہ تر غرباء اور کمزور طبقات کے مسلمان مارے جاتے ہیں اور بیمہ کے جواز سے ان غریب اور پسماندہ مسلمانوں کو کوئی فائدہ ملنے والا نہیں ہے، کیونکہ وہ لوگ اپنی زندگی کا بیمہ کرانے کی طاقت ہی نہیں رکھتے ہیں، ان کے پاس اتنی رقم ہی نہیں ہوتی ہے کہ وہ انشورس کمپنی کے واجب الادا قسط کو ادا کر سکیں۔

ہاں اس سے امراء کے طبقہ کو جو مسلمانوں میں بہت ہی کم ہیں، فائدہ ضرور ہوگا، حالانکہ ان کو اس کی ضرورت ہی نہیں ہے، کیونکہ امراء اپنے اثر و رسوخ اور ظاہری اسباب و تعلقات کی وجہ سے فساد میں بہت ہی کم مارے جاتے ہیں اور جو مارے بھی جاتے ہیں تو ان کے ورثاء عموماً مستغنی ہوتے ہیں، اس لئے ان کو جان کے بیمہ کی ضرورت ہی نہیں ہے، چہ جائیکہ ضرورت شدیدہ ہو۔

البتہ اس صورت میں مالدار حضرات کو موقع مل جائے گا اور وہ فتویٰ کا سہارا لے کر بلا ضرورت اپنی زندگی کا بیمہ کرائیں گے اور اس میں دین کا نقصان ہوگا، اس لئے جان کے بیمہ کی اجازت نہ دینا ہی انسب ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جان کا بیمہ کرانے کے بعد اللہ تعالیٰ سے ایک گونہ بے نیاز ہو جائے گا اور مشکلات اور پریشانی کے عالم میں آدمی کے اندر جو رجوع الی اللہ، انابت اور خشوع و خضوع اور تضرع کی کیفیت ہونی چاہئے وہ نہیں ہو پائے گی، وہ سمجھے گا کہ میرا کیا میں اگر مر بھی گیا تو کوئی فکر کی بات نہیں ہے، بیمہ کمپنی سے ہمارے پس ماندگان کی ضرورت پوری ہو جائے گی، تو

اس کی نظر اللہ کی بجائے بیمہ کمپنی کی طرف ہوگی جو ایک مسلمان کے لئے غیر مناسب بات ہے۔  
بہر حال ”جبری بیمہ“ کی صورت میں تو آدمی مجبور ہے، مگر عام حالات میں جان کے  
بیمہ کرانے کی مسلمانوں کو اجازت دینا۔ ”مجمع الفقہ الاسلامی“ جیسے ادارہ کی طرف سے میں جائز  
نہیں سمجھتا ہوں۔



## بیمہ کی شرعی حیثیت

مولانا محمد عزیز القاسمی ☆

- ۱- بیمہ کمپنی کی طرف سے بیمہ دار کو منافع کی شکل میں ملنے والی رقم بلاشبہ سود اور ربوا ہے، محض کسی چیز کا نام بدل دینے سے اس کی حقیقت نہیں بدلتی۔
- ۲- مصالِح مذکورہ کی بناء پر انشورنس کی اجازت نہیں دی جاسکتی، کیونکہ اس میں ربوا اور قمار دونوں پائے جاتے ہیں اور دونوں کو حرمت قرآن پاک میں موجود ہے۔  
 ”أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا“ (سورہ بقرہ: ۲۷۵)، ”إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ“ (سورہ مائدہ: ۹۰)۔
- لیکن ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمانوں کی جان و مال عزت و آبرو ہر وقت خطرہ میں ہو بہ خیال حفاظت، انشورنس کی اجازت کے سلسلہ میں سیمینار کو غور و فکر کرنا چاہئے کہ یہ وقت کا اہم تقاضہ ہے۔
- ۳- زندگی کے بیمہ، املاک کے بیمہ اور ذمہ داری کے بیمہ کے درمیان شرعاً کوئی فرق نہیں ہے، اس لئے تینوں کا ایک ہی حکم ہوگا۔
- ۴- معاملہ کی یہ شرط کہ اگر بیمہ شدہ شخص یا شئی وقت معین سے پہلے تلف ہو جائے تو اتنی رقم

ملے گی اور اس کے بعد تلف ہوئی تو اتنی رقم ملے گی، جبکہ تلف ہونے کا تعین غیر ممکن ہے، اس معاملہ کو قمار کی حدود میں تو داخل نہیں کر دیتی؟۔

بلاشبہ یہ شرط اس معاملہ کو قمار کی حدود میں داخل کر دیتی ہے، کیونکہ قمار کی تعریف اس پر صادق آتی ہے، اگر یہ قمار ہے، یا غرر، تو کیا مصالح مذکورہ کے پیش نظر اسے نظر انداز کر کے اس معاملہ کے جواز کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے اور اگر نکل سکتی ہے تو کیسے؟۔ اس معاملہ کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی جب تک بیمہ کو صحیح اسلامی اصولوں پر ترتیب نہ دیا جائے۔

۶- اگر بیمہ دار مندرجہ اقسام بیمہ میں سے کسی میں سود لینے سے بالکل احتراز کرتے ہوئے صرف اپنی رقم کی واپسی چاہتا ہو تو بھی عام حالات میں انشورنس کی اجازت نہیں دی جاسکتی، کیونکہ انشورنس سے اعانت علی الاثم ہوگی جس سے قرآن نے روکا ہے: ”وَلَا تَعَاوَنُوا عَلٰی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“ (سورہ مائدہ: ۲)۔

لیکن بحالت موجودہ مسلمانوں کی جان و مال کے تحفظ کے پیش نظر انتہائی مجبوری کی حالت میں انشورنس کا معاملہ جائز ہونا چاہئے اور اس کے لئے شرکاء سمینار کو بڑی سنجیدگی سے غور و فکر کی ضرورت ہے۔

۷- کمپنی کی طرف سے ملنے والی سودی رقم کو اعانت و امداد اور تبرع و احسان قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ کسی چیز کا محض نام بدل دینے سے اس کی حقیقت نہیں بدلتی، ربوا اپنی جگہ پر باقی رہے گا۔

۸- اگر کوئی مسلمان کسی دارالحرب کا باشندہ ہو (مستأمن نہیں) اور کمپنی حریوں ہی کی ہو تو اس صورت میں معاملہ مسلمان کے لئے جائز ہوگا، کیونکہ فقہاء نے دارالحرب میں عقود فاسدہ کی اجازت دی ہے۔

” لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب، لأن مالهم مباح فی دارهم فبأی طریق أخذہ المسلم أخذ مالاً مباحاً إذا لم یکن فیہ غدر“ (ہدایہ ثالث)۔

۹- انشورنس کا کاروبار حکومت کر رہی ہو یا نجی کمپنیاں دونوں کا حکم یکساں ہے۔

۱۰- اگر یہ کاروبار حکومت کے ہاتھ میں ہو تو بھی زیر بحث معاملہ میں سود کی رقم کو عطیہ حکومت قرار دے کر بھی اس معاملہ کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ کسی چیز کا محض نام بدل دینے سے اس کی حقیقت نہیں بدلتی، بہر حال ربوا اپنی جگہ پر باقی رہے گا۔

۱۱- سوال میں درج صورتوں کے پیش نظر کسی کے لئے بیمہ پالیسی کی خریداری جائز نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اس کے جواز کا فتویٰ دیا جاسکتا ہے، کیونکہ کسی عمل کی حرمت اور برائی اس لئے نہیں دور ہو جائے گی کہ اس کا مقصد اچھا ہے اور نہ نیک مقصد کی خاطر حرام ذرائع کا استعمال کرنا صحیح ہو سکتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص کسی عذر شدید کی بنا پر بیمہ پالیسی خریدتا ہے تو اس سے ملنے والی سودی رقم بہ نیت رفع وبال، سوال میں درج تین صورتوں میں سے دو ”ب“ اور ”ج“ میں استعمال کر سکتا ہے، لیکن ”الف“ میں استعمال کرنا میرے نزدیک ایسا ہی ہے جیسے اپنے مصارف میں استعمال کرنا، جبکہ قرآن و حدیث میں اس کے استعمال پر سخت وعیدیں موجود ہیں۔

”الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا أضعافاً مضاعفةً..... الخ“ (سورہ بقرہ: ۲۷۵)۔

”لعن رسول اللہ ﷺ اكل الربوا وموكله و كاتبه و شاهديه و قال هم

سواء“۔

۱۲- سود کی رقم کسی کو دیدینے سے انشورنس کا معاملہ جائز نہیں ہو سکتا، لیکن اگر کوئی شخص ناواقفیت میں یا بخيال حفاظت انشورنس کرا لے تو اس سے ملنے والی سودی رقم کو قومی رفاہ عام کے کاموں میں استعمال کر دے، علماء و فقہاء کا یہی فتویٰ ہے۔

انشورنس کی مروجہ شکل سے قمار اور ربوا کو نکال دیا جائے اور صحیح اسلامی اصول کی روشنی میں حاصل شدہ رقوم کو مضاربت کے مطابق تجارت پر لگا دیا جائے اور معینہ سود کی بجائے نفع کو تقسیم کیا جائے۔



## حاجت شدیدہ کے پیش نظر انشورنس کی اجازت

ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی (علی گڑھ)

انشورنس سے متعلق سنی سنائی یا سرسری بات جو ذہن کے گوشوں میں تھی وہ یہ کہ یہ از قسم قمار ہے، قدرت سے مقابلہ آرائی ہے، یہ تمام تر سود پر مبنی ہے، اس وجہ سے اس کے ذکر ہی سے حقارت، کراہت اور نفرت کے جذبات امنڈ پڑتے تھے۔ ”اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)“ کی طرف سے انشورنس سے متعلق سوالنامہ موصول ہونے پر اس کی حقیقت کو سمجھنے، اس پر اہل نظر علماء کی تحریروں کو پڑھنے اور غور و فکر کے بعد کوئی رائے قائم کرنے کی توفیق ہوئی۔ اس سلسلہ میں میں نے بارگاہ رب العزت میں برابر دعاء کی کہ درپیش مسئلہ میں صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق عطا کرے، جواب صواب کی طرف رہنمائی فرمائے اور اس پر دل جمعی عطا فرمائے۔ پھر بھی اس پر رائے زنی سے گھبراہٹ محسوس ہوئی، مگر اجتہادی غلطی پر بھی ایک ثواب کی بشارت سے ہمت ہوئی اور اس پر جو رائے بنی وہ پیش خدمت ہے۔

سوالنامہ کے ساتھ منسلک خط کے آخری میں ”مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ“ کے ایک فیصلہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا گیا ہے..... ”اسے ناجائز سمجھتے ہوئے فقہی ضرورت، یا حاجت شدیدہ کی بنیاد پر اس عمل کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟“

میرے خیال میں مسئلہ پر ۱۹۶۵ء میں چیدہ علماء عصر پہلے ہی حاجت شدیدہ کی وجہ سے عمل کی اجازت دے چکے ہیں، آج ۲۵ سال بعد نظر ثانی کی کوئی ضرورت نہیں محسوس ہوتی

بلکہ آج کے حالات پہلے سے بھی بدتر ہیں، اس لئے اب عمل کی اجازت بدرجہ اولیٰ ہوگی۔  
سوالنامہ کے صفحہ ۴ پر تیسرے پیراگراف میں یہ تحریر ہے: ”بیمہ زندگی ہو یا بیمہ  
املاک، یادوسری مروجہ صورتیں جو بیمہ کمپنی کے ذریعہ اختیار کی جاتی ہیں، تقریباً جملہ علماء امت اس  
کے ناجائز ہونے پر متفق نظر آتے ہیں اور اصولی طور پر اسے نادرست قرار دیتے ہیں“ یہ بیان محل  
نظر ہے۔ علماء کی معتد بہ تعداد بیمہ کو بالاطلاق ناجائز نہیں سمجھتی، بلکہ اچھی خاصی تعداد اصولی طور  
سے اسے صحیح سمجھتی ہے۔

صفحہ ۵ پر جو حالات و اسباب بیان ہوئے ہیں ان کے پیش نظر رقم کے خیال میں  
مسلمانوں کے لئے یہ جائز ہوگا کہ وہ اپنی زندگی، اپنی تجارت، اپنی صنعت، اپنے مکانات اور اپنی  
مساجد کا بیمہ کرائیں۔

صفحہ ۶ پر ”مجلس تحقیقات شرعیہ“ کی جو یہ رائے درج ہے کہ ”انشورنس کی سب  
شکلوں کے لئے ربا و قمار (سود اور جوا) لازم ہے“ اپنی بے مانگی و کم علمی کے باوجود رقم اس سے  
پوری طرح متفق نہیں ہے، بنیادی طور سے انشورنس اسلامی مصالح اور مقاصد شرع (الحفاظ  
على الدين والنفوس والعقل والمال والنسل وغيرها) کے عین مطابق ہے، اس کی روح  
تعاون ہے، اس کی کچھ مشابہت عاقلہ، قسامہ، عقد موالات، ولاء جیسے معاملات سے ہے، قمار کی  
حقیقت بیمہ سے بہت مختلف ہے۔ بیمہ کی سب شکلوں کے لئے ربا و قمار لازم نہیں ہے۔ ربا کا دخل  
موجودہ طریقہ کار کی وجہ سے ہے۔

صفحہ ۷ پر اس ذیل کے دوسرے سوال کہ پالیسی ہولڈر مرنے والے کے ورثہ کے لئے  
زائد رقم کا استعمال جائز ہوگا یا نہیں؟، میری رائے میں یہ زائد رقم ورثہ کے لئے تعاون کی رقم ہوئی  
جو دیگر معاونین (پالیسی ہولڈرس) کی رقوم سے سمجھنا چاہئے، نہ کہ سود۔

البتہ پالیسی ہولڈر کے زندہ رہنے اور مدت پوری کر لینے پر جمع کی ہوئی رقم جو واپس ملتی  
ہے، صرف اسی کو وہ اپنے استعمال میں لائے۔ بونس، منافع، یا سود کے نام پر جو رقم ملتی ہے اسے

رفاہ عام، مضطرب یا ملٹی کاموں کے لئے خرچ کر دے، کیونکہ بیمہ کی روح نقصان کی صورت میں تعاون و تلافی ہے، نہ کہ ایسا کاروبار جس میں ہر حال میں اضافہ ہو۔

اس طرح بیمہ شدہ جان و مال کی ہلاکت، یا ضیاع جو فسادات کے موقع پر ہو جائے اور پالیسی ہولڈر کو ضابطہ کے مطابق جو زائد رقم ملتی ہے اس کو تعاون کی رقم سمجھنا چاہئے اور اس سے استفادہ درست ہوگا۔

حوالہ ص ۸ : کمترین ان علماء کی رائے سے متفق نہیں ہے، جنہوں نے انشورنس کی اجازت تو دی ہے، مگر زائد رقم کو ناجائز لکھا ہے، میرے خیال میں اگر نقصان ہوا ہے تو زائد رقم کا استعمال کر سکتا ہے، کیونکہ وہ ازراہ تعاون حاصل ہوئی ہے جو بیمہ کا اصل مقصد ہے اور اگر نقصان نہیں ہوا اپنی جمع کردہ رقم سے زائد ملی تو زائد کو مثبت سمجھ کر مضطرب، رفاہ عامہ یا خالص ملٹی کاموں میں صرف کر دے، سرکاری ذرائع سے انشورنس اس رائے کو مزید تقویت دیتا ہے۔

رقم کے خیال میں جبری کے نتیجے میں ملنے والی رقم جبری P.F. سے زیادہ حلال ہے۔  
ذرائع نقل و حمل کے جبری بیمہ کے نتیجے میں نقصان ہونے پر جو ادا کردہ رقم سے زائد رقم ملتی ہے، وہ تعاون کی رقم متصور ہوگی جو بیمہ کی روح ہے۔ اس زائد رقم کا استعمال صحیح ہوگا۔  
اسی طرح نقل و حمل کا کام کرنے والی کمپنیاں جو اجرت سے زائد رقم لے کر بہ صورت ضیاع و نقصان ذمہ داری قبول کرتی ہیں۔ ان کمپنیوں سے نقصان کا معاوضہ لینا درست ہوگا۔



## انشورس کا حکم

☆ مولانا نیر ربانی ☆

سود کی حرمت قرآن و حدیث سے ثابت ہے جس کی قطعی دلیل قول باری تعالیٰ ہے:  
 ”أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا“ (سورۃ بقرہ: ۲۷۵) اور اس پر سخت وعیدیں بھی  
 وارد ہیں، جیسا کہ اللہ رب العزت نے فرمایا: ”فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ  
 وَرَسُولِهِ“ (سورۃ بقرہ: ۲۷۹)۔

زندگی کے بیمہ کے جواز کے لئے شرعی دلیل سمجھ میں نہیں آتی، البتہ جہاں تک مال  
 تجارت کے بیمہ کا مسئلہ ہے اس میں چوں کہ سودی کاروبار ہوتا ہے، اس لئے وہ ناجائز ہے، مگر  
 بعض محرمات بعض اضطراری حالات میں رخصت کے درجے میں آکر جائز ہو جاتے ہیں، جیسے  
 مہینہ کی حرمت قطعی ہونے کے باوجود اضطراری حالتوں میں جائز ہو جاتا ہے، ہمارے ملک کے  
 خطرناک حالات حاضرہ کے پیش نظر کہ جس میں ایک مال دار شخص ایک ہی رات میں فقیر اور  
 کنگال بن جاتا ہے اور ساتھ ساتھ ہر وقت جان و مال کے نقصان کا سخت خطرہ لاحق رہتا ہے جس  
 کی وجہ سے اس کے اہل و عیال کے لاچار اور شدید محتاج ہونے کا امکان ہے، ایسے بے شمار  
 واقعات ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

مذکورہ وجوہ سے فی زمانہ اگر کوئی اپنی دکان یا کارخانے کا بیمہ کراتا ہے تو جائز قرار دیا

جاسکتا ہے۔

☆ دارالعلوم سہیل الرشاد، بنگلور

اگر محقق علماء کرام کو اس رائے سے اتفاق نہ ہو تو دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ بیمہ کار اس شرط کے ساتھ بیمہ کرا سکتا ہے کہ وہ عہد کرے کہ بیمہ کی مدت ختم ہونے پر یا حادثے کی صورت میں بیمہ کمپنی سے صرف اپنی بیمہ کی رقم حاصل کرے، سود کی رقم نہ لے۔

رہا ”تعاون علی الاثم“ کا مسئلہ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ تعاون قصداً نہیں ضمنائاً ہے اور یہ جائز ہے، جیسا کہ مفتی اعظم حضرت مولانا محمد شفیع نے تحریر فرمایا ہے:

”جائز ہے صرف اتنی قباحت ہے کہ اس کے روپیہ سے سود و قمار کا معاملہ کرنے والوں کی کسی نہ کسی درجہ میں امداد ہوتی ہے، اگرچہ سبب بعید ہونے کے سبب اس کو حرام نہ کہا جائے گا، کیونکہ یہاں سود و قمار کا معاملہ کرنے والے دوسرے لوگ ہیں جن میں یہ شامل نہیں اور نہ اس کا روپیہ ان کے فعل حرام کے لئے خاص طور پر محرک اور داعی بنا ہے، ہاں غیر ارادی طور پر اس کے روپیہ سے ان کی امداد ہوگی، اس طرح کے تسبب للمعصیت کو حرام نہیں کہا جاسکتا، البتہ خلاف اولیٰ ضرور ہے جس کی تعبیر فقہاء کی اصطلاح میں مکروہ تنزیہی سے کی جاتی ہے“ (جواہر الفقہ ۱/۱۸۳)۔

نیز حضرت امام محمدؒ کے قول کے مطابق وہ حکم جو قصداً ثابت نہیں ہوتا، مگر ضمنائاً ثابت ہوتا ہو جائز ہے۔



## بیمہ پالیسی میں شرکت

مفتی شمس الدین (دہلی)

مجلس تحقیقات شرعیہ اپنے اجتماع (منعقدہ ۱۵/۱۶ دسمبر ۱۹۶۵ء) میں انشورنس کے سلسلے میں جس نتیجے پر پہنچی تھی اس کی تعلیل و توجیہ کی تمام تفصیلات میں الجھے بغیر فی الجملہ اس سے اتفاق ہے۔

اس موضوع سے متعین دیگر سوالات کے بارے میں میرا نقطہ نظر درج ذیل ہے:

ملت اسلامیہ ہند جن ناگفتہ بہ حالات سے دوچار ہے اور جس طرح ان کی جان و مال کو خطرات درپیش ہیں، انشورنس کے ذریعہ ان نقصانات کی تلافی اگر کسی درجہ میں بھی ہو جائے تو میرے نزدیک یہ جائز ”ضرورہ“ کے دائرہ میں داخل ہے، اس بنا پر انشورنس جس کی قباحتیں معلوم و معروف ہیں، ان سے صرف نظر کرتے ہوئے ”المضرورات تبیح المظورات“ کے تحت جائز قرار دیا جانا چاہئے۔

بیمہ جہاں ایک نفع بخش کاروبار ہے، وہیں اس دور میں ایک طرح سے تائینات اجتماعیہ (SOCIAL INSURANCE) کا مقام بھی رکھتا ہے، مسلمانان ہند بالخصوص جس (SET UP) میں جس صورت حال سے دوچار ہیں اور جو اسباب و عوامل ان پر اثر انداز ہو رہے ہیں ان کو مد نظر رکھتے ہوئے معتبر مصالحوں (دفع شرکاء فی اجتماعی وغیرہ) کے متوقع حصول کی بنا پر اس سے استفادہ کرنا جائز کہا جاسکتا ہے، صورت حال ایسی ہے کہ اچانک فسادات کا بازار

گرم ہو جاتا ہے، دیکھتے ہی دیکھتے جان، مال، مکان اور دکان، غرض ہر چیز جس پر انسانی زندگی قائم رہتی ہے، تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

مسلمان جو پہلے ہی سے امتیاز کا شکار ہیں، جن کی اکثریت خطِ افلاس سے نیچے ہے، چشمِ زدن میں بے خانما و برباد ہو جاتے ہیں، بچے یتیم اور خواتین بیوہ ہو جاتی ہیں، اگر جانیں کسی طرح بچ بھی جائیں تو کاروبار کی تباہی نانِ شبینہ کا محتاج بنا دیتی ہے، اس صورت حال میں انشورنس کے ذریعہ ایک گونہ خسارہ کی تلافی ہو سکتی ہے جو گرچہ بہت حقیر درجہ میں ہوگی، پھر بھی اشکِ شوئی کا ذریعہ بن سکتی ہے، اسی طرح حکومت پر جب مالی دباؤ بہ صورتِ معاوضہ قابلِ لحاظ حد تک بڑھ جائے گا تو ہو سکتا ہے اس کے ازالہ کی طرف سنجیدگی سے غور کرے اور مؤثر تدابیر اختیار کی جائیں۔

لہذا میرے نزدیک انشورنس کے ذریعہ استفادہ کی اجازت دینا شرعاً جائز ہونا چاہئے۔ انشورنس کا پالیسی ہولڈر مدت مقررہ پوری ہونے سے قبل اگر فوت ہو جائے تو بیمہ کمپنی کے پاس اس کی جمع کی ہوئی رقم سے زائد (یعنی پالیسی کے مطابق پوری رقم) اس کے ورثاء کے لئے لینا جائز ہوگا۔

مدت پوری ہو جانے پر جمع شدہ رقم کے ساتھ جو اضافی رقم ملتی ہے وہ بظاہر سود ہی ہے اور اس پر بینک سے ملنے والے سود کا حکم نافذ ہونا چاہئے، البتہ اگر معاہدہ (AGREEMENT) میں یہ صراحت، یا مفاہمت (UNDERSTANDING) ہو جائے کہ پالیسی ہولڈر جتنی رقم از روئے پالیسی جمع کرنے کا مکلف ہے اسی کے ساتھ ایک متعین رقم کمپنی بھی اپنی طرف سے اس کے حساب میں جمع کرے گی (جس طرح پراویڈنٹ فنڈ میں حکومت جمع کرتی ہے) اور پالیسی (MATURE) ہو جانے کے بعد دونوں رقمیں پالیسی ہولڈر کو مل جائیں گی، تو پھر اس میں قباحت نہیں محسوس ہوتی۔

فسادات کے مقابلہ میں انشورنس کا پالیسی ہولڈر اگر ہلاک ہو جاتا ہے اور اس کے

ورثاء کو جمع کی ہوئی رقم سے زائد رقم حسب ضابطہ دی جاتی ہے تو اسے لینا جائز ہوگا، جواز کی دلیل اوپر گزر چکی ہے۔

”جبری انشورنس“ کے نتیجہ میں زائد ملنے والی رقم کا حکم P.F. والی شکل پر قیاس کرتے ہوئے جائز سمجھنا چاہئے۔

گاڑیوں کے ”جبری انشورنس“ کی صورت میں اپنی جمع کی ہوئی رقم سے زائد ملنے والا معاوضہ جائز ہی کہا جائے گا، اس لئے کہ حادثہ میں پہنچنے والے نقصان کی تلافی کے لئے ہی گاڑیاں انشورڈ کرائی جاتی ہیں اور یہ ایک طرح سے تکافل اجتماعی کا ذریعہ ہے، ورنہ حادثہ کا شکار انسان تو بالکل ہی لٹ جائے گا۔

یہی حکم حمل و نقل کرنے والی کمپنیوں کے انشورنس کا ہے، کمپنی جو رقم لیتی ہے اس میں یہ پہلو بھی مضمحل ہوتا ہے کہ نقصان یا حادثہ کی صورت میں وہ اس کے ذریعہ تلافی کر سکے گی، ورنہ ظاہر ہے کوئی گھر سے کیوں کسی کو رقم دے گا۔

## انشورنس کا حکم

مفتی اشفاق احمد اعظمی (اعظم گڑھ)

انشورنس کی اصل گو کہ تعاون باہمی پر ہے، تاہم موجودہ انشورنس اس وقت سودی تجارتی کاروبار ہے، جس میں قمار و ربا کی مبینہ آمیزش کے سبب قطعی حرام ہے، اس کی حلت کی کوئی گنجائش نہیں، بلکہ انشورنس کے تقاضا اصل حل اس کا متبادل حل کا وجود ہے جس کو مضاربت و شرکت کے اصولوں پر مبنی اسکیم کا وجود میں لانا ہے۔

جس کی وضاحت و تفصیل ”جواہر الفقہ“ میں مفتی محمد شفیع نے فرمائی ہے۔

تاہم حرمت کو تسلیم کرتے ہوئے ضرورت کی بنیاد پر اموال کے بیمہ کی اجازت بہ ضرورت شدیدہ، بایں شرط دی جاسکتی ہے کہ اس سے مقصود، حفاظت و صیانت ہو، زائد رقم کا حصول نہ ہو، بہ صورت ہلاکت و ضیاع معاوضہ مال مہلو کہ کے علاوہ کسی بھی صورت میں زائد رقم نہ لی جائے، بلکہ اس کو واجب التصدق سمجھ کر صدقہ کیا جائے، اس لئے اس کو رائے مہتملی بہ کے حوالہ کی جائے۔

مگر جان کے بیمہ میں چونکہ صیانت و حفاظت کا حقیقتاً تصور نہیں پایا جاتا ہے، اس لئے اس کی اجازت مناسب نہیں، اس لئے کہ فسادات میں ہلاک ہونے والا اکثریتی طبقہ غرباء و مساکین کا ہوتا ہے جن کے پاس بیمہ کی رقم کی ادائیگی کی صلاحیت و اہلیت نہیں ہوتی، نیز مالداروں کے لئے صرف حکومت کی ذمہ داری قرار دینا عدل کے خلاف ہے اور حکومت کی ذمہ داری کو حق واجب قرار دینا بھی محل غور ہے، دیت بنا کر جائز قرار دینا بھی درست نہیں، بہ صورت طبعی، یا ہنگامی بہر صورت واجب ہو، ایسا بھی نہیں ہے۔

لہذا اگر جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری کے احساس و تدارک کے پیش نظر جواز کے پہلو پر غور کیا جا رہا ہے تو پھر غرباء و مساکین جن کی اکثریت ہے ان کے تحفظ کا جواز کیوں کر حل ہوگا، بیمہ زندگی میں اگر صبر و اضطراب کی صورت پیش آجائے تو انفرادی حیثیت سے رائے مبتلی بہ کی صوابدید پر موقوف رکھا جائے، عمومی اجازت سے احتراز کیا جائے۔

نیز بیمہ کی رقم کی صورت میں جمع کی جانے والی رقموں کو مضاربت و شرکت کے اصولوں پر قائم شدہ باہمی تعاون اسکیموں کو وجود میں لانے پر زور دیا جائے، تاکہ بیمہ بہ صورت عدم نقصان ضائع ہونے والی رقموں کو ضائع ہونے سے بچایا جائے اور تعمیری و تعاونی امور میں صرف کیا جائے۔

نیز ”عاقلہ“ جیسی جائز باہمی تعاون کی شکلوں کو صنعت و حرفت کی بنیاد پر قائم کرنے کی تحریک پر زور دیا جائے اور انشورنس کے تقاضوں کا متبادل حل پیش کیا جاسکے۔

### انشورنس کا شرعی حکم اور اس پر غور و خوض:

”انشورنس“ حقیقت کے اعتبار سے ربا و قمار کا مجموعہ ہے جو منصوص طور پر حرام ہے، جس کی حرمت پر جمہور امت کا اتفاق ہے، اس کی مروجہ دو شکل ہوتی ہے، ایک جان سے متعلق ہوتا ہے، دوسرا مال سے متعلق ہوتا ہے، مال سے متعلق انشورنس کے لئے ملکی اعتبار سے قانونی مجبوریات ہوتی ہیں، اور بہت سے معاملات میں قانونی طور پر انشورنس لازمی ہے، اس لئے حالات و قانون کے اعتبار سے انشورنس کی حرمت کو بھرپور ملحوظ رکھتے ہوئے، بقدر ضرورت بوقت ضرورت دفع مضرت کے لئے پالیسی کو اپنایا جاسکتا ہے، علماء کرام نے اس کی اجازت دی ہے، تاہم حرمت کا پاس و لحاظ اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ علماء حق سے مشورہ کے بعد ان کی ہدایات کے مطابق پالیسی کو اپنایا جائے تاکہ اس کی شناعیت و قباحت کا شعور ہمہ آں بیدار رہ سکے۔

دوسرا جان سے متعلق انشورنس ہے: جسے لائف انشورنس (جیون بیمہ) کہتے ہیں، کسی

بھی ملک میں قانونی طور پر اس طرح کی کوئی مجبوری اب تک میرے علم کے مطابق نہیں آتی ہے جس کی وجہ سے اس کی حرمت کو اجازت کی صورت دینے کا اقدام علماء کرام نے کیا ہے، گو کہ فقہاء کرام کے مسلمہ اصول کے مطابق اضطرار کی صورت میں ہر حرام چیز کا استعمال بہ قدر ضرورت جائز ہو جاتا ہے، تاہم اضطرار کی عملی شکل ”جیون بیمہ“ کے سلسلہ میں کہیں وجود میں نہیں آئی۔

اس لئے ہندوستان میں فسادات کے موقع پر جانی و مالی نقصانات کو سامنے رکھ کر اس سے بچاؤ اور تدارک کو شرعی ضرورت یا حاجت قرار دینا، عمومی اعتبار سے لائف انشورس کی حرمت کی اہمیت کو ختم کرنا اور ربا و قمار کے دروازہ کو کھولنے کے مترادف ہے۔

اس سلسلہ میں غور و خوض کے وقت مندرجہ ذیل امور پر نگاہ رکھنا ہے اور ان کا حل تلاش

کرنا ضروری ہے:

۱- فسادات کے عمومی امکان کو ضرورت کا درجہ دیا جائے یا فساد زدہ علاقہ کے لئے اس ضرورت کو مخصوص و محدود قرار دیا جائے، اور فساد زدہ علاقہ میں رہنے و بسنے والوں کے لئے گنجائش فراہم کی جائے؟

۲- پالیسی کے اپنانے کی صورت میں جان و مال کے تحفظ کی گارنٹی کیونکر فراہم ہوگی۔ کیا اس گارنٹی کی شرعی کوئی حیثیت لائق اعتبار بن سکے گی؟

۳- پالیسی اپنانے کے بعد وہ زائد رقم جو ربا کی صورت میں پالیسی اپنانے والے یا اس کے ورثہ کو ملے گی اس کی حیثیت کیا ہوگی، اس کا مصرف کیا ہوگا، کیا محض پالیسی کا اپنالینا، ضرورت کو پورا کر دے گا اور جان و مال کے تحفظ کی گارنٹی فراہم کر دے گا یا پالیسی کا اپنانا کافی نہیں ہوگا، بلکہ مقصود وہ زائد رقم ہوگی جو پالیسی اپنانے والے یا ورثہ کو ملے گی، اگر حقیقت یہ نکلی تو اس کو ”ضرورت“ کے کس درجہ میں رکھا جائے، اور اس سے مال کے تحفظ و تدارک کی بات تو کسی حد تک سمجھ میں آتی ہے۔ جان کے تحفظ و تدارک کی ضرورت کی تکمیل کیونکر ہوگی؟



۴- کیا ایسا ممکن ہے کہ ابتداءً جان کے بیمہ پالیسی اپنانا مقصود قرار دیا جائے اور انتہاءً زائد رقم کا حصول حکومت کی طرف سے جان کا ضمان قرار دیا جائے، اگر ایسا ممکن ہے تو پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ حکومت پر یہ ذمہ داری ڈالنا شرعی طور پر کس حد تک درست ہوگا، اور ہلاک ہونے والا ہر ایک اس کا مستحق قرار دیا جائے گا، یا اس میں تخصیص کی جائے گی، اگر تخصیص کی جاتی ہے تو شرعی طور پر اس کی کیا بنیاد ہوگی؟

۵- اگر شرعی طور پر اجازت ممکن ہو سکی تو کیا رائے مہتممی بہ کا مطلق اعتبار مسئلہ کی نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے کافی ہوگا اور وہ عوامی رائے جو بغیر کسی شرعی پرواہ کے منکرات کے اختیار پر بہ کثرت پائی جاتی ہے، اس پر انحصار کس حد تک درست ہوگا، اور اگر ایسا کرنا ایک حرام چیز کے اختیار میں علماء کی طرف سے مداخلت کے مترادف ہو سکتا ہے تو اس پر عمل درآمد کے لئے کیا لائحہ عمل مفید ہوگا، اس کی واضح شکل سامنے رکھی جائے؟۔



## تحریری آراء:

(۱)

محترم المقام زادت مکارمکم! وعلیکم السلام ورحمة الله وبرکاته  
جواباً عرض ہے کہ انشورنس، خواہ لائف انشورنس ہو یا محض املاکی ہو، فی ذاتہ قمار و ربوا،  
یا محض ربوا پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ممنوع و حرام ہے، لیکن فی زمانہ موجودہ حالات ملکی میں فقہی  
ضرورت و حاجت شدیدہ کی بنیاد پر اس عمل کی اجازت دے دینا درست ہو سکتی ہے، اور یہ املاک  
موقوفہ ہو، یا مملوکہ یا مساجد ہوں سب کے بارے میں احقر کے نزدیک یہی حکم ہے۔ فقط

العبد نظام الدین  
(صدر مفتی دارالعلوم دیوبند)

(۲)

ہندوستان کے موجودہ خاص حالات کے پیش نظر جوابات درج ذیل ہیں:

- ۱- مسلمانوں کو اپنی جان و مال و اعضاء کا انشورنس کرانا درست ہے۔
- ۲- مدت پوری ہونے کے بعد، یا مدت پوری ہونے سے قبل دونوں قسم کی زائد رقم کا لینا اور اپنے مصرف میں لانا درست ہے۔
- ۳- انشورنس کمپنی جمع کردہ رقم پر انٹرسٹ دیتی ہے، چاہے اس سے نقصان کی تلافی ہو یا نہ ہو، اس لئے اس زائد رقم کو جان و مال کی تلافی قرار دینا کسی طرح درست نہیں، رہ گیا اس کے لینے کا سوال تو اس کا لینا اور تصرف میں لانا بھی درست ہے۔

۴- الف: ”جبری انشورنس“ کے نتیجے میں حاصل ہونے والی زائد رقم کو پراویڈنٹ فنڈ پر قیاس کرنا صحیح نہیں کہ پراویڈنٹ فنڈ میں تنخواہ کی جتنی رقم جمع ہوتی ہے اتنا ہی حکومت دیتی ہے، علماء کا اتفاق جو اس رقم پر ہے، پھر اس مجموعی رقم پر حکومت انٹرسٹ دیتی ہے، اس انٹرسٹ والی رقم کا جواز مختلف فیہ ہے۔ انشورنس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی رقم انٹرسٹ ہے، ہندوستان کے موجودہ حالات کے پیش نظر انشورنس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی رقم اور پراویڈنٹ فنڈ کی مجموعی رقم پر حاصل ہونے والی زائد رقم کا لینا درست ہے۔

ب- ادا کردہ رقم سے زائد لینا درست ہے۔

۵- اس صورت میں کمپنیاں چونکہ خود انشورنس کرتی ہیں اور اجرت نقل و حمل سے زیادہ رقم لے کر اس مال کی ضمان لیتی ہیں کہ ضیاع و نقصان کے ہم ذمہ دار ہیں تو کمپنیوں سے ضیاع و نقصان دونوں کا معاوضہ لیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ نقصان معتد بہ ہو، معمولی نقصان جو تاجروں کی نظر میں قابل مسامحت ہوتا ہے اس کا اعتبار نہیں، کمپنی مسلم کی ہو یا غیر مسلم کی دونوں کا حکم ایک ہے۔

”إن المودع إذا أخذ أجره على الوديعة يضمنها إذا هلكت“  
(رد المحتار ۳/۲۷۳ فصل فی استیمان اکافر)۔

الجواب صحیح	محمد تقی قاسمی کان اللہ
محمد حبیب الرحمن غفرلہ	(صدر مفتی دارالعلوم حیدرآباد)
(دارالعلوم حیدرآباد)	۱۳ محرم ۱۴۱۲ھ

(۳)

انشورنس موجودہ زمانہ میں ضرورت کے درجہ میں داخل ہونے کی وجہ سے جائز ہے۔

”الضرورات تبيح المحظورات“ کے تحت اجازت دے دی جائے۔

حبیب اللہ قاسمی

مدرسہ ریاض العلوم، گورنمنٹی، جوہنپور

حضرات فقہاء کرام نے ”تعلیق أسباب الملک بالخطر ای ما دار بین الوجود والعدم“ سے قمار شرعی کی تحدید فرمائی ہے، پس اس کلیہ کے تحت انشورنس رائج، گو قمار میں داخل ہے، لیکن جن حاجیات خمس پر سارے شرائع اور احکام دائر ہیں ان میں جان و مال کی حفاظت بھی داخل ہے، مزید برآں ”الضرورات تبيح المحظورات“ کے ساتھ ساتھ اس ملک کے دار الحرب ہونے کا فیصلہ چونکہ جمہور علماء فرما چکے ہیں، اس وجہ سے معاملہ اور بھی سہل معلوم ہوتا ہے ان وجوہ سے حضرت مفتی حبیب اللہ صاحب زاد مجرہ یا علماء ندوہ نے جو کچھ لکھا ہے تابقاء ضرورت اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

محمد حنیف غفرلہ

انشورنس فی نفسہ حرام ہے، کیونکہ اس میں ربوا و قمار دونوں ہوتا ہے، البتہ ضرورت کی بنا پر ”الضرورات تبيح المحظورات“ کے قاعدہ سے گنجائش نکل سکتی ہے۔  
بندہ عبدالحلیم عفی عنہ

(۴)

غیر مسلم دشمن مسلمانوں کا محاصرہ کر لے اور مال دینے کے لئے مصالحت کر لے تو مسلمانوں کا امام مال نہ دے، کیونکہ دیت کا دینا ذلت ہے، ہاں اس وقت دے سکتے ہیں جبکہ اپنی اور مسلمانوں کی جان کی ہلاکت کا خوف ہو، اس صورت میں مال دے کر ہلاکت کو دور کرنا واجب ہے کسی بھی طریقہ سے ہو، جیسا کہ (کتاب السیر ہدایہ ۵۴۴) میں ہے:  
”ولو حاصر العدو المسلمین وطلبوا الموائعة (المصالحة) علی مال يدفعه المسلمون إليهم لا يفعل الإمام مما فيه إعطاء الدية إلحاق المذلة بأهل الإسلام إلا إذا خاف الهلاك لأن دفع الهلاك واجب بأيّ طريق يمكن“ (رد المحتار ۳/۲۷۳)۔

”باقی طریق“ سے واضح ہے کہ انشورنس جانی و مالی کر کے حفاظت کرنا واجب ہے۔ ہاں مسلمانوں کی حکومت میں ان کے لئے انشورنس بالکل جائز نہیں، دارالحرب میں جائز ہے۔ ہندوستان کے دارالحرب ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ حضرت علامہ شیخ الحدیث شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے اپنے ”فتاویٰ عزیز“ میں لکھا ہے:

”چونکہ کفر بے دغدغہ غالب و امان سابق نہ ماند آں دارالحرب است آں جا ریو انیست“

جس ملک میں کفر کا غلبہ غالب ہو گیا مسلمانوں کے لئے پہلے کی طرح امن نہ رہا یہ ملک دارالحرب ہے۔ اس ملک میں رہو انہیں، غیر مسلم کو رقم دے کر نفع لے سکتے ہیں، حضرت کے فتویٰ سے ہندوستان کا دارالحرب ہونا ثابت ہوتا ہے، دارالحرب میں انشورنس کر کے جان و مال کی حفاظت جس طریقہ سے بھی ہو ضروری ہے، سخت مجبوری کی صورت میں۔

عبدالوہاب عفا اللہ عنہ  
مدرسہ الباقیات الصالحات ویلور

(۵)

بیمہ کسی بھی صورت میں کسی بھی چیز کا جائز نہیں، موجودہ جتنی صورتیں ہیں وہ سب کی سب قمار، ربا، سود کے دائرہ میں آتی ہیں، اسلامی حکومت ہوتی تو شاید اس کی نوعیتوں میں ترمیم کر کے وجہ جواز پیدا کیا جاسکتا تھا۔

لیکن ہمارے ملک کے جیسے کچھ حالات ہیں ادھر دو تین ماہ سے ملک کا جو حال ہوا ہے اس کو مد نظر رکھتے ہوئے دکانوں، مکانوں، فیکٹریوں وغیرہ کا انشورنس بدرجہ مجبوری پوری کراہت کے ساتھ کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے، لیکن زندگی کا بیمہ کسی بھی قیمت پر صحیح نہیں۔

خلیل الرحمن اعظمی  
جامعہ دارالسلام عمر آباد

(۶)

آپ کا ارسال کردہ لفافہ ملا، عاجز ”یک پیری و صد عیب“ کے دور میں ہے، اور اب مسائل میں تحقیقات کرنے سے معذور ہے، دعا کرتا ہے کہ حضرات علماء کرام اس مسئلہ کا کوئی حل نکالیں، یہ ایک ابتلائے عام ہے، ہمارے ہندوستان میں مسلمانوں کی جاندا قطعاً محفوظ نہیں ہے، حضرت امام عالی مقام ابوحنیفہؒ کے اصول میں سے ایک اصل ”عُرف“ ہے۔ بیمہ کرانے کا رواج تمام عام میں ہو گیا ہے، اگر اس سلسلہ میں حضرات علمائے کرام کوئی راہ نکالیں اور عوام کو حرام قطعی کے دائرہ سے نکال کر مکروہات کے دائرہ میں لے آویں مستوجب صدمسرت ہے۔

مرداں باشد کہ گیر دست دوست در پریشاں حالی و در ماندگی

زید ابوالحسن فاروقی، درگاہ حضرت شاہ ابوالخیر دہلی

(۷)

- ۱- ”مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ“ دسمبر ۱۹۶۵ء کا انشورس کے مسئلہ پر جو فیصلہ ہے اس فیصلہ سے ہم پورا اتفاق کرتے ہیں۔
- ۲- ہندوستان کے موجودہ حالات میں جبکہ مسلمانوں کے جان و مال محفوظ نہیں ہیں اور ہر وقت جان، مال، تجارت، صنعت، مکانات، مساجد و مدارس وغیرہ خطرہ میں ہیں، تو جن شہروں و قصبوں و علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں یا ہونے کا قوی خطرہ رہتا ہے، وہاں پر فقہی ضرورت، یا حاجت بمنزلہ ضرورت کے ضمن میں یقیناً داخل ہے، نیز وہاں پر ضرورت کے پیش نظر انشورس کرانے کی اجازت دی جائے۔

۳- بیمہ کرانے کی جائز صورت میں اگر پالیسی ہولڈر مدت پوری ہونے سے پہلے انتقال کر جائے تو بیمہ کمپنی ادا کی ہوئی اقساط سے جو زائد انشورنس کی رقم ادا کرتی ہے اس زائد رقم کا استعمال مرحوم کے وارثین کے لئے جائز نہیں ہے۔

۴- بیمہ شدہ جان کی ہلاکت فسادات کی صورت میں ہو جائے اور انشورنس کمپنی پالیسی ہولڈر کی طرف سے ادا کی ہوئی رقم سے جو زائد رقم مستحقین اور متاثرین کو ضابطہ کے مطابق ادا کرتی ہے اس زائد رقم کو جان کا معاوضہ تصور کر کے استفادہ درست نہیں ہے، بلکہ اس زائد رقم کو لے کر غرباء مساکین کو بلا نیت ثواب دے دی جائے۔

۵- بیمہ شدہ مال کی ہلاکت فسادات کی صورت میں ہو جائے اور ادا کی ہوئی رقم سے زائد رقم وصول ہو تو اس زائد رقم میں سے بقدر نقصان مال کا معاوضہ تصور کر کے استفادہ کی اجازت ہوگی۔

۶- انشورنس کمپنی جو نیشنلائزڈ ہے۔ متاثرین شہریوں کو ان کی جمع کی ہوئی رقم سے زائد رقم دیتی ہے اس زائد رقم میں سے بقدر نقصان تلافی قرار دے سکتے ہیں۔

۷- جبری انشورنس کی صورت میں حاصل ہونے والی زائد رقم غرباء مساکین کو دے دی جائے، لیکن اگر جبری بیمہ شدہ مال کا ضیاع فسادات کی صورت میں ہوا ہے تو زائد رقم میں سے بقدر نقصان معاوضہ مال قرار دے کر استعمال کر سکتے ہیں۔

۸- انشورنس میں ملنے والی زائد رقم کو پراویڈنٹ فنڈ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ انشورنس کمپنی میں ہم اپنی ملکیت میں سے رقم جمع کرواتے ہیں اور پراویڈنٹ فنڈ میں جو رقم کٹتی ہے وہ ہماری ملکیت میں آنے سے پہلے، لہذا ان میں سے ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کر سکتے ہیں۔

۹- کار وغیرہ، نیز تجارتی سامان کے ”جبری انشورنس“ میں اگر مذکورہ اشیاء کی ہلاکت آسمانی آفت یا حادثہ کی صورت میں ہو تو ادا کردہ سے ملنے والی زائد رقم غرباء مساکین کو بلا ثواب کی نیت کے دے دی جائے اور اگر مذکورہ اشیاء کی ہلاکت فسادات کی صورت میں ہو تو زائد رقم میں سے بقدر نقصان معاوضہ استعمال کر سکتے ہیں۔

۱۰- حمل و نقل کا کام انجام دینے والی کمپنیاں جو خود متعلقہ سامان کا انشورنس کرتی ہیں اور

اجرت سے زائد رقم لے کر یہ معاملہ کرتی ہیں ان کمپنیوں کے انشورنس میں مال کا ضیاع اور نقصان اگر کمپنیوں کی لاپرواہی اور عدم توجہ یا ان کے افعال سے ہے تو ان سے معاوضہ جائز ہے۔

الجوابات صحیحہ

کتبہ عبدالرحمن قاسمی غنی عنہ

محمد عثمان قاسمی (معین مفتی)

خادم دارالافتاء دارالعلوم چھاپنی

۹/ جمادی الثانی ۱۴۱۱ھ، ۲۷/ دسمبر ۱۹۹۰

قد اصاب من اجاب والحبیب مصیب

محمد عمران غفرلہ۔ معین مفتی دارالافتاء، دارالعلوم چھاپنی۔

### (۸)

مسئلہ انشورنس کے متعلق فی زمانہ مجھنا چیز کی یہ رائے ہے کہ اس وقت ملکی حالات اس قدر پیچیدہ و پُرخطر ہیں کہ انسان خصوصاً مسلم فرقہ کا جان و مال غیر محفوظ ہیں، دوسرے لفظوں میں وہ اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے اضطراری طور سے ایسی اشیاء و اسباب کا محتاج ہے جو شرعاً ناجائز ہیں، اس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں ہے جیسے اکل مہینہ و شرب خمر وغیرہ مضطر کے حق میں، لہذا فی زمانہ ہندی مسلمان خصوصاً اسی دور سے گزر رہا ہے، اس لئے بدرجہ اضطرار انشورنس کی اجازت دی جانی چاہئے۔

مولانا عبید الرحمن اعظمی (برہانپور، ایم۔ پی)

### (۹)

بیمہ (انشورنس) زیر بحث مسئلہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے، بیمہ کی تین صورتیں

ہیں:

۱- الف: بیمہ زندگی، (ب) مختلف اعضاء کا بیمہ، ۲- املاک کا بیمہ۔



۳- الف: ذرائع نقل و حمل کا بیمہ، (ب) سمندری و ہوائی نقل و حمل کا بیمہ۔  
میرے نزدیک تمام صورتوں میں مبتلا بہ کو مستند عالم کا پابند کرتے ہوئے (جو ابتلاء کی تشخیص کر سکے اور جواز اور عدم جواز کا فیصلہ کرے) چند شرائط کے ساتھ اجازت دی جانی چاہئے۔  
۱- بیمہ زندگی کی بہ کراہت اجازت دی جانی چاہئے۔ قصاص و دیت کے مسئلہ کو سامنے رکھتے ہوئے چونکہ حکومت وقت ذمہ دار ہے اور مسلمانوں کے جان و مال کی جانب سے لاپرواہی و غفلت جانب دارانہ و مجرمانہ ہے اور جبکہ عوض کی ادائیگی حکومت کو ہی کرنی ہے اس اعتبار سے بیمہ زندگی میرے نزدیک بہ کراہت درست ہے۔

۲- املاک کا بیمہ اس کی بلا کراہت اجازت دی جانی چاہئے۔

۳- بیمہ ذرائع نقل و حمل وغیرہ کی بدرجہ اولیٰ اجازت دی جانی چاہئے۔

نوٹ: ہمارے قابل احترام بزرگان دین نے ہندوستان کے ۱۹۶۵ء کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے جو فیصلہ کیا تھا آج کے ہندوستان کے موجودہ حالات نے ان تمام خطرات کو یقینی بنا دیا ہے جس میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا ہے۔

اس کے باوجود بیمہ کی اجازت حالات کے بہتر ہونے کی صورت میں علماء کے مشورے سے منسوخ ہوگی، زائد ملنے والی رقم کے استعمال کی بھی اجازت دی جانی چاہئے، اس لئے کہ نقصان کی تلافی کرنے والا نہ کوئی فرد ہے اور نہ جماعت، بلکہ حکومت وقت جو خود اپنی رعایا کی جان و مال کی محافظ ہے۔

مفتی رحمت اللہ قاسمی

نائب قاضی شریعت دارالقضاء، برہانپور۔ ایم۔ پی

مفتی محمد علی قاضی شریعت

دارالقضاء برہان پور۔ ایم۔ پی

چونکہ ہمارے ملک ہندوستان کے موجودہ حالات خصوصیت سے مسلمانوں کے لئے

تباہ کن اور خطرناک ہیں۔ معاشی اور اقتصادی اعتبار سے مسلمانوں کو کمزور کر کے ان کے املاک و جائیداد کو نقصان پہنچانا آج کل غیر مسلموں کا بنیادی مقصد رکھتا ہے۔ جہاں جہاں بھی فسادات برپا ہوئے وہاں سب سے پہلے مسلمانوں کی املاک نقصان پذیر ہوتی ہیں۔ پھر جان و عزت کی نوبت آتی ہے۔ آئندہ بھی غیر مسلم اقوام کے یہی منصوبے ہیں، اندریں صورت میں مسلمانوں کی معاشی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جائے گی، لہذا انشورنس برائے املاک کی اجازت ہونی چاہئے۔

ایک حیثیت سے ہندوستان دارالحرب کا درجہ رکھتا ہے۔ انشورنس پر جو زائد رقم ہوگی اباحت کے ساتھ جائز ہوگی، غیر مسلم کا مال بہر حال اباحت کا درجہ ضرور رکھتا ہے، جہاں تک بیمہ زندگی کا تعلق ہے اس کے لئے بعض مخصوص قیودات کے ساتھ اس کی بھی اجازت ملنی چاہئے، ایسے سوالات بھی موصول ہوئے، اگر کوئی عورت جس کا شوہر انتقال کر چکا ہے اور اس کو روزی کا انتظام نہیں ہے، کیا ایسی عورت عدت کے ایام میں گھر سے باہر نکل سکتی ہے، یا نہیں؟ مثلاً ایک آدمی غربت زدہ ہے، اس کی بیوی بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا سوائے شوہر کے اور کوئی نہ ہو، دست کاری سے بھی نابلد ہو۔ جماعت مسلمین بھی اسکی کفالت کا بوجھ برداشت نہ کر سکتی ہو تو بیوی بچوں کا یہ ظاہر کوئی پرسان حال نہ ہو تو اس انسان کی غیر فطری موت پر اس کے پس ماندگان کو اتنی رقم ملنی چاہئے کہ وہ باعزت اپنی زندگی کی کفالت کر سکیں، ان مخصوص حالات میں احقر کی رائے ہے کہ بیمہ زندگی کی اجازت ملنی چاہئے۔ یہی اسکے حق میں بہتر ہوگا۔

محمد نسیم عفی عنہ۔ اشرف العلوم، میسور

(۱۱)

انشورنس (بیمہ) کے متعلق معلومات کرنے کے بعد درج ذیل تفصیلات سمجھ میں آتی

ہیں:

### ۱- ہندوستان کے مخصوص حالات میں بیمہ:

مسلمانوں کا اپنے جان و مال کی حفاظت کے لئے ایک مناسب تدبیر کے طور پر ہندوستان کے موجودہ حالات میں بیمہ کرا لینا جائز و درست معلوم ہوتا ہے، اس سلسلہ میں اکابر اہل علم (مفتی عبدالرحیم صاحب و مفتی محمود صاحب وغیرہ) نے اس قسم کے حالات میں جان و مال کا بیمہ کرا نے کی اجازت دی ہے۔

### ۲- خاص حالات میں کرائے گئے بیمے پر ملنے والی رقم کا مسئلہ:

اوپر جو بیمے کا جواز ذکر کیا گیا ہے ایسے بیموں میں اگر فساد کی وجہ سے جان یا مال کا ضیاع ہو تو کمپنی کی طرف سے ملنے والی رقم کا لینا اور انفرادی و اجتماعی طور پر استعمال میں لانا درست ہے، جس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ فسادات میں ہونے والے نقصانات میں انتظامیہ کی لاپرواہی کا دخل ضرور ہوتا ہے جبکہ حکومت وقت کی ذمہ داری ہے، اور کمپنی سے جو رقم ملتی ہے وہ رقم دراصل حکومت ہی دیتی ہے تو گویا ان حالات کے پیش نظر حکومت اپنی غفلت کا ضمان دتا وان دیتی ہے، جس کے لینے میں کوئی کراہت سمجھ میں نہیں آتی۔

### ۳- جبری بیمہ زندگی:

اگر لائف انشورنس کی کوئی جبری صورت پائی جائے تو جمع کئے ہوئے رقم پر ملنے والی زائد رقم کا لینا جائز معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ اس میں اور پراویڈنٹ فنڈ کی زائد رقم کے درمیان کوئی فرق سمجھ میں آتا، جبکہ اس کو ہمارے اکابر علماء نے بالاتفاق جائز قرار دیا ہے۔  
البتہ املاک کے جبری بیمہ میں زائد رقم کے جائز ہونے کی علت صرف فساد ہے، ورنہ اس کا حکم بیمہ کا عام حکم ہوگا۔

### ۴- نقل و حمل کا کام کرنے والی کمپنیوں کا بیمہ:

آج کل مختلف مقامات پر جو سامان بھیجا جاتا ہے اس کا بھی بیمہ ہوتا ہے، اگر یہ بیمہ کا

معاملہ خود اسی ادارے سے ہو جس سے سامان کا نقل و حمل کا معاملہ ہوتا ہے تو یہ بیمہ اور اس پر طے شدہ معاوضہ کا لینا جائز ہے۔ ”امداد الفتاویٰ“ وغیرہ میں ایسی صورتوں کے لئے جواز کا تذکرہ آیا ہے۔ مزید تحقیق و تفصیلات کے لئے امداد الفتاویٰ (جلد ۳) کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

مبارک حسین ندوی قاسمی  
نورالعلوم، نیپال

(۱۲)

انشورنس کے بارے میں احقر کا خیال ہے کہ موجودہ حالات کے پیش نظر زندگی کا بیمہ ہو، یا سماجی املاک جیسے مساجد، مکاتب، مدارس وغیرہ کا بیمہ جائز ہونا چاہئے مع زائد رقوم کے، تاکہ تلافی ہو سکے اور یہ کہنا کہ اکثر غرباء ہلاک ہوتے ہیں، تو یہ کیا لازم کہ مال داروں کو ان کے ساتھ مرنے دیا جائے، بلکہ اگر ان کی اقتصادی حالت برقرار رہے، یا بڑھے تو وہ غرباء کی کچھ مدد بھی کر سکتے ہیں۔ ”وللمفتی أن یسهل للناس“ ہاں اتنی بات ہے کہ مبتلی بہ شدید ضرورت کو محسوس کر کے ہی انشورنس کرائے۔

بندہ عبدالواحد مظاہری

(مفتی و شیخ الحدیث مدرسہ دارالعلوم، پنڈواہنگلی مغربی بنگال)

(۱۳)

انشورنس کے متعلق آپ کا ارسال کردہ ”مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ“ کا فیصلہ موصول ہوا، اس کو غور سے پڑھا اور مسلمانوں کے موجودہ حالات میں بھی غور کیا، پورے غور و فکر کے بعد بندہ کی سمجھ میں جو بات آئی ہے وہ یہ ہے:

امر انشورنس کی فی الحال ضرورت کا درجہ حاصل نہیں ہے اور نہ اس کو اس حاجت شدیدہ کا درجہ دیا جاسکتا ہے، جو بحکم ضرورت قرار دیئے جانے کے لائق ہے۔

محمد افضل حسین عفی عنہ

(دارالعلوم الاسلامیہ، بستی)

(۱۴)

۱- جان کے بیمہ کے متعلق ناقص کا خیال یہ ہے کہ عقیدہ ایمان کے تقاضہ، نیز فقہ اسلامی کے خلاف معلوم ہوتا ہے، لہذا کسی صورت میں جان کے بیمہ کی اجازت دینے کی گنجائش شرعی طور پر (میرے ناقص مطالعہ کے موافق) نہیں دیکھتا ہوں۔

۲- املاک اور تجارت کے بیمہ کے متعلق احقر کا خیال یہ ہے کہ فسادات سے قطع نظر کر کے ضرورت شدیدہ کے تحت مہتملی بہ کو یہ اجازت دیا جانا مناسب ہے کہ اگر اس کو ظن غالب ہو کہ اس کی املاک اور مال تجارت تلف ہونے کا اندیشہ ہے تو وہ ان اشیاء کا بیمہ کرا سکتا ہے، البتہ مقتدائے قوم علماء کرام کو حتی الامکان اس سے احتراز کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

احقر محمد عطاء الرحمن، ایڈیٹر نوائے دین، آسام

(۱۵)

موجودہ حالات میں انشورنس کا حکم؟

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ انشورنس ربوا، قمار، مخاطرہ جیسے معاصی و گناہوں پر مشتمل ہے اور یہ وہ محرّمات ہیں جن کی حرمت بہ نص کتاب و سنت ثابت ہے، اس لئے

فی نفسہ انشورنس کرانا جائز و حرام ہے۔

۱- لیکن چونکہ آج کل ہندوستانی مسلمانوں کو جو حالات و حوادث درپیش ہیں کہ ان کی جان و مال، املاک و جائیداد غیر محفوظ ہیں اور ہر وقت اس بات کا خطرہ لگا رہتا ہے کہ پتہ نہیں دشمن ہمارے جان و مال کو کس وقت تباہ برباد کر دے گا، اس لئے محض بغرض حفاظت و دفع مضرت، مسلمانوں کو جب اپنی جان و مال کے ضائع و برباد ہونے کا قوی اندیشہ ہو تو بیمہ کر لینا درست ہے، اس لئے کہ فقہ کے قواعد پر نظر کرنے سے ہمیں اس قسم کی روشنی ملتی ہے کہ بوقتِ ضرورت محظورات میں اباحت اور جواز کی گنجائش دی جاسکتی ہے۔

”الضرورات تبیح المحظورات، الضرریزال، المشقة تجلب

التیسیر۔“

۲- پالیسی ہولڈر مدت پوری ہونے سے قبل ہی انتقال کر جائے، یا اپنی مدت پوری کر لے، ان دونوں صورتوں میں جمع کردہ رقم سے زائد رقم کا استعمال نہ وارثین کے لئے درست ہوگا اور نہ ہی بیمہ کنندہ کو، اس لئے کہ انشورنس کی اجازت ہم نے بہ ضرورت شدیدہ دی ہے اور نقصان کے بقدر معاوضہ لینے سے ضرورت پوری ہو جاتی ہے، زیادہ کی اجازت نہیں ہے۔

”الضرورة تتقدر بقدرها۔“

۳- سرکاری ملازمین کی جبری بیمہ زندگی کی صورت میں حکومت کی طرف سے جو رقم زائد ملتی ہے اسے پراویڈنٹ فنڈ پر قیاس کر کے ملازمین یا اس کے ورثا کا اسے لینا اور اپنے استعمال میں لانا درست و جائز ہے۔

۴- انشورنس کمپنی جمع کردہ رقم پر جو سودیتی ہے، خواہ اس سے نقصان کی تلافی ہو یا نہ ہو، اس زائد رقم کو جان و مال کی تلافی قرار دینا درست نہیں ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ اس کا لینا اور تصرف میں لانا کیا حکم رکھتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اسے لے لیا جائے اور بلا نیت ثواب صدقہ کر دیا جائے، اس

لئے کہ اصول فقہ کا یہ قاعدہ ہے: ”ما حصل بسبب خبیث فالسبیل ردہ“ جو چیز بذریعہ خبیث حاصل ہو اسے لوٹا دینا واجب ہے، لیکن زائد بیمہ کمپنی کو لوٹا دینے میں ہمارا ہی نقصان ہے کہ وہ اس رقم کو ہمارے خلاف استعمال کرے گی، اس لئے اسے صدقہ کر دیا جائے۔

۵- ایسی صورت میں چونکہ کمپنیاں خود انشورس کرتی ہیں اور حمل و نقل کی متعارف اجرت سے زیادہ رقم اس معاہدہ کے ساتھ صاحب مال سے وصول کرتی ہے کہ مال کے ضیاع و نقصان کی صورت میں ہم ضمان ادا کریں گے، تو کمپنیوں سے مال کے ضیاع یا نقصان کی صورت میں معاوضہ لینا جائز ہے، چاہے یہ کمپنیاں مسلمانوں کی ہوں یا غیر مسلموں کی دونوں کا ایک ہی حکم ہے، اس لئے ”ردالمحتار“ کی عبارت ہے:

”إن المودع إذا أخذ أجره على الوديعة يضمنها إذا هلكت“ (ردالمحتار ۳/۲۷۳)۔

جب مودع ودیعت کے رکھنے پر اجرت وصول کرے تو اس کے ہلاک ہونے کی صورت میں اس پر ضمان واجب ہوگا۔

(مفتی) محمد جعفر ملی رحمانی

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، ضلع دھولپہ، مہاراشٹر

(۱۶)

مخصوص حالات میں بیمہ:

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیمہ بذات خود ایک ناجائز معاملہ ہے جس پر تقریباً تمام ہی علماء کا اتفاق ہے، وہ بلاشبہ ”مینسر“ ہے، یعنی جو جس کو قرآن مجید نے رخص اور عمل شیطان قرار دیا ہے اور اس سے سختی سے روکا ہے، اس کے علاوہ اس کی اکثر شکلوں میں ربوا بھی شامل ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کے مرادف ہے۔ نفس بیمہ اس وقت اس مجلس کا موضوع نہیں ہے۔

اب دو شکلیں باقی رہ جاتی ہیں:

- ۱- وہ غیر اختیاری بیمہ جو حکومت کے قوانین کی وجہ سے لازمی ہے، خواہ وہ زندگی کا بیمہ ہو یا مکان، دکان، اور وسائل نقل و حمل کا، اس کی اجازت بوجہ مجبوری علماء نے دی ہے۔
- ۲- دوسرا بیمہ اختیاری ہے جو سوال نامہ میں ذکر کردہ خدشات کی وجہ سے مجبوراً کرانا پڑ رہا ہے، یہ بھی ایک طرح کی مجبوری ہی ہے اور یہ توقع بھی بجا اور درست ہے کہ ملکی انتظامیہ کو اس صورت میں تحفظ کی زیادہ فکر ہو سکتی ہے اور فساد یوں کو جو مسلمانوں کی اقتصادیات کو تباہ کر دینا چاہتے ہیں، اس سے مایوسی ہوگی کہ انشورنس کے نتیجہ میں مسلمان پھر سے اپنے کاروبار سنبھالنے کے لائق ہو گئے۔

تاہم یہ ایک رخصت ہوگی اور عزیمت کا اعلیٰ درجہ یہی ہوگا کہ آدمی اس رجس (نجاست و پلیدی) سے اپنے آپ کو دور ہی رکھے۔

یہ اجازت چونکہ ”بوجہ ضرورت“ ہی ہوگی، اس لئے بیمہ کے نتیجہ میں ملنے والی زائد رقم کا استعمال کرنا جائز نہ ہوگا، اسی طرح سود کی رقم بھی بدستور ناجائز ہی ہوگی۔

البتہ مرنے والے کے ورثاء کو جو زائد رقم ملتی ہے اس میں میری ناقص رائے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر ان کا اپنا کاروبار بقدر کفالت موجود ہے تو وہ رقم استعمال کرنا ان کے لئے جائز نہیں، اسے لے کر فاقہ کی کاموں میں لگا دیں اور اگر کاروبار، یا وسیلہ معاش یا رہائش کے لئے مکان یا کاروبار کے لئے دکان نہیں ہے تو وہ رقم ان چیزوں میں استعمال کی جائے، کھانے پینے اور ذاتی تصرفات میں نہ لی جائے۔

ان تمام معروضات کے بعد ایک گزارش یہ بھی ہے کہ ہر معاملہ میں تقویٰ اور احتیاط کا پہلو اختیار کرنا ہر صاحب ایمان کی ذمہ داری ہے، لہذا علماء نے خواہ ضرورت کے تحت بعض مسائل میں رخصت دی ہو، لیکن جو صاحب ہمت خود کو مشتہہ معاملات سے بچالے گا، تو اس نے اپنے دین کو بے داغ بنا لیا۔ ”فمن اتقى الشبهات استبرأ لدينه“۔

محمد عبداللہ طارق، نئی دہلی



### بیمہ کی شرعی حیثیت کیا ہے:

یہ صحیح ہے کہ دستور ہند میں امن وامان قائم کرنے اور حفاظت کی ضمانت ہے، لیکن روز مرہ کے پیش آنے والے حالات اور اخباری رپورٹوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اور تقریباً ہر سیاسی پارٹی پر فرقہ پرستوں کی اس قدر سخت گرفت ہے کہ جس وقت اور جہاں چاہتے ہیں ناکہ بندی کر کے قتل و غارتگری مچاتے ہیں اور پولس کو تماشائی، یا اپنا شریک کار بنا لیتے ہیں اور منصوبہ پورا ہونے سے پہلے بڑے بڑے ذمہ داروں کو بھی ان حدود میں داخل نہیں ہونے دیتے، اگر وہ احکام جاری کریں تو ان کو غلط رپورٹیں پیش کر کے اپنا ہم خیال بنا لیا جاتا ہے، پھر مظلوموں کی فریاد سننے کے لئے بھی کوئی تیار نہیں ہوتا اور نقصان کی تلافی کے لئے جو اعلان کئے جاتے ہیں ان کے فائدے سے بھی زیادہ تر مسلمانوں کو محروم کر دیا جاتا ہے، ایسی صورت میں مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کے لئے بیمہ کرائیں تو ان شرائط کے ساتھ جو ’’فتاویٰ رحیمیہ، فتاویٰ محمودیہ، نظام الفتاویٰ‘‘ وغیرہ میں مذکور ہیں، بیمہ کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

البتہ پالیسی ہولڈر مدت پوری ہونے سے پہلے مر جائے تو جمع کی ہوئی اقساط سے زائد رقم لینا وارثین کے لئے جائز نہیں۔

بیمہ کرائے کی اجازت سرکاری کمپنی سے ہی دی جائے، غیر سرکاری سے نہیں، سرکاری کمپنی سے نقصان کی تلافی کرائی جائے تو مناسب ہے اور جمع شدہ رقم سے زائد جو حادثہ نہ ہونے کی صورت میں ملتا ہے سود کے حکم میں داخل ہے۔

اور معاملہ کرنے والی کمپنیاں غیر سرکاری ہوں تو ان سے نقصان کا معاوضہ لینا بھی

درست نہیں۔

پھر یہ کہ مینٹلی بہ علماء کرام کے مشورے اور حالات کی روشنی میں بیمہ کے حاجت مند

ہونے نہ ہونے کا فیصلہ کرے، یہی زیادہ بہتر ہے اس کے مقابلہ میں عمومی حاجت تصور کرتے ہوئے عام اجازت دی جائے سداللباب۔

الحجیب محمد عبدالرحیم، بھوپال

### (۱۸)

اس وقت انشورنس کی بے شمار قسمیں وجود میں آئی ہیں، اس کی بہت ساری اقسام تو ناجائز ہیں، لیکن بعض اقسام ضرورت یا حاجت کی وجہ سے جائز ہیں۔ مثلاً بعض انشورنس سرکار کی طرف سے لازمی ہوتے ہیں، اس کے بغیر آدمی امور ضروریہ انجام نہیں دے سکتا، جیسے سوار یوں کو خریدنا اور بعض ملازمین وغیرہ۔ لہذا بندہ کے نزدیک ان صورتوں میں لازمی انشورنس کرنا جائز ہے، بعض لائف انشورنس اس قسم کے ہیں جن کی وجہ سے آدمی انکم ٹیکس کی بڑی مقدار ادا کرنے سے بچ جاتا ہے، علماء نے اس کے جواز کا بھی فتویٰ دیا ہے، جبکہ جمع شدہ رقم سے زائد رقم صدقہ کرنے کا عزم ہو۔ اب رہا مسئلہ حادثات اور فسادات کی بنا پر انشورنس کرانے کا جواز اور اس کا مشورہ دینا تو یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔

اللہ، اس کے رسول ﷺ کے وعدہ کے مطابق حلال مال اور زکوٰۃ ادا کیا ہو مال کبھی

ضائع نہیں ہو سکتا اور واقعات بھی اس پر شاہد ہیں۔

یوں تو بہت سارے مسلمان اکثر امور ناجائز ہونے کے باوجود انجام دیتے ہیں، مثلاً سودی کاروبار، رشوت وغیرہ، لہذا اگر وہ انشورنس کرنا چاہیں تو ناجائز سمجھ کر اس کام کو انجام دیں۔ انشورنس کو جائز قرار دینے کی صورت میں اس کا دروازہ بالکل کھل جائے گا اور بہت سارے وہ احباب جن کے لئے انشورنس حاجت کا درجہ نہیں رکھتا وہ بھی انشورنس کرانے

لگیں گے، اور انشورنس کا مدار بھی ظلم پر ہے جس سے پوری قوم کا سرمایہ چند افراد کے ہاتھوں میں جمع ہوتا ہے۔

کبھی کبھی انشورنس کا لوگ غلط فائدہ اٹھاتے ہیں، مثلاً لائف انشورنس کر دینے کے بعد ورثہ کا خفیہ طریقہ سے اس کو قتل کر دینا، جہاز کا انشورنس کرانے کے بعد اس کے کارآمد اجزاء کو نکال کر اس کو دریا میں غرق کر دینا، یا اپنے مکان کو آگ لگا دینا۔ اس طرح ایک ناجائز کام مزید حرام کاموں کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

لہذا میرے نزدیک اس کا عمومی فتویٰ یا مشورہ دینا جائز نہیں ہے۔

بندہ محمد ایوب ندوی  
جامعہ اسلامیہ، بھنگل

(۱۹)

ہر حکومت کی بنیادی اور اولین ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی محکوم رعایا کی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے، اور ممکن حد تک ان کے تحفظ کا بندوبست کرے، اگر خدا نخواستہ کوئی حکومت اپنی اس اہم اور بنیادی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوتی، اس کی رعایا اپنے کو غیر محفوظ سمجھتی ہے اور ان کا کاروبار ہر وقت غیر یقینی صورت حال کے خطرات سے دوچار رہتا ہے، تو درحقیقت یہ حکومت کی نااہلی ہے اور ایسی حکومت کو حکومت کہنا بھی مشکل ہے جس میں جنگل کے قانون کا دور دورہ ہو۔

ہمارے ملک ہندوستان میں خاص طور پر مسلم اقلیت کو آئے دن جس طرح کے جان لیوا مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور جس قسم کے مصائب و پریشانیوں سے واسطہ پڑ رہا ہے اور جن صبر آزما حوصلہ شکن حالات کا مقابلہ انھیں ہر صبح و شام کرنا پڑ رہا ہے، اس کے لئے ضروری و لازم

ہے کہ ان کے جان و مال کے تحفظ اور ان کی اقتصادی و معاشی بربادی کے سدباب کے لئے کچھ سوچا اور فیصلہ ہی نہ کیا جائے، بلکہ اس کے لئے اقدام بھی کیا جائے۔

میری ناقص رائے اس معاملہ میں یہ ہے کہ بیمہ (INSURANCE) اس کی ایک تدبیر ہو سکتی ہے۔ خواہ اس کا تعلق زندگی کے بیمہ سے ہو، یا کاروبار، دکان، مکان وغیرہ کے بیمہ سے۔ ہمارے ملک کی بیمہ کمپنیاں حکومت کے ذریعہ چلائی جا رہی ہیں، اس لئے جب حکومت ہمیں تحفظ فراہم نہیں کرتی تو اس کا خمیازہ بہر حال اسی کو بھگتنا چاہئے۔ لہذا وقت کے حالات اور ضرورت شدیدہ یا مجبوری کا تقاضا یہ ہے کہ بیمہ کرانے کی اجازت مسلمانوں کو دی جائے، تاکہ حکومت و انتظامیہ کی کوتاہیوں کے سبب ہونے والے نقصانات کی ممکن حد تک تلافی حکومت کے ذریعہ کرائی جاسکے۔

محمد علاء الدین ندوی  
پیر الطیف، ضلع کھنگڑ یا بہار



## مناقشہ:

## انشورنس

[دوسرے فقہی سمینار منعقدہ دسمبر ۱۹۸۹ء میں انشورنس کے موضوع پر  
مناقشہ ہوا تھا، وہ مناقشہ درج ذیل ہے]

۱۱ دسمبر ساڑھے دس بجے صبح

زیر صدارت: ڈاکٹر جمال الدین عطیہ، قاہرہ

مفتی محمد زید صاحب باندہ نے تلاوت فرمائی، پھر ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب گنوری نے  
ملک کے موجودہ حالات میں جان و مال کے بیمہ سے متعلق ایک تحریر پڑھ کر سنائی پھر انشورنس  
کے موضوع پر ڈاکٹر جمال الدین عطیہ نے خطاب کیا۔ عطیہ صاحب کی ترجمانی ڈاکٹر گنوری  
صاحب نے کی۔

ڈاکٹر جمال الدین عطیہ:

عوام کی پریشانیوں میں اعانت کرنا دراصل حکومت کا کام ہے لیکن اسلامی حکومت نہیں  
ہے۔ انشورنس پرانی چیز ہے۔ ابوزہرہ عدم جواز اور ڈاکٹر مصطفی الزرقاء جواز کے قائل تھے۔ مجلس  
تحقیقات شرعیہ کا جو فیصلہ ابھی گنوری صاحب نے سنایا وہ موجودہ حالات میں درست ہے۔  
مفتی حبیب الرحمن خیر آبادی:

صرف جان کے بیمہ میں اختلاف ہے۔ باقی چیزوں سے منفق ہوں۔

## ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی:

بیمہ کمپنی حادثہ نہ ہونے اور موت نہ آنے کی ضمانت نہیں دیتی۔ ڈاکٹر جمال الدین عطیہ صاحب کے قول کے مطابق بیمہ کی ابتداء تعاون کے جذبہ سے ہوئی تھی۔ یہی چیز ترقی کر کے تجارتی بیمہ بن گئی۔ مقصد یہ تھا کہ جو لوگ حادثات سے متاثر ہوں ان کی امداد کی جائے۔ ایک پہلو فقہاء کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے، اس کا بنیادی نظام اسلام کے عادلانہ اور منصفانہ نظام کے خلاف ہے۔ بیمہ کمپنی ہماری ضرورت کے مطابق ہماری ادا نہیں کرتی بلکہ ہماری آمدنی کے مطابق کرتی ہے۔ اس میں سود اور انشورنس ایک ہی طرح کی چیزیں ہیں۔ اگر وقت سے پہلے مر گئے تو آپ کو فائدہ ہوگا۔ لیکن خوش قسمتی سے زندہ رہے تو بیمہ کے ذریعہ آپ سے زیادہ کمرشیل کمپنیوں کو فائدہ ہوگا۔

جن لوگوں نے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ ان کے سامنے قمار کا پہلو ہے۔ یہ فتویٰ غلط ہے، میں نہیں کہتا کہ آپ جواز یا عدم جواز کا فتویٰ دیں، یہ حقیقت ہے کہ جو تجارتی بیمہ کمپنیاں کام کرتی ہیں ان کی آمدنی سود پر مبنی ہیں۔ ایک پہلو ضرورت ہے۔ اس پہلو سے میری ذاتی رائے ہے کہ مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ کا فیصلہ صحیح ہے۔ مال و اسباب کا بیمہ درست ہے۔ جان کے بیمہ کے لئے مسلمان چاہیں تو اجتماعی طور پر نظم کر سکتے ہیں۔ بلاشبہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں پریشانیاں ہیں اور بعض مسائل پیچیدہ ہیں۔

## مفتی حبیب الرحمن خیر آبادی:

حادثہ کی تلافی حکومت کرتی ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ جرم کرنے والا کوئی اور ہے اور تاوان دینے والا کوئی اور۔ یہ بات شریعت میں نہیں ہے۔ بیمہ کرانے والا کبھی غیر شرعی وارث کا نام لکھوا دیتا ہے اور یہ رقم اسی غیر وارث کو ملتی ہے۔

## ڈاکٹر فریدی صاحب:

شرعی اصولوں کے تحت آپ جس شخص کو نامزد کریں گے تو رقم اسی کو ملے گی۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

غیر وارث کے لئے وصیت کرنا جائز ہے۔

مولانا عبید اللہ صاحب کوٹی:

حکومت حفاظت کی رقم دیتی ہے، ضمان نہیں دیتی۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

یہ کفالت بالضممان ہے۔ اس میں کیا حرج ہے؟

مفتی حبیب الرحمن خیر آبادی:

حادثہ ہونا نہ ہونا موہوم ہے، پھر کفالت کس بات کی ہے؟

مفتی اشفاق احمد اعظم گڑھ:

بیمہ کا مقصود ضمان نہیں ہے۔ لیکن طریقہ کار میں ضمان لازم آتا ہے۔ اس لئے یہ بات

صحیح ہے کہ جنابیت کوئی کرتا ہے اور تاوان کوئی اور ادا کرتا ہے۔ بیمہ کمپنی اصول انسانیت اور صلہ

رحمی کے خلاف ہے، اس کی بناء سود پر ہے۔

قاضی صاحب:

بیمہ کمپنی کا جو مقصد ہے وہ امر آخر ہے۔ کیوں نہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بیمہ کمپنی کفیل

بالضممان ہے۔ مسئلہ کی صرف اتنی تشخیص کر لی جائے کہ کفالت بالجہول جائز ہے یا نہیں؟

یہ جو کہا گیا کہ جرم کوئی کرے اور تاوان کوئی اور ادا کرے تو کیا شریعت میں اس کی نظیر

نہیں ہے؟ میرے خیال میں عاقلہ اس کی نظیر ہے۔

مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی:

بیمہ کمپنی بالعوض کفیل ہو رہی ہے اور عوض میں مال لے رہی ہے۔ جو مال لے گی وہ بھی

ربوی ہے اور جو دے گی وہ بھی ربوی ہے۔ کبھی زیادہ دیتی ہے اور کبھی کم۔

قاضی صاحب:

کم نہیں دیتی۔ ہم ڈاکٹر عبدالحسید صاحب سے وضاحت چاہیں گے۔

ڈاکٹر عبدالحسید صاحب اور ڈاکٹر فریدی صاحب:

کم بھی دیتی ہے۔

مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی:

بہر حال جو مال لیتی ہے اور جو مال دیتی ہے وہ ربوی ہے۔ ان سب کو سامنے رکھ کر

فیصلہ کیا جائے۔

مولانا عتیق احمد بستوی صاحب:

میرا خیال ہے کہ اس بحث میں جانے کے بجائے اس امر پر غور کرنا چاہئے کہ بیمہ میں

جو محذورات ہیں ان کے باوجود ہندوستان کے موجودہ حالات میں بیمہ کی گنجائش ہے یا نہیں ہے؟

ایک ہے فساد اور ایک ہے عام طور پر ہونے والا حادثہ۔ میرا خیال ہے فساد میں تباہ ہونے والوں

کو بیمہ کی گنجائش دینی چاہئے، باقی یونہی جان و مال کے بیمہ کرانے والوں کو اجازت نہیں دینی

چاہئے، بلکہ ان کو ملنے والی رقم کے مصرف پر بھی غور کرنا چاہئے کہ کہاں خرچ ہو۔

قاضی صاحب:

فساد اور حادثاتی موت سے متعلق کیا کوئی الگ اسکیم ہوتی ہے؟

ڈاکٹر عبدالحسید صاحب:

میرے خیال میں فساد کے لئے عام طور پر بیمہ نہیں ہوتا لیکن اگر خواہش کی جائے گی تو

ایسا بھی ہوتا ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب:

تحقیقات شرعیہ نے جو فیصلہ کیا ہے اس میں مال کے بیمہ کا فیصلہ تو صحیح ہے لیکن جان کے

سلسلہ میں تخمینہ معلوم ہوتا ہے۔



ڈاکٹر گنوری صاحب:

مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ کا فیصلہ ڈاکٹر صاحب نے پھر پڑھ کر سنایا۔

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی:

یہ دیکھئے کہ فرق کیا ہے یا نہیں کیا ہے؟

ڈاکٹر فریدی صاحب:

میں نے عرض کیا تھا کہ اس میں قمار کی شکل نہیں ہے۔ قمار اس لئے نہیں ہے کہ اس پر غور کریں کہ بیمہ کمپنی کیا کرتی ہے۔ بیمہ کمپنی یہ نہیں کہتی کہ آپ کے ساتھ حادثہ پیش نہیں آئے گا۔ بلکہ پورے گروپ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں حادثہ کی شرح یہ ہے، یہی حال موت کے بارے میں ہے۔ مان لیجئے کہ ماضی میں شرح اموات کچھ رہی ہے۔ ماضی میں شرح اموات جو بھی رہی ہو۔ آئندہ اگر حالات یہ رہتے تو یہی شرح رہے گی۔

قاضی صاحب:

کاروبار اور موت کی شرح کا اندازہ کر کے مستقبل کی شرح کا تخمینہ لگاتے ہیں۔ اور اس کو بنیاد بنا کر معاملہ کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اگر میری موت ہو جائے، اگر میری گاڑی کا حادثہ ہو جائے تو اتنا دیا جائے گا۔ لفظ ”اگر“ کے ساتھ جو بات کہی جائے وہ واقع بھی ہو سکتی ہے اور نہیں بھی ہو سکتی ہے، اور اس خطرے کے ضامن ہونے کا وہ ہم سے پیسے لیتے ہیں۔ سوچئے کہ اس شکل پر قمار کی مذکورہ تعریف صادق آتی ہے؟

ڈاکٹر فریدی صاحب:

جس اندازہ کو آپ قمار قرار دے رہے ہیں۔ اسی اندازے پر سارے منصوبہ بندی کام کر رہی ہے۔ اندازے کو قمار قرار نہیں دیا جاسکتا۔

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی:

وہ ہم سے پیسے لیتے ہیں۔

ڈاکٹر فریدی صاحب:

پالیسی کی ایک خاص حد مقرر ہوتی ہے۔ اس حد کو اگر آپ نے پورا کر دیا تو پوری رقم ملے گی۔ اور اگر اس کو پورا نہ کیا تو آپ کی جمع کردہ رقم ملے گی۔ میری رائے میں یہ قمار نہیں ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب:

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ نہیں ملے گا۔

ڈاکٹر فریدی صاحب:

معادہ ہوتا ہے۔ اور معادہ کا ہونا آپ کو معلوم رہتا ہے اس کے مطابق رقم ضبط بھی ہوتی ہے۔

مفتی رفیع عثمانی صاحب:

خلاصہ یہ ہوا کہ اگر یوں ہوا..... تو پوری..... یوں ہوا..... تو کم..... یوں ہوا..... تو زیادہ..... رقم ملے گی۔ یہی قمار ہے۔

مفتی سعید احمد پالنپوری:

غیر اسلامی عناصر نے پوری دنیا میں بیمہ کی جو شکلیں رائج کر رکھی ہیں شریعت میں ان کا کیا حکم ہے؟ ذہن میں رکھئے کہ غیر اسلامی لوگوں کی رائج کردہ یہ شکلیں شریعت کے مطابق نہیں ہیں۔ اس لئے غور یہ کرنا ہے کہ اسلام میں بیمہ کی جائز شکل کیا ہے؟

یہ بھی سوچنا ہے کہ بیمہ دنیا کی ضرورت ہے یا نہیں ہے؟ اگر ہے تو سوچئے کہ اسلام اس کے لئے کون سا طریقہ تجویز کرتا ہے۔ موجودہ بیمہ کی شکلوں پر کیوں غور ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔

ماضی اور حال میں نمایاں تغیر آ گیا ہے۔ حضور پاک ﷺ کے زمانہ میں علاج کا طریقہ مفردات تھا، اب مرکبات ہے۔ دونوں طریقوں کے خواص الگ الگ ہیں۔ فقہ میں مفرد و مرکب معاملات کی نظیر موجود ہے۔ شرکت، مضاربت، بیع وغیرہ ملا کر مرکب تیار کرنا ہے؟ یا کیا کرنا ہے؟ یہ سوچئے اور اس کا حکم معلوم کیجئے۔

اسلامی بینک کے مسئلہ ہی سے پوری دنیا پریشان ہے بہر حال یہ سوچنا ہے کہ اسلامی انشورنس کی صورت کیا ہے۔

امین الحسن رضوی:

موجودہ حالات میں غور کریں کہ کیا جائز ہے؟

مفتی جمیل احمد ندیری:

یہ فرض کر کے چلئے کہ یہ ناجائز ہے۔ لیکن کیا موجودہ حالات میں جائز ہے؟

مفتی عزیز الرحمن صاحب:

تو کیا فساد کا مسئلہ اس سے حل ہو جائے گا؟

قاضی صاحب:

آپ حضرات اب تک انشورنس کے مسئلہ کی بات کرتے آرہے ہیں ہر ایک کی رائے اور مخالف کی رائے سننا پھر انگیز کرنا اچھی علامت ہے۔ میں نے بعض بزرگوں کو دیکھا ہے کہ اپنے سے بہت کم چھوٹے لوگوں کی تقریروں کی مجلس میں پابندی سے بیٹھا کرتے۔

حضرت قاری محمد طیب صاحب چھوٹے چھوٹے لوگوں کی تقریروں میں بیٹھے رہتے۔ میں کہتا کہ حضرت چلئے تو فرماتے کہ ان تقریروں میں کبھی کبھی ایسے نکات ملتے ہیں کہ جو بڑے پتے کے ہوتے ہیں۔ میں ان کو اپنے طور پر ڈھال لیتا ہوں۔

ایک دوسرے کے خیال سننے سے فائدہ ہی ہوتا ہے، نقصان تو ہوتا نہیں۔ ابھی جو بحث ہوئی ہے اس کا مقصد حلت و حرمت کا فیصلہ کرنا نہیں ہے۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ ہندوستان کے حالات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح کے حالات میں ۱۹۶۵ء میں لکھنؤ میں بیٹھ کر بعض بزرگوں نے ایک فیصلہ کیا تھا۔ یہ دیکھنا ہے کہ آج کے حالات میں اس فیصلہ کی توثیق کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ مقصد صرف اتنا ہے کہ موجودہ حالات کو حاجت یا ضرورت کے منزلہ میں مان کر انشورنس کو اصلاً ناجائز ماننے کے باوجود اس کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

دونوں خیالات کے حضرات اپنا اپنا ایک نوٹ لکھ کر عنایت فرمائیں۔ اس مسئلہ پر اب آئندہ غور کیا جائے گا۔

### (مناقشہ چوتھا سیمینار)

حضرت قاضی صاحب:

اس وقت انشورنس (INSURANCE) کا مسئلہ زیر بحث ہے، ہمارے علماء کے نزدیک انشورنس کا عدم جواز ایک تسلیم شدہ مسئلہ ہے، پچھلی دفعہ جب ہم جمع ہوئے تھے اور خاص کر بھاگلپور کے فرقہ وارانہ فساد کے پیش نظر جو مسلمانوں کی عمومی جان و مال کی ہلاکت کی صورت حال سامنے آئی، اس کے پیش نظر ضمنی طور پر حضرات علماء نے دوسرے فقہی سیمینار میں اس مسئلہ پر بحث کی کہ کیا ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ان حالات میں ان حالات سے مراد ان کی جان و مال کا خطرہ ہے۔

۱- اصولی طور پر سرکار، حکومت وقت کا جان و مال کے تحفظ کے لئے ذمہ دار ہونا۔

۲- ہندوستان میں انشورنس کمپنیوں کا براہ راست سرکار کی تحویل میں ہونا۔

۳- مسلمانوں کی جان و مال کا خطرہ، قیام امن اور انسانی جان و مال کی حفاظت کا سرکار کا ذمہ دار ہونا اور انشورنس کمپنیز کے نفع و نقصان کا سرکار سے متعلق ہونا۔

یہ تین نکلتے تھے جن کو سامنے رکھ کر بحث کی گئی تھی۔۔۔ اس سلسلے میں ہمارے بزرگ علماء نے اس سے پہلے لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تحت ”مجلس تحقیقات شرعیہ“ کا قیام عمل میں لایا تھا تو اس وقت مجلس نے ایک تجویز منظور کی تھی، وہ تجویز کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ (اس صورت تجویز میں چند شرائط کے ساتھ ہندوستان کے مخصوص حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمان کو اس بات کی اجازت دی گئی تھی کہ وہ اپنی جان و مال کا بیمہ کرا سکتے ہیں۔ وہ تجویز بھی زیر بحث آئی۔ اس میں کئی شقیں علماء کے نزدیک ایسی تھیں جو مبہم تھی جن کی تشریح اور توضیح کی ضرورت تھی)۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ آج کے اجتماع کا موضوع مطلق انشورنس نہیں ہے، اور ان تفصیلات میں جانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں، یہ تسلیم کر کے کہ انشورنس جن عقود پر مشتمل ہے وہ شرعاً جائز نہیں ہیں، اس بات کو تسلیم کر کے آگے بڑھا جائے کہ کیا ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ اپنی جان، یا اپنے املاک کا بیمہ کرائیں؟

بعض چیزیں ہیں جو لازمی (COMPULSORY) ہیں، گاڑیاں ہم سڑک پر چلا نہیں سکتے جب تک انشورنس نہ کرائیں، اسی طرح بعض اور چیزیں ہیں جن کو بہر حال انشورنس کرانا ہی پڑتا ہے، یہ قانونی طور پر ”جبری انشورنس“ ہے، اس میں علماء نے لوگوں کے معذور ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔ اور بعض ملازمتوں میں بھی جبری انشورنس اسکیم ہے، وہاں کسی بھی ملازم کی تنخواہ کی رقم اور اس کی قسط کاٹ لی جاتی ہے، سوچنا جو کچھ ہے پراویڈنٹ فنڈ (P.F.) میں علماء نے لکھا ہے کہ گویا اس کی تنخواہ کا وہ جزء ہے جو اسے نہیں دیا گیا اور بغیر اس کے قبضے میں آئے ہوئے وہ شیئ اسکیم میں لگا دی گئی، تو اگر وہ کسی اضافے کے ساتھ اس کی طرف لوٹی ہے تو یہ اس کے لئے جائز ہے، اس طرح کی بحثیں علماء کے درمیان ہو چکی ہیں، ابھی اس سیمینار کو اس حد تک محدود رکھنا چاہئے کہ جان و مال کے موجودہ غالب خطرے کو دیکھتے ہوئے، بڑی بڑی املاک، بڑی بڑی فیکٹریاں جس طرح ان فسادات میں بربادی کر دی جاتی ہیں، اگر مسلمان اس کو انشورنس نہیں کراتا اور خاص کر ان فسادات کا جو بڑا نشانہ ہے، وہ معاشی طور پر مسلمانوں کی کمر توڑ دینا ہے، جہاں جہاں بھی فسادات ہوتے ہیں بھاگلپور آپ کا صنعتی شہر تھا، ریشم کی صنعت وہاں کی مشہور ہے، جمشید پور بھی ایک صنعتی شہر ہے، علی گڑھ میں بھی کچھ صنعتیں آپ کے پاس ہیں، فیروز آباد اور حیدرآباد کے بھی حالات اسی طرح کے ہیں، اسی طرح بھونڈی اور دوسرے مقامات پر ہونے والے فسادات میں آپ نے دیکھا، معاشی حیثیت سے مسلمانوں کو کمزور کرنے کی ایک کوشش ہے تو کیا مسلمانوں کے لئے جائز ہوگا ایسے متوقع خطرات کے پیش نظر وہ اپنی املاک کو اور اپنی جان کا انشورنس کرائیں، اور پھر انشورنس کے نتیجے میں ان کو جو رقم ملے وہ ان کے لئے جائز

ہوگی، یا نہیں؟ اس میں اور بھی کچھ ضمنی سوالات ہیں جو علماء کے سامنے آنے چاہئیں۔

بحث کے آغاز سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ جناب شمس پیرزادہ صاحب کا مقالہ سن لیا جائے، ایک دو اور مقالے ہیں، اس کے بعد ہم لوگ آگے بحث کریں گے، اب میں جناب شمس پیرزادہ صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ تشریف لائیں اور اپنے مقالہ کی تلخیص اور ہم نکات سے ہم لوگوں کو واقف کرائیں۔

جناب پیرزادہ صاحب نے اپنا مقالہ پڑھ کر سنایا، یہ مقالہ علیحدہ سے شریک اشاعت ہے وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

اس کے بعد جناب مفتی برہان الدین صاحب نے اپنا مقالہ پیش کیا، یہ مقالہ بھی علیحدہ سے شریک اشاعت ہے۔

حضرت قاضی صاحب:

یہاں پر دو باتیں ہیں۔ دیت وغیرہ کی جو بات کہی جا رہی ہے، ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہ نہیں کہ جن لوگوں نے موجودہ حالات میں اس کے جواز کی بات کہی ہے اسے دیت کہا ہے، جہاں تک یہ بات ہے کہ مسلمانوں کا خون ہدر نہیں کیا جائے گا اور دم ہدر نہیں ہو سکتا، اس لئے اس کا معاوضہ قرار دیا جا سکتا ہے یہاں پر بحث کی بنیاد صرف اتنی ہے کہ حکومت ہماری جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہے، ہماری لڑائی حکومت سے یہ ہے کہ جو لوگ فسادات میں مارے جاتے ہیں ان کو معاوضہ (COMPENSATION) دیا جائے، ہم حکومت سے معاوضہ کا مطالبہ کرتے ہیں، ہم وقتی مدد اور ریلیف پر مطمئن نہیں، وقتی تعاون اور مدد الگ چیز ہے اور معاوضہ (COMPENSATION) الگ چیز ہے، تو ہمارا مطالبہ حکومت سے اسی معاوضہ کا ہے، خون کے درمیان فرق کرنا بھی عجیب چیز ہے، یہ خون ایک لاکھ روپے کا ہے، یہ خون بیس ہزار روپے کا اور چالیس ہزار روپے کا ہے، پنجاب میں کچھ کالج کے طلبہ مارے گئے تھے، ان کو حکومت نے ایک ایک لاکھ روپے دیئے گئے، اور بھاگل پور کے فساد میں مرنے والے مسلمانوں کے ورثہ کو

بیس بیس ہزار روپے دیئے۔ اگر ایک مسلمان مارا جاتا تو اس کے خون کے دام بیس ہزار اور غیر مسلم افراد مارے جاتے ہیں تو ان کے خون کے دام ایک لاکھ، جن علماء کی رائے اس کے جواز کی طرف جارہی ہے، ان کا کہنا دراصل یہ ہے کہ اگر کسی بھی طرح صاحب حق من علیہ الحق سے اپنا کچھ حق حاصل کر لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کے لئے اس کو حاصل کر لینا جائز ہوگا یا نہیں؟ یہ دراصل اسی اصول کے ذیل میں بات چل رہی ہے۔

علماء کے درمیان ایک بات یہ چل رہی تھی کہ (NATIONALISATION) کا مطلب یہ ہے کہ حکومت انتظام کو اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ عبدالرحیم قریشی صاحب اور دوسرے حضرات جن کو اس کی واقفیت ہے، ہمارے درمیان موجود ہیں، وہ اس پر گفتگو کریں گے، خلاصہ یہ ہے کہ اس کے نفع و نقصان کا نتیجہ جتنا ہوتا ہے وہ سرکار کا ہوتا ہے، تو یہ جتنی آمدنی سرکار کو ہوتی ہے، اگر حادثات زیادہ ہوتے ہیں تو حادثات کے معاوضے میں انشورنس کی جو رقم دینی پڑتی ہے وہ سرکار کے حصہ میں جاتی ہے اور اگر منافع ہوتے ہیں تو وہ بھی سرکار کی طرف جاتا ہے، تو قومیا نے کامطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس کا انتظام سرکار اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے، بلکہ حقیقۃً ملکیت منتقل ہو جاتی ہے اور نفع و نقصان حکومت کی طرف جاتا ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب:

میں ایک گزارش کروں گا کہ اگر اس بات کا اضافہ کر دیا جائے اس میں کہ ۱۹۶۵ء میں ”تحقیقات شرعیہ لکھنؤ“ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ انشورنس کر سکتے ہیں پچیس برس کا تجربہ آپ دیکھیں، اس کی وجہ سے فسادات میں کوئی کمی آئی، اگر فسادات میں کمی نہیں آئی تو خواہ مخواہ ایک حرام چیز کو حلال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی، یعنی یہ پہلو بڑا اہم ہے اس پر غور کرنا چاہئے۔

اس کے بعد علی الترتیب مندرجہ ذیل حضرات علماء نے اپنے اپنے مقالے پیش فرمائے، جو علیحدہ سے شریک اشاعت ہیں۔

۱- مولانا مصطفیٰ مفتاحی، استاذ حدیث و فقہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد۔

۲- مولانا مصلح الدین، بڑودہ۔

۳- مولانا مفتی محمد سبکی قاسمی صدر مفتی دارالعلوم حیدرآباد۔

۴- مولانا کمال الدین صاحب۔

مولانا عتیق احمد قاسمی:

انشورنس کے بارے میں دو پہلو سامنے آئے، صورت مسئلہ کی بھی اور تصویر مسئلہ کی بھی، میرا اپنا خیال یہی ہے، حقیر مطالعہ اور یہاں پر بحث کو سننے کے بعد کہ انشورنس کو فی نفسہ جائز کہنا درست نہیں ہے، فی نفسہ یہ انشورنس ناجائز ہے، ویسے تاریخی اعتبار سے اس کا آغاز امداد باہمی کے جذبہ کے ساتھ ہوا پھر اس میں استحصال شامل ہوا، میرا خیال یہی ہے کہ انشورنس کی جو شکل جاری ہے، ہندوستان میں اس کو بدلنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے، اس کی تمام اسکیمیں ربا، قمار، غرر پر مشتمل ہے، اس لئے اصلاً تو اس کی حرمت ہے، لیکن شریعت کا اصول ہے اور اس پر بہت سے مسائل متفرع بھی ہیں کہ ضرورت کی وجہ سے اور بعض اوقات حاجت کی بنیاد پر (ضرورت اور حاجت فقہی اصطلاح ہیں، جو آپ حضرات کو معلوم ہیں) ضرورت اور بعض اوقات حاجت کی بنیاد پر جبکہ حاجت عام ہو جائے، اس کا دائرہ پھیل جائے، تو بہت سی ممنوعات کو ہمارے فقہاء نے جائز قرار دیا ہے۔ انشورنس کرانے سے اگرچہ فسادات کی وبا نہیں رکے گی مگر یہ کہ وہ لوگ جو اس میں تباہ ہوں گے ان کے لئے کچھ نہ کچھ سہارا ہو جائے گا، جو لاکھ پتی اور کروڑ پتی ہوتے ہیں، وہ بھی فساد کے موقع پر پیسے پیسے کے محتاج ہو جاتے ہیں، ایسے لوگوں کی حالت ضرور بدلے گی، تو میرا اپنا خیال یہ ہے کہ جہاں تک املاک کے انشورنس کا مسئلہ ہے اس حد تک ہمیں کم سے کم ضرور اجازت دینی چاہئے، خاص کر ان شہروں میں جہاں فسادات ہو چکے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں، تو ربوا، قمار، غرر، ان سب کی حرمت کو تسلیم کرتے ہوئے شریعت نے حالت ضرورت اور حالت اضطرار میں جو گنجائش دی ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے، شریعت کی



دی ہوئی اجازت کو یہ کہہ کر رد کر دینا کہ مسلمان باغی ہو گئے ہیں ہماری بات نہیں مانتے ہیں یہ مسئلہ کا حل نہیں ہے، مسلمانوں کی اصلاح اور ان کے درمیان اس طرح کی کوشش کرنا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر ایسا نظام قائم کریں جو اسلامی اصول کے مطابق ہو، اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے، لیکن ان کوششوں پر بھروسہ کر کے، یا ان پر تکیہ کر کے موجودہ حالات میں سیکولر بننا اور یہ کہہ دینا کہ صاحب ربا، قمار اور فلاں فلاں چیزوں کی وجہ سے مطلقاً ناجائز ہے، نہ تو جان کا انشورنس جائز ہے اور نہ مال کا انشورنس جائز ہے یہ تو حالات سے صرف نظر کرنا ہے، فقیہ کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ فتویٰ دے دے کہ یہ کام جائز ہے، یہ ناجائز ہے، بلکہ اس مسئلہ سے صرف نظر کر کے حرمت کا فتویٰ دے دینا میرے نزدیک درست نہیں ہے۔

ایک بات اور میں عرض کرتا ہوں، اس وقت بینک کا جو نظام چل رہا ہے بینک میں روپیہ جمع کرنا ظاہری بات ہے کہ سودی نظام میں تعاون کرنا ہے ”تعاون علی الاثم“ ہے، لیکن ہمارے بڑے بڑے ادارے اور بڑے بڑے وہ لوگ جن کے پاس روپیہ رہتا ہے وہ بینک ہی میں جمع کرتے ہیں، بینک میں جمع کرنے کی وجہ کیا ہوتی ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ گھر میں رقم رکھنے سے رقم کی حفاظت نہیں ہو پائے گی اور رقم کی وجہ سے کبھی جان کو بھی خطرہ لاحق ہوتا ہے، اس لئے حفاظت کی خاطر بینک میں رقم جمع کی جاتی ہے اور یہ بات عام ہو چکی ہے، عملاً گویا اسے جائز قرار دے دیا گیا، میں عرض کرتا ہوں کہ اس حفاظت کی بنیاد پر ہم نے بینکوں میں رقم رکھنا شروع کیا اور اسے اپنے عمل سے جائز قرار دے دیا، کیا اس درجہ کی حفاظت کی بات انشورنس میں نہیں ہے، ایک آدمی اپنے تحفظ کے لئے، املاک کے تحفظ کے لئے اگر انشورنس کراتا ہے، اس کا جذبہ استحصال کرنے کا نہیں ہے، اگر کسی کا جذبہ ربوہ اور قمار کی خاطر انشورنس کرانے کا ہے تو اس کی حرمت ظاہر اور قطعی ہے، لیکن اگر کوئی ایسا مسلمان ہو جس کا یہ جذبہ قطعاً نہیں ہے کہ وہ اس نظام سے ربوہ، قمار یا رقم بلا پیسہ حاصل کرے گا، اگر تحفظ کے پیش نظر، تحفظ کی نیت سے کوئی انشورنس کراتا ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو علت اور وجہ بینکوں میں رقم جمع کرانے کی ہے، جس کو ہم نے تحفظ کا نام دیا ہے اس سے زیادہ تحفظ کی بات انشورنس کرانے میں پیدا ہوتی ہے، ڈکیتی کا واقعہ تو

کبھی کبھی پیش آتا ہے اور اس کے نتیجہ میں کسی کے گھر سے لاکھ دو لاکھ چلا جاتا ہے، لیکن فساد جو ہوتا ہے اس میں عمومی تباہی ہوتی ہے اور پورے کا پورا شہر تباہ ہو جاتا ہے، اس لئے واقعہ یہ ہے کہ ملک کے موجودہ حالات میں جو فضاء بگڑی جا رہی ہے اس فضاء سے آنکھ بند کر کے ہم حرمت کی بات کہہ دیں اور فقہاء نے حاجت و ضرورت کی جو صراحت کی ہے اس کو نظر انداز کر کے یہ بات کہنی مناسب نہیں ہے، حاجت جب عام ہو جائے تو ضرورت کا مقام لے لیتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت ملک کے جو حالات ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں، اور جس طرف ملک کا رخ جا رہا ہے، اس صورت حال کو ہم کم سے کم ”حاجت“ ضرور کہیں گے اضطراب نہ کہیں، ضرورت نہ کہیں، لیکن حاجت ضرور کہیں گے اور حاجت کے بارے میں ہمارے فقہاء کا جو اصول ہے اس اصول کی بنیاد پر انشورنس کرانے کی گنجائش نکلتی ہے۔

قاضی صاحب:

اب تک جو باتیں اور بحثیں سامنے آئی ہیں ان میں دو رخ ہیں، اور دونوں میں کوئی خاص بعد نہیں ہے، ظاہر ہے کہ معاملہ ربوا اور قمار کا ہے جو بے نص قرآنی حرام ہے اور شریعت کے مزاج کے قطعاً موافق نہیں، اس لئے علماء کا ایک طبقہ اگر اس مسئلہ میں شدت رائے کا اظہار کرتا ہے تو وہ نص قرآنی کی اس حرمت کا اظہار کرتا ہے جس کا تصور بہر حال مسلمانوں میں ہر زمانے میں برقرار رہنا چاہئے، حضرت امام ابوحنیفہؒ کی اس رائے کے باوجود کہ ”لا ربوا بین المسلم والحر بی فی دار الحرب“ تشدد حنفی علماء نے اس پر عمل نہیں کیا، اور اس کی بڑی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ اگر عارضی حالات میں اس کی اجازت دی جائے تو ہو سکتا ہے کہ اس سے ربوا کی حرمت کا تصور لوگوں کے دلوں سے نکل جائے، یہ ساری بحثیں ہمارے علماء کی کتابوں میں موجود ہیں۔

علماء کا دوسرا طبقہ ان حالات کو دیکھتا ہے جن حالات میں مسلمان اس وقت مبتلا ہے، تو ظاہر ہے کہ ان کے سامنے ہرگز کوئی ایسی بات نہیں کہ وہ خواہ مخواہ کسی چیز کو جائز قرار دینا چاہتا ہے یا وہ یہ سمجھتا ہے کہ سارا مسئلہ فسادات کا انشورنس کے جواز کا فتویٰ دینے سے حل ہو جائے گا، ایسی کوئی بات میرے خیال سے ان حضرات کے ذہن میں بھی نہیں ہے، وہ علماء یہ ضرور محسوس کرتے

ہیں کہ وہ سرکار جو اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہے اگر یہ سرکار کی تحویل میں آنے والے اداروں سے ہم اپنے تحفظ اور نقصانات کی تلافی کا کچھ حصہ حاصل کر سکتے ہیں تو اس کی اجازت مسلمانوں کو دی جانی چاہئے۔

اس کے بعد حضرت قاضی صاحب نے مفتی محمد ظفر الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند کے نام کا اعلان کیا، مگر موصوف سیمینار ہال میں اس وقت تشریف نہیں رکھتے تھے، اس لئے اظہار رائے نہیں کر سکتے۔

مفتی حبیب الرحمن خیر آبادی:

صدر محترم! حضرات علمائے کرام! آپ حضرات کے سامنے بیمہ زندگی اور بیمہ املاک کے بارے میں دونوں قسموں کی رائیں آگئی ہیں، جہاں تک ”مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ“ کے فیصلے کی بات ہے تو اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ نے اس میں کوئی چھوٹ نہیں دی ہے، بیمہ کے قواعد کے مطابق محض نفع لے لینے کے واسطے جو اپنی دولت اور سرمایہ کو بنانے کی خاطر یہ کاروبار کرتے ہیں، اس طریقہ کی انہوں نے ہرگز اجازت نہیں دی ہے، اسی طرح سے جو لوگ محض امکان اور احتمال کی بناء پر بیمہ کرنا چاہتے ہیں، ان کو بھی مجلس نے بالکل اجازت نہیں دی ہے اور چھوٹ نہیں دی ہے، بلکہ مجلس تحقیقات شرعیہ نے جو اجازت دی ہے وہ قیود و شرائط کے بعد دی ہے، بیمہ زندگی ہو، یا بیمہ املاک ہو، دونوں کا بیمہ کرانے کے واسطے مبتلا بہ کو جن قیود و شرائط کا پابند کیا گیا ہے ان شرائط اور قیود میں غور کرنا چاہئے کہ ہمارے ہندوستان کے اندر جو منظم طریقے سے فسادات ہو رہے ہیں اور جس کا مقصد مسلم قوم کی اقتصادی طور پر کمزور دینا ہے اور ہماری کمر ایسی ٹوٹ جائے کہ ہم اٹھ نہ سکیں، پنپ نہ سکیں، ان چیزوں کو سامنے رکھ کر ہمیں غور کرنا چاہئے کہ اس کا انسداد کس طریقہ سے ہو سکتا ہے، مسلم قوم کو جو ہلاکت و تباہی کے گڑھے میں ڈالا جاتا ہے، اقتصادی اور سماجی طور پر اس کا حل کیا ہے اور اس کے انسداد کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟، جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں کہ جہاں تک ہمارے علماء نے بیمہ املاک کی اجازت دی ہے، حالانکہ وہی علت جو بیمہ املاک میں ہے، بیمہ زندگی کے اندر پائی جاتی ہے،

اس لئے ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے، اگر بیمہ املاک کی اجازت دی جاسکتی ہے اور اس کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے مخصوص حالات کے پیش نظر، تو کیا وجہ ہے کہ بیمہ زندگی کے اندر وہی علت جب پائی جاتی ہے اس کو مخصوص حالات اور مخصوص قیود و شرائط کے ساتھ اس کی اجازت کیوں نہیں دی جاسکتی، یہ ہم بھی نہیں کہتے کہ مسلمان اس سے سنبھل جائیں گے اور تمام دنیا کے مسلمانوں کا حل اسی انشورنس میں ہے، ایسی کوئی بات نہیں ہے، بلکہ جن مخصوص حالات میں مجلس نے اجازت دی ہے ان مخصوص حالات پر غور کرنا چاہیے۔

ہمارے ایک بزرگ نے یہ بات رکھی کہ بیمہ املاک کے اندر اجازت دینی چاہئے اور بیمہ زندگی کے اندر اجازت نہیں دینی چاہئے اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ اس وجہ سے گورنمنٹ کو زیادہ نفع ہوگا اور پبلک کو نفع نہیں ہوگا، میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ کمپنی کو جہاں تک نفع پہنچنے کی بات ہے بیمہ زندگی کے مقابلے میں بیمہ املاک سے کمپنی کو زیادہ نفع پہنچے گا، بہر حال اس نقطہ نظر پر غور کرنا چاہئے، یہ بات بھی لوگوں کے سامنے آنی چاہئے کہ جس طریقہ سے ہمارے لئے اپنے دین و ایمان کا تحفظ ضروری ہے اسی طریقہ سے اپنی جان و مال اور اپنی عزت و آبرو کا تحفظ ضروری ہے اور علمائے امت کے لئے ان کا حل تلاش کرنا قرآن و سنت کی روشنی میں ایک اہم فریضہ ہے۔

لہذا ان اصول کے پیش نظر میرے نزدیک جس طرح بیمہ املاک کی گنجائش مخصوص حالات میں چند قیود و شرائط کے ساتھ دی جاسکتی ہے، اسی طریقہ سے مخصوص حالات و قیود و شرائط کے ساتھ بیمہ زندگی کی بھی اجازت دی جاسکتی ہے۔

اس کے بعد جناب مولانا سید مصطفیٰ رفاعی ندوی بنگلور نے اپنا مقالہ پیش فرمایا یہ مقالہ علیحدہ سے شریک اشاعت ہے۔  
مفتی عبدالرحمن صاحب بنگلہ دیش:

انشورنس، ہندوستان کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ضروریات ہو یا حاجت، انشورنس کے جواز کے سلسلہ میں میں سمجھتا ہوں کہ کبھی کلام نہیں، اگر ضرورت یا حاجت اس

انشورنس کے ذریعہ پوری ہو جاتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ سبھی حضرات ضرورت پوری ہونے کی صورت میں جائز کہیں گے، میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ انشورنس کرانے سے ہماری ضرورت کیسے پوری ہو جاتی ہے۔

انشورنس اقتصادی دنیا میں ایک ادارہ ہے، بینکنگ سسٹم جیسا مالیاتی ادارہ ہے، لیکن شاید آپ کو اور ہم کو نظر نہیں آتا کہ جس طرح بینک کاری کرنے والوں نے صاحب الکلام ایجنٹوں کو مقرر کر رکھا ہے کہ گاؤں گاؤں اور اطراف و اکناف میں جا کر لوگوں کو اس کی طرف مائل کریں، اسی طرح انشورنس کمپنیوں نے بھی ایجنٹ مقرر کر رکھا ہے، انشورنس کمپنیز جس خوب صورت انداز میں اخبارات، جرائد و رسائل میں پبلسٹی کرتی ہیں، لیکن کیا حقیقت ایسے ہی ہے کہ ہماری معلومات کے مطابق انشورنس کی دنیا کو تو بالکل ”اندر گراؤنڈ“ کر رکھا ہے کسی کو معلوم نہیں، ان لوگوں کا مقصد کیا ہے؟

اس وقت پوری دنیا کے انشورنس کا نظام یہودی لابی کے تحت ہے، یہی وجہ ہے کہ آج انشورنس کرنے کے لئے (PREMIUM) کیا جاتا ہے، مگر جس وقت ضرورت پڑتی ہے کتنوں کو ملتا ہے، فرض کر لیں کہ دس لاکھ مسلمانوں نے انشورنس کرایا، ایک ایک لاکھ روپے کا، تو پانچ ارب روپے کا انشورنس ہوگا، سالانہ ڈھائی کروڑ اس کا سود آئے گا، لیکن جس وقت خدا نخواستہ ایسا کوئی حادثہ پیش آجائے گا انشورنس کمپنی کا دروازہ کھٹکھٹائے، تو کتنوں کو ملے گا، اور ملنے میں کتنی تکلیف ہوگی دارالعلوم دیوبند کے پچھلے اجتماع فقہیہ کے موقع پر جب یہ مسئلہ سامنے آیا تو ہم نے بنگلہ دیش جا کر ساری انشورنس کمپنیوں سے پوچھا، مگر تعجب یہ ہے کہ ساری کمپنیوں کے مالکان نے یہ کہا کہ یہ ہماری کمپنی کا مسئلہ ہے، ہم آپ سے نہیں کہہ سکتے، پوری رازداری کے ساتھ یہ کام کر رہے ہیں، ہم لوگ انشورنس کرانے والے نہیں، جن حضرات نے انشورنس کرایا ہے جب ضرورت کے وقت ان لوگوں نے انشورنس کمپنی کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے تو ان کو کتنا ملا ہے ذرا تحقیق کر لیں؟ انشورنس کے ذریعہ سے اگر ہمارا یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو انشورنس کرانے کی اجازت ہوگی، جان کا بھی اور مال کا بھی، لیکن میرے خیال سے اس مسئلہ میں مزید سوچنے کی ضرورت ہے۔

### مولانا زبیر احمد قاسمی:

یہ بات تقریباً مسلمہ بن چکی ہے کہ انشورنس اپنی اصلیت کے اعتبار سے ربوہ قمار اور ”تعاون علی الإثم“ کی بنیاد پر حرام ہے، بحث اس کی اجازت کا ہے مخصوص صورت حال میں، میں نے غور کیا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ ہمارے فقہاء نے ”انما الاعمال بالنیات“، الامور بمقاصد ہا، دفع ضرر جلب منفعت پر مقدم ہوگا، یہ اور اس طرح کے دیگر اصول وضع کئے ہیں، قرآن و سنت کی روشنی میں ایک اصول یہ بھی ملتا ہے کہ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جنہیں اگر ہم بالقصد کرنا چاہیں تو شریعت اجازت نہیں دے گی، اگر ہم کوئی دوسرا عمل مخصوص بنائیں اور اس ضمن میں دوسرا کام کریں تو شریعت کہتی ہے کہ اسے گوارا کر لیا جائے، اس کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔

ایک نظیر میں پیش کرتا ہوں، مشہور مسئلہ ہے، اگر دو نابالغ بچے کسی کی ملکیت میں جمع ہو جائیں تو ان دونوں بچوں کو الگ الگ ملکیت میں منتقل کرنا درست نہیں ہے، محض اس نیت سے کہ یہ دونوں الگ الگ ہو جائیں، حدیث میں اس کا واقعہ موجود ہے، ”حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حضور اکرم ﷺ نے دو غلام دیئے، دونوں بچے تھے انہوں نے ایک غلام کو فروخت کر دیا۔ حضور ﷺ نے حضرت علیؑ سے فرمایا، واپس کرو، واپس کرو“۔ ہمارے فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر یہ دونوں غلام نابالغ ہیں، اگر ان دونوں کے درمیان تفریق اصالتہ نہ ہو، بلکہ اپنے اوپر کسی واجب کی ادائیگی کے ارادے سے ایسا کوئی کام کرے کہ اس کے ضمن میں دونوں میں تفریق ہو جائے تو اس عمل کو گوارا کر لیا جائے گا۔

میرا خیال یہ ہے کہ انشورنس کا معاملہ اولاً عقد کفالت ہے، گویا کمپنی معاہدہ کرتی ہے اور وہ یہ ذمہ داری لیتی ہے کہ آپ اتنی رقم دیں تو میں آپ کی جان، یا املاک کی حفاظت کروں گا تو اگر ہم اسے عقد کفالت مانتے ہیں تو دو باتیں ہیں، ایک مکفول بہ کا مقدور التسلیم ہونا اور ایک مکفول بہ کا غیر مقدور التسلیم ہونا، ظاہر بات ہے کہ جس کی تسلیم پر ہمیں قدرت نہ ہو اس کا التزام شرعاً درست نہیں ہوتا، تو اگر ہم انشورنس کا معاملہ کرتے ہیں تو پہلے ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ کفالت

جس کے مکفول بہ کا مقدر و التسلیم ہونا ضروری ہے اس شکل میں متحقق ہے یا نہیں؟ حال کے یا اس کے پہلے کے بزرگوں کے سامنے جب یہ سوال ابھرا کہ اس کی حرمت پر یقین کرنے کے باوجود انشورنس کی اجازت دی جائے یا نہیں؟ میرا خیال یہ کہ یہ مسئلہ اسی لئے ابھرا کہ فسادات کی وجہ سے مسلمانوں کی جان و املاک محفوظ نہیں ہیں، اور دن بہ دن ملک کے حالات بگڑتے جا رہے ہیں، آج بھی لوگوں کے سامنے یہ سوال بڑی شدت سے ابھر رہا ہے، بنیادی وجہ اور محرک وہی ہے، میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ فسادات کے اندر جو مسلمانوں کی جان و املاک کی بربادی خطرے کی زد میں ہو یا متوقع ہو یا یقینی ہو، جو بھی مانا جائے اس کی حفاظت کی کسی نہ کسی درجہ میں ان کمپنیوں کو قدرت حاصل ہے، جیسا کہ میں نے سنا کہ عموماً فسادات کے موقع پر یہ کمپنیاں انشورڈ دکانوں اور گاڑیوں کو نامزد کر دیتی ہیں، اس طرح سے ان کی حفاظت کی سبیل نکل آتی ہے تو فسادات کے موقع پر متوقع یا یقینی طور پر اس کی حفاظت کسی نہ کسی درجے کے اندر تحت القدرہ ہے، اس لئے مکفول بہ کے مقدر و التسلیم ہونے کی بنیاد پر اولاً کفالت صحیح اور مشروع کا ہم اپنے کو مرتکب کہیں گے، یہ الگ بات ہے کہ ضمنی طور پر اس کے اندر ربوا، قمار وغیرہ کا تلوث ہو جائے گا، اس بنیاد پر میری رائے یہی ہے کہ زمانہ کی روش کے اعتبار سے ان فسادات میں جان و مال کی حفاظت کی نیت سے بیمہ کرانے کی چاہے جان کا ہو، مال کا ہو، اجازت دی جاسکتی ہے، اور لوگوں کو یہ مسئلہ بتا دیا جائے کہ اگر فسادات کے اندر جان و مال کی ہلاکت و بربادی ہو تو اس صورت میں کمپنی کی طرف سے جو زائد رقم ملے اسے کمپنی کے اپنے عہد تحفظ کی ناکامی کی بنا پر ہر جانہ یا نقصان کے معاوضہ کے طور پر وہ پوری رقم لے سکتا ہے، اس کے علاوہ اگر ہم نے بیمہ پالیسی خریدی اپنے شرط کے مطابق صرف فسادات سے بچنے کے لئے، ہمارے جان و مال کی بربادی اتفاقاً ہوگئی، اتفاقی حادثات جو قدرتی طور پر ظہور پذیر ہوا کرتے ہیں اس میں کسی کی بھی حفاظت کسی پر بھی واجب نہیں ہے، اس لئے میں اس کے لئے بیمہ کرانے کی اجازت نہیں دیتا، اس موقع پر اگر وقتی حادثہ کے نتیجے میں جان و مال کی ہلاکت ہو تو کمپنی اپنے اصول کے مطابق جان و مال کے

ضمان کے طور پر رقم ادا کرتی ہے تو اس صورت میں زیادہ سے زیادہ جمع شدہ رقم لے سکتا ہے زائد نہیں لے سکتا۔

مولانا نظام الدین مبارکپور:

گفتگو یہ چل رہی تھی کہ ضرورت شدیدہ کی وجہ سے عصر حاضر میں بیمہ کرانا جائز ہے یا نہیں؟ ندوہ کی ”مجلس تحقیقات شرعیہ“ نے ضرورت شدیدہ کی بنا پر اس کے جواز کا فتویٰ بہت پہلے صادر کر دیا ہے، عصر حاضر میں بیمہ یا انشورنس کرانے کے لئے ضرورت شدیدہ کا تحقق ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ بجائے خود قابل غور ہے، لیکن اگر یہ ضرورت متحقق نہ ہو تو بھی دو وجہ سے میرے نزدیک بیمہ کرانا جائز اور مشروع ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ حکومت ہند نے ہماری جان، ہمارے مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے اور اس کے لئے وہ ہم سے مختلف طریقوں سے ٹیکس بھی وصول کرتی ہے، فسادات کی صورت میں وہ ہماری جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت نہیں کر پاتی ہے تو اس پر ہمارا معاوضہ قائم ہو جاتا ہے، اور اپنے حق کی مقدار اس سے لینے کا ہمیں اختیار ہو جاتا ہے، فقہاء نے ”کتاب الصدقہ“ اور ”کتاب الحجر“ میں صراحت کی ہے، اگر دوسرے کے اوپر اپنا حق عائد ہوتا ہو اور اس سے ملنے کی امید نہ ہو تو ایسی صورت میں صاحب حق کو یہ اجازت دی جاتی ہے کہ جس کے اوپر اس کا حق عائد ہو رہا ہو وہ اپنے حق کی مقدار اس سے وصول کرے، خواہ اپنے حق کی جنس کا وہ مال ہو، یا غیر جنس سے، بہر حال یہ جائز اور درست ہے، یہی مفتی بہ قول ہے۔

جواز کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جن غیر مسلموں کی یہاں حکومت ہے ان کا مال ہمارے لئے مباح ہے اس کی وضاحت کے لئے میں تین مقدمات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

پہلا مقدمہ تو یہ ہے کہ مال مباح میں ربوا، سود کا تحقق نہیں ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مال مباح کو بغیر کسی کی رضا اور اجازت کے لینا جائز اور درست ہے تو عقد کے ذریعہ خواہ وہ عقد فاسد ہو، اس کا حصول بدرجہ اولیٰ جائز اور درست ہوگا، کیونکہ عقد کی صورت میں یہاں



دوسرے فریق کی رضا اور اجازت بھی پائی جاتی ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کا تمام مباح اموال کے بارے میں ارشاد ہے:

”هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا“ (سورۃ بقرہ: ۲۹)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

”قُلْ لَا أَجِدُ فِيْمَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحْرَمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مِيتَةً

أَوْ دَمًا مَسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ“ (سورۃ انعام: ۱۴۶)۔

شامی میں ہے:

ومن شرائطه عصمة البدلين وكونهما مضمونين بالتالاف“

اس سے معلوم ہوا کہ ربا کا تحقق اسی مال میں ہوگا جو مباح نہ ہو، اور جو مال مباح ہو، جس کا لینا یوں ہی جائز ہے اگر وہ عقد کی صورت میں کسی کی رضا سے ملے تو بہ درجہ اولیٰ جائز ہوگا۔ دوسرا مقدمہ: حربی کا فرکا اور حربی حکومت کا مال مباح ہے حلال ہے، چنانچہ کتاب و سنت کی بہت سی نصوص اس پر شاہد ہیں، مثلاً ”صحیح مسلم شریف“ کی ایک صریح حدیث ہے:

”أمرت أن أقاتل الناس حتى يقولوا لا إله إلا الله، فإذا قالوها عصموا مني أموالهم ودمائهم“۔

اس حدیث سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جو کافر حربی ہوتا ہے اس وقت تک اس کا مال ہمارے لئے مباح اور حلال ہے جب تک وہ حربی رہے۔

تیسرا مقدمہ: حربی کا معنی ہے لڑائی کرنا اور اصطلاح شریعت میں حربی وہ کافر ہے جو مسلمان سے لڑے اور انہیں کافروں سے مسلمانوں کو مختلف آیات میں جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے، مثال کے طور پر ایک جگہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا قرآن میں حکیم میں ارشاد ہے:

”وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً“ (سورۃ توبہ: ۳۶)۔

یہ دسویں پارہ کی آیت ہے، ترجمہ اس کا یہ ہے کہ سب مسلمان مشرکوں سے لڑیں، جیسا کہ سب کفار تم سے، یعنی مسلمانوں سے لڑتے ہیں:

تفسیر خازن میں ہے:

”قاتلو المشركين بأجمعكم مجتمعين على كتابهم وأنهم يقاتلونكم

بهذه الصفة“۔

کسی بھی ملک یا ریاست کے تمام مشرک مسلمانوں سے نہیں لڑتے، خاص نزول آیت کے زمانے میں بھی سارے مشرک مسلمانوں سے نہیں لڑتے تھے، بلکہ کچھ تو بالفعل، یعنی عملاً لڑتے تھے کچھ دامن، سخن مدد کرتے تھے، اور جو لوگ یہ کچھ نہیں کر پاتے وہ کم سے کم اس پر راضی اور خوش ضرور رہتے، تو فعل قتل، تعاون اور رضائیں چیزیں ہوئیں، انہیں تینوں چیزوں کی وجہ سے سب کفار کی طرف قتال کی نسبت کی گئی، دیار ہند کے کفار کا بھی یہی حال ہے کہ ان کا ایک طبقہ دستور کو پامال کر کے اور قانون کو توڑ کر کے مسلمانوں سے بالفعل لڑتا ہے، دوسرا طبقہ مال و منال اور تقریر و تحریر کے ذریعے ان کا خوب خوب تعاون کرتا ہے اور تیسرا طبقہ اس پر راضی اور خوش ضرور رہتا ہے، تعاون و رضا کی بالکل کھلی ہوئی دلیل جو ہماری نگاہوں کے سامنے ہے، شیلانیا کے چندے میں عام مشرکین ہند و بیرون ہند کی شمولیت ہے، اس لئے یہاں کے کفار حربی ہیں، غالباً کچھ ایسے ہی وجوہ تھے جن کے پیش نظر حضرت ملا جیون علیہ الرحمۃ نے حضرت عالمگیر اورنگ زیب کے عہد کے کفار کے متعلق اپنی مائتہ ناز تفسیر ”تفسیرات احمدیہ“ میں اس زمانہ میں ارشاد فرمایا تھا:

”وان هم الاحزابيون وما يعقلها الا العالمون“۔

یہ تو یہاں کے کفار کا حال ہے حکومت بھی اس لڑائی میں تینوں طریقے سے شریک ہے، کہیں تو خود اس کی فوج ناسخ لڑتی ہے، جیسا کہ اس کے کثیر شواہد ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں اور پی۔ اے۔ سی تو اسی مقصد کے لئے تعینات کی جاتی ہے، کہیں فورس کی موجودگی میں یہ بے خوف ہو کر فساد برپا کرتے ہیں اور فورس دفاع کرنے والوں سے ان کا تحفظ کرتی ہے، یہ کھلی ہوئی اعانت کی دلیل ہے اور اگر کہیں یہ کچھ بھی نہ ہو تو کم سے کم بہت سے فساد یوں کو قید و بند کی سزاؤں سے آزاد رکھ کر حکومت اپنی رضا مندی کا ثبوت ضرور فراہم کر دیتی ہے، اور یہ سب کچھ مسلم

ممبران، وزراء، اور گورنروں کے علم میں، بلکہ مشاہدہ میں ہوتا ہے، جو برائے نام حکومت میں شریک ہیں، مگر ان کی مجبوری اور بے بسی کا عالم یہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے اور اس معاملہ میں جنبش نہیں کر سکتے تو بوجہ تعاون و قتال فی الدین، حکومت خالص حریبوں کی ہے جن کا مال مباح ہے، جب حکومت اپنی رضا مندی سے اپنا مباح مال دیتی ہے تو اس کا لینا اور اپنے امور میں استعمال کرنا جائز اور درست ہے۔

ہم سود کو یقیناً حرام کہتے ہیں، سود حرام قطعی ہے، نص قطعی سے اس کی حرمت ثابت ہے۔ لیکن ہم سود کو جائز نہیں کہہ رہے ہیں، لیکن جو مال ہمیں یہاں کی حکومت سے انشورنس کے ذریعہ مل رہا ہے وہ جائز مال ہے، وہ مال ہمارا حق بھی ہے، جیسا کہ پہلی دلیل سے معلوم ہوا، اور وہ مال مباح بھی ہے، جیسا کہ ابھی دوسری والی دلیل سے ثابت ہوا، لہذا جو مال اپنا حق ہو، نیز مباح ہو وہ کبھی سود نہیں ہوا کرتا، اس لئے وہ مال بلاشبہ جائز اور درست ہے اور ضرورت شدیدہ، بلکہ سرے سے ضرورت ہی نہ ہو اس وقت بھی جو کچھ انشورنس کے ذریعہ نقد کی صورت میں حکومت کی طرف سے ملتا ہے اس کا لینا ہمارے نزدیک اس وجہ سے جائز اور درست ہے، ایک تو وہ ہمارا حق ہے، دوسرے یہ کہ وہ مال مباح ہے، ہاں اس میں قمار کا تحقق ضرور ہے کہ وہ صورت کے لحاظ سے جو ہے، اس میں ایک احتمال ہے کہ اگر تین سال سے پہلے قسط جمع ہونا بند ہو جائے اور انشورنس کی جو دوسری قسمیں ہیں، مثلاً جانوں کا بیمہ اور گاڑی دکان کا بیمہ تو اس میں یہ ہے کہ اگر سال بھر کے اندر کوئی حادثہ نہ ہوا ہو تو جمع کردہ رقم سوخت ہو جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر قسمت نے ساتھ دیا، اس کی گاڑی، یا دکان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا یا تین سال تک مستقل قسط جمع نہیں کر سکا تو ایسی صورت میں بھی جو ہے، ہار جائے گا، اور اگر اس نے سب کچھ کر لیا اور اس کی دکان یا گاڑی کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا تو جیتا گیا، تو اگر حالات ایسے ہوں کہ جن کی روشنی میں انسان کو یہ ظن غالب ہو کہ اگر ان حالات میں ہیں، دکان یا اموال کا بیمہ کراتا ہوں تو ایسی صورت میں جیت ہماری ہی ہوگی، بازی میں ہی مار لے جاؤں گا یا کم سے کم آدمی کو یہ اندازہ ہو کہ اگر کچھ نہیں ہوا تو میں زبردستی اپنی گاڑی کا حادثہ کرا دوں گا، اور زندگی کے بیمہ کی صورت میں آدمی کو اپنی مالی

پوزیشن کے پیش نظر یہ گمان غالب ہو کہ انشاء اللہ العزیز تین سال تک مستقل قسط ادا کر دوں گا اور اس درمیان ہماری قسط بند نہیں ہو پائے گی، تو ان صورتوں میں یقیناً مسلمان ہی کی جیت ہوگی اور حربی کافر سے ہر معاملہ چاہے وہ قمار کی شکل میں ہو، اور اس میں نفع اس کو ملے اور جیت اس کی ہو، وہ جائز اور درست ہے، یہ صراحت ”الشرح الصغیر“ میں حضرت امام محمدؒ اور دیگر ائمہ سے منقول ہے، فقہ کی کتب معتمد میں بھی اس کی صراحت ملتی ہے، تو ہماری اب تک کی گفتگو کا حاصل یہ ہوا کہ خواہ آج کے زمانے میں جنرل انشورنس کی گفتگو کرتا ہوں، اس کے لئے ضرورت شدیدہ پائی جائے، یا ضرورت شدیدہ نہ پائی جائے بہر صورت ایک شرط کے ساتھ انشورنس جائز ہے، شرط صرف یہ ہے، یہ شکلاً اور صورۃً قمار ہے، وہ شرط یہ ہے کہ اگر مسلمان کو قرآن اور حالات کی وجہ سے اپنی مالی آمدنی پر توقع کے لحاظ سے یہ ظن غالب ہو کہ اس میں نفع مجھ ہی کو حاصل ہوگا، نفع یاب میں ہی رہوں گا اور میری جمع کردہ رقم سوخت نہیں ہوگی، تو ایسی صورت میں جنرل انشورنس کرانا جائز اور درست ہے، اس میں قطعاً نہ تو ربوا ہے اور نہ سود ہے، ربوا اور سود نہ ہونے کی وجہ یہی ہے کہ ربوا اور سود ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مال معصوم اور محظور ہو، اور یہ مال معصوم اور محظور نہیں، دوسرے اس لئے کہ وہ مال ہمارا حق ہے اور آدمی اپنا حق وصول کرے تو اس میں ربوا اور سود کے تحقق کا کیا سوال، یہ میری رائے ہے اور سوچی سمجھی ہوئی رائے ہے۔

مولانا سعود عالم قاسمی:

بیمہ کے متعلق جو باتیں ہو رہی ہیں اس میں میرا خیال یہ ہے کہ کچھ باتیں ایسی ہیں جن کے اوپر ہمیں از سر نو غور کرنا چاہئے، مثلاً بیمہ اپنی اصلی حیثیت سے اور اپنی شروعات کے اعتبار سے کوئی کاروبار، کوئی تجارت نہیں، یا کوئی قمار یا کوئی سودی کاروبار نہیں، بلکہ تعاون کی شکل ہے، بڑی اچھی بات ابھی ایک صاحب نے کہی تھی اور جسے ہمارے بعض مورخوں نے بھی لکھا ہے کہ بیمہ کی شروعات تو مسلمانوں نے ہی کی تھی، ظاہر ہے کہ جس وقت اس کی شروعات کی گئی اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ برطانیہ اور دوسری جگہوں پر اس کی شروعات ہوئی، لیکن کچھ قوی اشارے ایسے

ملتے ہیں کہ مسلمانوں ہی نے اس کی شروعات کی تھی، اگر یہ بات مان لی جائے تو پھر مسلمانوں سے یہ توقع کرنا کہ انھوں نے قمار اور ربوا کی بنیاد پر اسے شروع کیا ہوگا، بڑی مشکل بات معلوم ہوتی ہے، انھوں نے جب یہ دیکھا کہ جہاز ڈوب جاتا ہے، حادثات پیش آتے ہیں تو تعاون باہمی کی ایک شکل انھوں نے یہ نکالی اور یہ شکل آگے بڑھتے بڑھتے وہاں تک پہنچی جو آج ہمارے سامنے ہے، تو اپنی بنیاد اور اصل کے اعتبار سے بیمہ تعاون باہمی کی ایک شکل ہے، سود، یا قمار، یا جوئے وغیرہ کا ادارہ نہیں ہے، جیسا کہ بعض حضرات سمجھتے ہیں، اصل میں مالیات کے جو اہم اہم ادارے ہوتے ہیں وہ بنیادی طور پر حکومت اور اس کی پالیسیوں سے وابستہ ہوتے ہیں، بد قسمتی تو یہ ہے کہ اس وقت جو پورا عالمی معاشی نظام ہے اور خاص کر ہندوستان میں جو نظام ہے، بنیادی طور پر کافرانہ، مشرکانہ نظام ہے، بد قسمتی سے جس کے تحت مسلمان زندگی گزار رہے ہیں، بنیادی طور پر مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کافرانہ اور مشرکانہ نظام سے نجات پانے اور خلاصی حاصل کرنے کی کوشش کریں، لیکن اس وقت تک جب تک کہ یہ نظام ختم نہیں ہوتا، ہم یہ کوشش ضرور کریں کہ ہم اس نظام اور اس کے مفسدہ سے کس حد تک بچ سکتے ہیں، یہ دوسری کوشش ہے جو ہمیں کرنی چاہئے، لیکن ہمیں اپنی ان کوششوں کو جو بنیادی طور پر صحیح ہیں اور تعاون باہمی کے لئے شروع کی گئیں ان کو وہ رُخ دینے کی کوشش کرتے رہنا چاہئے۔

بعض حضرات نے یہ بات بڑے زور و شور سے کہی کہ یہ قمار ہے، دیکھئے آپ کبھی بھی کسی مسئلہ کو جو دورِ جدید میں پیدا ہوا، اگر آپ بہ نظر غائر دیکھیں تو اس کے بہت سے پہلو، بہت ساری چیزوں سے مل جاتے ہیں، اگر آپ اس کو اس پہلو سے نہ دیکھیں، بلکہ اس کو صرف اخلاقی اور دینی تناظر میں دیکھیں تو آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ قمار اور بیمہ میں بنیادی فرق ہے، قمار کا جو جذبہ ہے اور اس کا جو محرک ہے وہ دراصل یہ ہے کہ ایک انسان یہ چاہتا ہے کہ بغیر وقت لگائے ہوئے بغیر محنت کئے ہوئے کچھ پیسہ حاصل کر لے، اس سے سوسائٹی کے اندر ایک اخلاقی دیوالیہ پن،

عیاری، کاہلی، نااہلی اور اس طرح کے وہ تمام امراض پیدا ہوتے ہیں جو سوسائٹی کو تباہ کر دینے کے لئے کافی ہیں، بنیادی طور پر جوئے کا محرک یہ ہے، بیمہ آدمی اس لئے نہیں کراتا ہے کہ وہ آسانی سے رقم حاصل کرنا چاہتا ہے، بلکہ بیمہ آدمی خطرات سے بچنے کے لئے کراتا ہے، جوئے میں یہ ہے کہ ایک عیار فرد ہے وہ جو اٹھتا ہے، اگر وہ جوئے میں پیسہ نہ لگائے تو اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے، کوئی رسک نہیں ہے، لیکن وہ آدمی جو بیمہ کراتا ہے، اس کے لئے رسک موجود ہے، گاڑی ٹکرا سکتی ہے، اور بیمہ اس لئے کراتا ہے کہ اس حادثہ کے نتیجہ سے اسے کچھ راحت مل جائے، اس لئے یہ کہہ دینا کہ یہ جو ہے میں اسے صحیح نہیں سمجھتا، ہمارے محترم مولانا برہان الدین صاحب سنہجلی نے اس سلسلہ میں ایک بڑی اچھی بات کہی تھی قرآن کریم کی آیت میں ذکر کئے گئے لفظ ”خمر“ اور ”میسر“ کے بارے میں اگر آپ بالکل تاریخی انداز میں دیکھیں، جو اعلیٰ کی کتاب ”القمار قبل الاسلام“ مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب ”سیرت نبوی“ یا دوسرے مورخین و مفسرین نے جو کچھ اس سلسلہ میں لکھا ہے اسے آپ دیکھیں، بنیادی طور پر شراب (خمر) اور جو (القمار) ان کی قومی زندگی کے دوام الخباثت تھے، خمر اور میسر، اس کے ساتھ ساتھ بنیادی طور پر اس کا محرک عیاشی تھی، جو لوگ مالدار تھے وہ یہ کرتے تھے کہ وہ شراب پیتے تھے اور پھر جو اٹھتے تھے، ایک ایک آدمی جوئے میں دس اونٹ، بیس بیس اونٹ، سیکڑوں اونٹ جیتتا تھا، تو جیتنے والا اپنی شان کو بڑھانے کے لئے یہ کرتا تھا کہ اونٹوں کو کٹوا دیتا تھا اور گوشت تقسیم کر دیتا تھا، بنیادی طور پر اس کا محرک جس کو قرآن نے کہا ہے، ”إِنَّهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا“ (سورہ بقرہ: ۲۱۹) ”وَمَنَافِعِ لِلنَّاسِ“ (ایضاً) اس کا محرک جذبہ تعاون نہیں تھا، تاریخ میں کہیں نہیں لکھا ہوا ہے، یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں دیا جاسکتا، اصل میں جو تقاضہ تھا وہ عیاری اور عیاشی اور فحاشی تھی، اس کے ساتھ ساتھ یہ چیزیں ضمنی طور پر لازم تھیں، جس کو قرآن نے کہا ہے کہ جس چیز کا آڑ لے رہے ہو تم کو ضمنی تعاون سمجھ کر سب کچھ کرتے رہنا چاہئے، یہ درست نہیں ہے۔

بیمہ کے اندر یہ جذبہ نہیں ہے، بنیادی طور پر بیمہ اس لئے نہیں کرایا جاتا ہے کہ آدمی

عیاشی کر رہا ہے اور لغویات میں مبتلا ہے، بلکہ بیمہ آدمی اس لئے کراتا ہے کہ ایک خطرہ اس کے اوپر منڈلاتا ہے، اس خطرے سے تحفظ حاصل ہوگا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ میری رائے ہے، بلکہ میرے ذہن میں ایک احساس ہے، ایک تاثر ہے جو پیدا ہو رہا ہے جسے میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

بیمہ کے اندر دوسرے کاروباری ادارے کی طرح سودسراہت کیا ہوا ہے، لیکن ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا کچھ شکلیں ایسی بھی ہیں جن میں سود نہیں پایا جاتا ہے، اگر ساری شکلوں میں سود پایا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ کوئی مسلمان سود کو برداشت نہیں کر سکتا، لیکن جو حالات ہمارے زمانے میں پائے جاتے ہیں اگر آپ آزادی سے لے کر اب تک کے فسادات کی حکمت عملی کا اندازہ لگائیں، یہ وہ حالات ہیں جن کو قومی اضطراب کا نام دیا جاسکتا ہے، یہ بات حقیقت ہے کہ بنیادی طور پر فسادات سے متاثر نچلا طبقہ ہوتا ہے، بنیادی طور پر فساد کا منصوبہ ان لوگوں کے خلاف ہوتا ہے جو کاروباری ہیں، سرمایہ کار ہیں، یہی وجہ ہے کہ جتنے فسادات ہوئے ان مقامات پر ہوئے جہاں مسلمانوں کی صنعتیں تھیں، جہاں مسلمانوں کے کارخانے اور فیکٹریاں تھیں، ریلوں میں سفر کرنے والے غریب ہی نہیں غریب تر ہوتے ہیں، متوسط درجے کے لوگ ہوتے ہیں، پچھلے سال ہمارے علی گڑھ میں جو فسادات ہوئے، تقریباً دو سو افراد ڈریبنوں سے کھینچ کر مارے گئے، مگر اس کے باوجود آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ بیمہ کرانے والے جو لوگ ہوتے ہیں وہ فساد سے متاثر ہی نہیں ہوتے، یہ بات صحیح نہیں ہے، ہندوؤں کے علاقے میں جو مسلمان گھر جاتے ہیں، اس میں ہلاک ہونے والے اکثر مزدور ہی نہیں ہوتے، بلکہ وہ مسلمان ہوتے ہیں اور ان کا زیادہ تر نشانہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو دولت مند اور صاحب سرمایہ ہوتے ہیں، اگر آپ فسادات کی حکمت عملی پر غور کریں، جیسا کہ صبح کو بعض بزرگوں نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا تھا، تو آپ دیکھیں گے کہ منصوبہ بند طریقے سے مسلمانوں کو بے اثر اور بے سہارا کرنے کے ساتھ فسادات کی وجہ سے ان کو معاشی فلاحی میں مبتلا کیا جائے تاکہ یہ دینی اور دنیوی ترقی کرنے کا خواب ہندوستان میں نہ

دیکھ سکیں، ایسے حالات میں اگر آپ اضطرار کو محسوس کر لیں اور اسے قابل گوارا بات سمجھیں تو میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس میں بہت زیادہ حرج نہیں ہے کہ انشورنس کو بعض شرائط کے ساتھ ان مخصوص حالات میں اختیار کر لیں۔

مولانا سید نظام الدین صاحب:

انشورنس اصل میں منافع کا کاروبار ہے، اس میں باہمی تعاون اور ہمدردی کا پہلو برائے نام ہے، میں نے ایک انشورنس کمپنی کے ذمہ دار سے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ سب سے بڑا منافع کا کاروبار ہے، بینکنگ سے بھی زیادہ اس میں نفع ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے کہا کہ اس میں تیس فی صد لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو پوری پالیسی جمع نہیں کرتے، درمیان ہی میں چھوڑ دیتے ہیں، اس طرح ان کی جمع کی ہوئی پوری رقم کمپنی کو بیچ جاتی ہے، اور ایسے افراد کی تعداد دس سے بیس فی صد تک ہے جن کے انشورڈ جان و مال کو خطرہ لاحق ہونے کی وجہ سے درمیان میں معاوضہ دینا پڑتا ہے، باقی بچاس فی صد تعداد ان لوگوں کی ہے جو پالیسی پوری کرتے ہیں تو اس میں بھی کمپنی کا غیر معمولی فائدہ ہے کہ مثلاً بیس تیس سال تک ان کی جمع کی ہوئی رقم سے کمائی کی اور فائدہ اٹھایا، اور اتنی مدت کے بعد انھیں مثلاً ڈیڑھ گونی رقم ادا کی جو اس سے حاصل شدہ آمدنی سے کم ہے۔

یہ فسادات بڑے مقصد کی خاطر ہے کہ پوری امت کو خوف و دہشت کی حالت میں رکھا جائے کہ وہ نہ ترقی کر سکے، نہ دوسری جانب توجہ کر سکے، یہ بالکل موہوم خیال ہے کہ انشورنس کرانے سے فسادات رک جائیں گے، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ کبھی کبھی یہ چیز بجائے مفید ہونے کے نقصان دہ ہوتی ہے، ہزاری باغ کا ایک مسلم محلہ ۲۳ مکانات پر مشتمل جو ہندوؤں کے درمیان تھا جلا دیا گیا اور یہ خیر مشہور کر دی گئی کہ یہ پورا محلہ انشورڈ تھا، مسلمانوں نے کمپنی سے معاوضہ حاصل کرنے کے لئے خود ہی جلا دیا ہے، اخبارات میں بھی یہ پروپیگنڈہ کیا گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گیارہ ماہ تک سرکاری امداد بند رہی، پھر یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہئے کہ دکان و املاک کی جو



اصل قیمت و مالیت ہوتی ہے اس کو ظاہر کر کے انشورنس نہیں کر سکتے، ورنہ سرکار اسی دن سے انکم ٹیکس وصول کرنی شروع کر دے گی، اس لئے لوگ اپنی املاک کو انشورڈ کراتے وقت اصل مالیت سے بہت کم مالیت ظاہر کرتے ہیں، مثلاً دس لاکھ کی دکان ہے تو دو لاکھ کا انشورنس کرایا تو ظاہر ہے کہ دس لاکھ کی دکان اگر فساد کی نذر ہو جائے تو مالک کے نقصان کی تلافی اس سے نہیں ہوگی، ہاں سیمینار میں اس کی اجازت دے دی جائے تو اس سے کمپنیوں کو فائدہ ہوگا اور ایک باطل نظام کو جو سود اور قمار پر مشتمل ہے تقویت ملے گی، اس لئے میری رائے یہ ہے کہ لائف انشورنس کی کسی حال میں اجازت نہ دی جائے، مسلمانوں کا ایمان تو اس پر ہے کہ موت و حیات کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے، بیمہ جان کی اجازت سے ان کا ایمان متاثر ہوگا، سماجی تعلقات و معاملات میں فرق آئے گا، اس لئے لائف انشورنس کے جواز کے حق میں نہیں ہوں، ہاں املاک وغیرہ کے بیمہ کی ضرورتاً اجازت دی جاسکتی ہے کہ مبتلی بہ اپنی حالت کو سامنے رکھ کر علماء سے مشورہ کر کے فیصلہ کرے۔

مولانا محمد سجاد لکھنوی:

پہلی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ موضوع بہت متعین اور محدود ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں خصوصاً منظم فسادات کی صورت حال کے پیش نظر کیا مسلمانوں کے لئے شرعاً انشورنس کرانے کی اجازت ہے، یعنی جواب بھی سوال کے دائرے میں محدود رہنا چاہئے، یہ زیادہ بہتر ہے، لیکن چونکہ چند اور باتیں بھی اس ضمن میں اٹھائی گئی ہیں جن کے بارے میں مختصر مختصر اشارے مفید ہیں۔

جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ انشورنس کی بنیاد تعاون پر ہے، انشورنس کی تاریخ پر جتنا بھی لکھا گیا ہے یا جس حد تک ہم لوگوں کا مطالعہ ہے، سب سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کی شروعات تو تعاون کی بنیاد پر ہوئی تھی، لیکن یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ بہت جلد وہ تعاونی انشورنس تاجرانہ اور کمرشیل بزنس میں تبدیل ہو گیا، اور صرف یہی نہیں، بلکہ یہودیوں نے اپنی

شاہراہ منظم اور منصوبہ بند کوششوں کے نتیجے میں اور ہماری مسلسل غفلت کے نتیجے میں دنیا کے سیاسی اور اقتصادی نظام پر سونی صدر گرفت حاصل کر لی ہے، انہوں نے انشورنس کے بین الاقوامی نظام پر تقریباً سو فیصد گرفت اور تسلط حاصل کر لیا ہے، صرف (۱۹۸۳ء، ۱۹۸۴ء) میں اسٹیٹ امریکا کی جو آمدنی انشورنس کے نتیجے میں ہوئی وہ صرف امریکہ جیسے ایک ملک میں انشورنس کی چند کمپنیوں کے اعداد و شمار کے مطابق چھیا سٹھ کھرب ڈالر تھی۔ جو لوگ انشورنس کی تاریخ سے، اس کے مقاصد سے اور اس کی جڑوں سے واقف ہیں وہ اس بات میں کوئی شک نہیں کر سکتے، دراصل یہودی لابی عرصہ ہائے دراز سے تمام دنیا کے نظام معیشت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس میں سے ایک مستحکم طریقہ انشورنس ہے، اس لئے اس کو خالص تعاونی اسکیم کہنا شاید زیادہ واقفیت پر مبنی نہیں ہے۔

ہندوستان کے موجودہ حالات میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں ۶۵ء میں ”مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ“ کی طرف سے جو تجویز منظور ہوئی تھی اس میں ہم اب تک اضافہ نہیں کر سکے، اس کا لب لباب بھی یہی تھا کہ عام حالات میں انشورنس ناجائز، ضرورت کی بنیاد پر کسی عالم دین کے مشورے سے انشورنس کی اسکیموں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

پس اب تک کی ان تمام افراد کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے جو اس بات سے متفق ہیں اور خود ہمارے مولانا مجاہد الاسلام قاسمی نے شروع ہی میں اسے ”مفروض عنہا“ کہہ چکے ہیں، یعنی یہ بات کہ انشورنس عام حالات میں حرام ہے، اسلامی شریعت کے ہم آہنگ نہیں ہے، یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے، اس کے بعد بات یہاں سے آگے بڑھانے کی ہدایت دی گئی کہ باوجود کے کہ یہ چیز ناجائز ہے موجودہ زمانہ کے ان حالات کے تناظر میں بار بار گفتگو کی گئی، اور جتنی گفتگو کی جائے گی کم ہے، بلاشبہ یہ فسادات اتفاقی حادثے نہیں ہیں، بلکہ یہ نسل کشی کی منظم کوششیں ہیں، اور ابھی مستقبل قریب میں اس کے ختم ہونے کی ظاہراً کوئی امید نہیں ہے، ان حالات کے تناظر میں انشورنس کے جواز کی بات کوئی نئی نہیں ہے، بلکہ ۶۵ء کے حوالے میں خود دے رہا ہوں، اس

لئے کہ بہت پہلے یہ ہمارے سامنے آ گیا، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ، حضرت مفتی مہدی حسن رحمہما اللہ کے زمانہ میں یہ ہمارے اکابر ہیں جو پہلے ہی اس کی اجازت دے چکے، اب ہمیں اس پر یہ غور کرنا چاہئے کہ کیا ہم اس کے ذریعہ مسلمانوں کو کوئی فائدہ پہنچا سکتے؟ اور مسلمانوں نے اس پر اب تک عمل کیوں نہیں کیا، اسکا بھی جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ جہاں اس پر عمل کیا گیا، کیا وہاں وہ نتائج نکلے جن کی اس وقت ان کو توقع تھی؟ اور جن کی اس وقت ہمیں توقع ہے؟ کبھی بھی اس بارے میں خوش گمان نہیں ہونا چاہئے کہ اگر ہم نے یہاں ایک فیصلہ کر لیا اور بہ فرض محال ہندوستانی مسلمانوں کے تمام حلقوں میں اس فیصلے کو قبول بھی کر لیا گیا، اور انشورنس کی اسکیموں میں اپنی پراپرٹی کو انشورڈ بھی کر لیا، تب بھی کیا برہمن ذہنیت دب جائے گی؟ تو بہ کر لے گی؟ خاموش ہو جائے گی، سہم جائے گی؟ اپنے رویے پر نظر ثانی کرے گی؟ جن لوگوں کو ان کے بارے میں براہ راست واقفیت ہے، وہ کبھی بھی اس خوش گمانی میں مبتلا نہیں ہوں گے، لکھنؤ کا ایک تازہ ترین تجربہ ہے، دو سال پہلے ایک صاحب کی تمباکو کی فیکٹری میں آگ لگ گئی، بہت بڑی فیکٹری ہے، انشورنس کی رقم حاصل کرنے میں، اس میں وہ کتنی رقم خرچ کر چکے ہیں، ان کا اپنا کہنا ہے کہ اگر ہم کوکل رقم مل گئی تو ہماری عزت بچ جائے گی، اس لئے کہ انشورنس کے جو محکمے ہیں، جو افسران وہاں بیٹھے ہیں، اولاً تو مسلمانوں کے کاروبار کو انشورڈ تسلیم کر لینا آسان کام نہیں ہے، اس کے بعد وہ اتنی شقیں نکالتے ہیں کہ پالیسی مسلمانوں کو نہ ملنے پائے، ان کا حق انھیں نہ مل سکے، پھر اس حق کو لینے کے لئے اس آدمی کو کیا کچھ کرنا پڑتا ہے اور کتنے لوگ ہیں جو اس حق کو وصول کر سکتے ہیں یہ بھی جاننے کی چیزیں ہیں، براہ راست ان سے واقفیت حاصل کرنی چاہئے، میں پھر کہہ دوں کہ مسئلہ جہاں تک خاص حالات کے تناظر میں اس کے جواز کا ہے اس میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے، مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ کیا ہماری توقعات صرف اسی سے وابستہ ہیں؟ اور کیا ہم صرف اس پر قناعت کر لیں؟ یہاں پر مجھے آپ حضرات سے کچھ عرض کرنا ہے۔

ایک آیت پر ہننے کی میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں، بغیر کسی طویل تشریح کے:

”وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ، فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ“ (سورۃ بقرہ: ۱۰۹، ۱۱۰)۔

مدنی دور کی یہ آیت ہے، کئی دور کی نہیں، نقشہ کھینچا گیا ہے اس آیت میں اس صورت حال کا کہ اہل کتاب کی ایک زبردست تعداد تمہارے اندر رتدا پھیلانے کی کوشش کر رہی ہے، آخری درجہ کی سازش تھی جو سیدنا محمد ﷺ کے اصحاب کے سینوں سے ایمان کی روشنی نکال لینے کے لئے کی جا رہی تھی، اس کے لئے جتنی بھی ممکن اسکیمیں تھیں، ان سب پر اس وقت عمل ہو رہا تھا، ان اسکیموں کے مقابلہ کے لئے قرآن مجید ہدایت دیتا ہے، اپنی اس مخصوص زبان میں جس کو دوست سمجھ سکیں دشمن نہ سمجھ سکیں، کہا گیا تھا ”فاعفوا واصفحوا حتی یأتی اللہ بأمرہ“ جب تک ہمارا گلا حکم نہ آئے ان کو نظر انداز کرتے رہو، یہ ایک خاص اسٹیبلر ہدایت تھی، ایک خاص مرحلہ وار حکمت عملی کی ہدایت تھی، ”حتی یأتی اللہ بأمرہ“ کہہ کر بتا دیا گیا کہ معاف کر دینے کا حکم دائمی نہیں، لیکن اس وقت ہم کیا کریں، واقیموا الصلوة و آتوا الزکوة، حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب نے اس کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔

یہ معاذ اللہ ان لوگوں سے نہیں کہا گیا جو نمازی نہیں تھے، جو زکوٰۃ نہیں دیا کرتے تھے، یہ ان سے کہا جا رہا ہے جن سے زیادہ نمازیں پڑھنے والے، زکوٰۃ اور صدقات دینے والے آسمان کی آنکھوں نے نہ کبھی دیکھے ہیں اور نہ کبھی آئندہ دیکھیں گے، لیکن یہ کیوں کہا گیا واقیموا الصلوة و آتوا الزکوة، ہمارے مسائل کا حل اقامتِ صلوة اور ایتائے زکوٰۃ ہے، اور ہمیں چاہئے کہ ہم اس اقامتِ صلوة اور ایتائے زکوٰۃ کی قرآنی اصطلاحات کی حقیقی وسعتوں کو سمجھیں ہم سمجھا سکیں کہ اقامتِ صلوة سے مراد حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ”الفوز الکبیر“ میں متعدد سطروں میں جو اشارہ کیا ہے کہ درحقیقت مسجد کے عنوان پر مسجد کے دائرہ میں نماز کو محور بنا کر انفرادی اور اجتماعی تربیت کا مکمل نظام ہے، اقامتِ صلوة جس کے ذریعہ سے کتنے کام لئے گئے، عہد نبوی میں اس زمانے کا تصور بھی نہیں تھا، اسی طرح ایتائے الزکوٰۃ، تعبیر کرتے ہیں کہ یہ زکوٰۃ

نہ دینے کی سزا ہے اور میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ سزا کے اس تصور کو ہماری عقل آسانی کے ساتھ قبول نہیں کرتی، اگرچہ ہم زبان سے اس کو کہتے ہیں، مگر عقل اس کو آسانی سے تسلیم نہیں کرتی، اگر قانون مجازات کی ولی الہی تشریح کو سامنے رکھیں کہ مجازات کا کیا مزاج ہے؟ اور سزا کہتے ہیں کس کو؟ میں دوسرے الفاظ میں کہتا ہوں کہ یہ زکوٰۃ کے اجتماعی طریقہ کے نہ قائم کرنے کا فطری نتیجہ ہے، اور اس کا واحد حل زکوٰۃ کے اجتماعی نظام کا قیام ہے، نہ کہ مشرق و مغرب کی اسکیموں کو اپنانے میں، زکوٰۃ کے اجتماعی نظام کے قیام پر حیرت ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ حیرت نا تجربہ کاری کی وجہ سے ہو، میں پہلی بار فقہی سمینار میں آیا ہوں، کیوں اب تک کوئی کوشش نہیں کی گئی، بلاشبہ ہم ہندوستان میں ان حالات میں جن میں ہمارے پاس طاقت نہیں، لیکن اس کمپرسی کے دور میں جتنا بھی ہم کام کر رہے ہیں، ہم جب طے کرتے ہیں کہ ”امارت شرعیہ“ کا قیام ضروری ہے تو اسے کر ڈالتے ہیں، جب ہم طے کرتے ہیں کہ قضاء کا قیام ضروری ہے تو اسے کر ڈالتے ہیں، جس دن ہم اور آپ طے کر لیں گے کہ زکوٰۃ کا اجتماعی نظام ضروری ہے اور ہم یہ بات امت کے ہر طبقہ کے لوگوں کو سمجھانا شروع کر دیں گے تو پھر یہ بات آسان ہو جائے گی۔

جو قوم نفسیاتی طور پر شکست خوردہ ہوتی ہے وہ اپنے افراد میں اس بات کی ہمت نہیں پاتی کہ جو نظام چل رہا ہے اس کے خلاف قدم اٹھائے، بلکہ اس کے ساتھ اڈ جسٹ کرنے کی ترکیبیں سوچتی ہے۔

یہ دراصل فقہ اسلامی کے ابدی اور عالمگیر ہونے کی نمایاں دلیل ہے، اس لئے یہ انشورنس موجودہ حالات کا واحد علاج نہیں ہے، جیسا کہ بعض حضرات نے اشارہ بھی کیا، خاص طور پر ڈاکٹر انس زرقاء نے اپنی تقریر کے دوران بار بار کہا تھا کہ اس وقت تک جب تک کہ اسلامی نظام کو قائم نہ کرالیں، اس عبوری دور میں کراہت کے ساتھ بادل ناخواستہ انفرادی طور پر اس نظام پر عمل کیا جاسکتا ہے، اس سے فقہ کے کسی طالب علم کو شاید ہی اختلاف ہوگا، لیکن یہ تصور علماء کے کسی مجمع کی طرف سے قوم کو ہرگز نہ ملے، بالواسطہ یا بلاواسطہ غیر شعوری طور پر یا شعوری طور پر کہ یہی نظام ہے جس سے ہمارے مسائل کا حل نکل سکتا ہے، اس کے بہت دور رس

نقصانات ہیں، اور جو لوگ ملت کی از سر نو تعمیر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ان کے حوصلے پست ہوتے ہیں اور ان کو بہت جواب دینے پڑتے ہیں۔

زکوٰۃ کے بارے غور کرنے کی بات ہے، میں اپنا ایک چھوٹا سا تجربہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں، آپ حضرات تو ملک کے ذمہ دار ہیں، میرے تجربے کی آپ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں، شہر کے ایک چھوٹے سے محلے میں نے ایک نظام قائم کیا، نظام کے قیام کو سال بھر ہوئے، میں سچ عرض کرتا ہوں، اتنی زبردست کامیابی اس نظام میں ملی ہے کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، لکھنؤ شہر کے ایک محدود علاقے میں، میں نے اور میرے دو تین ساتھیوں نے یہ کوشش کی، زکوٰۃ کی ذمہ داری قبول کرنا بڑا نازک کام ہے تو زکوٰۃ کو ہم نے شروع میں ٹچ نہیں کیا، لیکن گزشتہ سال اکتوبر ہی میں حالات کے پیش نظر دل میں یہ جذبہ ابھرا اور اسی وقت لکھنؤ شہر میں محلہ محلہ اور مسجد مسجد جا کر یہ کام شروع کیا، ہر مسجد کے چاروں طرف کی آبادی کی مردم شماری کرائی، اس کار جسٹر مسجد میں باقاعدہ رکھوایا اور اس میں جو بھی بچہ پیدا ہو اس کی پیدائش جس طرح سرکاری رجسٹر میں اندراج ہوتی ہے، اسی طرح اس رجسٹر میں اس کا اندراج ہو، اس کا اہتمام شروع کرایا، اور اسی طرح کیفیت کے خانے میں تمام رہنے والے اور رہنے والیوں کی معاشی حالت کے بارے میں بھی رازدارانہ طور پر معلومات درج کرائی کہ یہ شخص معذور ہے، بیوہ ہے، مطلقہ ہے، یہ عورت نامینا ہے، یا اپاہج ہے، یا کیا ہے، اور پھر اس بات کی درخواست کی کہ ہر مسلمان اپنی آمدنی میں سے روزانہ چاہے پچاس پیسے چاہے ایک روپیہ، چاہے پچیس پیسے جمع کرے اور اپنے گھر میں ایک ڈبہ ”فی سبیل اللہ“ کے نام سے بنا لے اور اس میں یہ رقم رکھی جائے، وہ مہینے میں ایک جگہ جمع ہو، پوری بات تفصیل سے میں عرض نہیں کر سکتا وقت کی کمی کے باعث اتنا عرض کرتا ہوں کہ جو حادثات کے شکار ہوئے، جو مفلوج ہوئے، جو بیمار ہوئے، جو لوگ جیل میں گرفتار ہوئے ان کے مقدمات کی پیروی سے لے کر بچوں کے علاج تک ان کی تمام ضروریات اس ماہانہ نظام سے پوری ہو رہی ہیں، الحمد للہ۔

اگر ہم طے کر لیں اور اس بات کا عزم کر لیں تو اب بھی اس ملت میں بہت خیر باقی ہے اور بہت جذبات باقی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کے مسئلہ کو اس سے غیر متعلق نہ سمجھا جائے اور یہی درحقیقت ہمارے مسئلہ کا حل ہے، میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب تک یہ نظام قائم نہ ہو جائے لوگ انفرادی طور پر بھی انشورنس کا استعمال نہ کریں، لیکن میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ مسئلہ کا حل یہ ہے، وہ نہیں، علامہ ابن حزم اندلسی نے تو اپنی کتاب ”المحلی“ میں یہاں تک فتویٰ دے دیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی علاقے میں مرجائے بھوک کی شدت کی وجہ سے، فاقہ کی وجہ سے تو قانونی طور پر پورے شہر والے کو قاتل تصور کیا جائے گا اور پورے شہر والے پر دیت لگائی جائے گی۔

”اذا مات رجل جو عا فی بلد اعتبر اہله قتلة ثم اخذ منهم دية القتل“

(المحلی لابن حزم ۱۰/۵۲۲)۔

یہ ہو سکتا ہے کہ ہم لوگوں کو اس میں شدت معلوم ہوتی ہو، لیکن اسلام کا جو انشورنس کا نظام تھا، اور امداد باہمی کا جو تصور تھا وہ ہم آپ اپنی تقریروں میں بیان کر دیں، اپنی کتابوں اور مقالات میں لکھ دیں، لیکن اس کو نافذ کرنے کی ہمت نہیں پاتے، جب تک وہ چیزیں کتابوں سے نکل کر ہماری معاشرتی اور سماجی زندگی میں نافذ نہیں ہوں گی جب تک اس کی طاقت اور قوت ہمارے سامنے نہیں آئے گی، اس وقت تک ملک کے یہودی ظالمانہ اور مجھے کہنے کی اجازت دیں اور دجالانہ نظام کی مرعوبیت ہمارے دلوں سے نہیں نکلے گی، بچوں کے حقوق کس طرح اسلام میں محفوظ ہیں، محض یاد دہانی کے طور پر آپ حضرات سے عرض کر رہا ہوں، سیدنا عمر بن الخطابؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں کیا حکم جاری کیا؟ جو بچہ پیدا ہو اس کے لئے سودرہم وظیفہ فوراً مقرر کر دیا جائے، میں یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام میں بچوں کی پیدائش سے لے کر موت تک جتنے بھی ناگہانی حالات ہیں ان سب میں اسلام کا اپنا ذاتی نظام موجود ہے، اور یہ کوئی نئی چیز آپ کی معلومات میں اضافہ نہیں کر رہا ہوں، میں یہ چاہتا ہوں کہ یہاں سے جو بھی تجویز منظور ہو اس

میں اس بات پر زیادہ زور دیا جائے اور ہم اپنے اپنے علاقوں میں اس کے عملی نفاذ اور تشکیل کی کوشش کریں۔

ہاں جواز کی شکل ایسے لب و لہجہ میں بیان کی جائے کہ اس کی ثانوی حیثیت سامنے آجائے، ایک بات اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں، صرف ایک مثال وضاحت کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں، جو بحث کے لئے مفید ہو سکتی ہے کہ ”الغارمین“ کی تفسیر میں امام بغوی نے امام مجاہد کی تفسیر سے نقل کیا ہے۔

کسی کے گھر میں آگ لگ گئی، اس کا گھر جل گیا اور وہ بے چارہ مفلوک الحال اور پریشان ہو گیا، اب اس کو زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے اور وہ ”غارمین“ میں سے ہوگا، یعنی انشورنس موجود ہے، زکوٰۃ کے مصارف میں پورا اور مکمل نظام انشورنس ہے، کسی کے مکان کا گر جانا، گھر جل جانا، یہی تو ہے انشورنس کا مقصد اور یہ اسلام کے نظام زکوٰۃ میں موجود ہے، یہاں تک کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ میں گورنروں کو لکھا کہ:

”اقضوا عن الغارمین“ (جو غارمین ہیں ان کی طرف سے تم قرض ادا کر دو)۔



## تجاویز:

### تجویر مجلس استقبالیہ

”مجلس استقبالیہ چوتھا سیمینار“ اور ”دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد“ اس سیمینار کے انعقاد کے لئے اسلامک فقہ اکیڈمی، اس کے بالغ نظر سکریٹری جنرل حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، اور انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل اسٹڈیز اور اس کے علم دوست اور علم پرورد ذمہ دار جناب ڈاکٹر محمد منظور عالم صاحب اور اکیڈمی اور انسٹی ٹیوٹ کے دوسرے ذمہ داران و کارکنان کے تہ دل سے سپاس گزار ہیں کہ ان اداروں اور شخصیتوں نے نہ صرف یہ کہ ہمیں میزبانی کا شرف بخشا ہے، بلکہ اس کے لئے ہر طرح کا گراں قدر تعاون بھی فرمایا ہم اپنے معزز مہمانان کرام کے بھی ممنون ہیں کہ آپ حضرات نے صرف طویل سفر کی زحمت ہی نہیں فرمائی، بلکہ آپ کی خدمت و راحت میں ہونے والی کوتاہیوں اور موسم کی نامساعدت کی وجہ سے ہونے والی کلفتوں کو بھی گوارا فرمایا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اکیڈمی کی خدمات کے دائرہ کو وسیع تر فرمائے اور اس کو صواب و سداد پر قائم رکھے اور اس کے فیصلے اور تجاویز عند اللہ اور عند الناس مقبول ہوں۔

پیش کردہ: مولانا محمد رضوان قاسمی

## تجویر شکر یہ

اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ سیمینار جو دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کے پرفضا احاطہ میں منعقد ہوا، دارالعلوم سبیل السلام کی مجلس انتظامیہ، اس کے ناظم اعلیٰ جناب مولانا رضوان القاسمی، دیگر اساتذہ کرام، عزیز طلبہ اور مسلمانان حیدرآباد کی پر خلوص خدمت و ضیافت پر گہرے تاثر اور قلبی تشکر و امتنان کا اظہار اپنا شرعی و اخلاقی فریضہ سمجھتا ہے اور اعتراف کرتا ہے کہ ان سب حضرات کی پر خلوص میزبانی اور صاف ستھرے انتظامات سے شرکاء سیمینار کو بہت راحت ملی، جس کی وجہ سے کاموں کی انجام دہی میں بھی بہت سہولت ہوئی، یہ اجلاس دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ادارے کو ظاہری و باطنی ہر اعتبار سے ترقی عطا فرمائے اور پراگندہ حال امت کو یہاں سے برابر وارثین انبیاء ملتے رہیں، آمین۔



## فہرست شرکاء سمینار

- ۱- مفتی محمد تقی عثمانی، دارالعلوم کراچی، پاکستان
- ۲- ڈاکٹر انس زرقاء، جدہ
- ۳- ڈاکٹر علی جمعہ محمد، قاہرہ
- ۴- ڈاکٹر عبدالرحمن العقیل
- ۵- مفتی عبدالرحمن صاحب، بنگلہ دیش
- ۶- مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، امارت شرعیہ، پٹنہ
- ۷- مولانا سید نظام الدین، امارت شرعیہ، پٹنہ
- ۸- مفتی سعید احمد پالنپوری، دارالعلوم دیوبند
- ۹- مفتی محمد ظفر الدین مفتاحی، دارالعلوم دیوبند
- ۱۰- مفتی حبیب الرحمن خیر آبادی، دارالعلوم دیوبند
- ۱۱- مفتی سخی قاسمی، حیدرآباد
- ۱۲- مولانا مجیب اللہ ندوی، اعظم گڑھ
- ۱۳- جناب شمس پیرزادہ، ممبئی
- ۱۴- مفتی عزیز الرحمن، بجنوری، بجنور
- ۱۵- مفتی عبدالقدوس رومی، آگرہ
- ۱۶- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، حیدرآباد
- ۱۷- مولانا منظور احمد، کانپور
- ۱۸- مولانا محمد نوح القاسمی، کیرالہ
- ۱۹- مولانا حمید الدین عاقل حسامی، حیدرآباد
- ۲۰- مفتی جنید عالم قاسمی، امارت شرعیہ، پٹنہ
- ۲۱- مفتی نسیم احمد قاسمی، امارت شرعیہ، پٹنہ
- ۲۲- جناب ڈاکٹر عبدالحمید، ممبئی
- ۲۳- جناب سید امین الحسن رضوی، دہلی
- ۲۴- مولانا امین عثمانی، نئی دہلی
- ۲۵- ڈاکٹر محمد منظور عالم، نئی دہلی
- ۲۶- عبد الوہاب محمد دلوی، ممبئی
- ۲۷- محمد حسین کھٹکھٹے، ممبئی
- ۲۸- مولانا سراج احمد قمر، بارہ بنگلی، یوپی
- ۲۹- مولانا نذیر احمد قاسمی، حیدرآباد
- ۳۰- مولانا محمد مصطفیٰ مفتاحی، حیدرآباد
- ۳۱- مولانا زبیر احمد قاسمی، کنہواں سیتا مڑھی
- ۳۲- حافظ غلام محمد قاسمی، میدک، اے پی
- ۳۳- قاضی محمد سمیع الدین قاسمی، میدک، اے پی
- ۳۴- ابوعمار رفیق احمد، میدک، اے پی
- ۳۵- مولانا محمد ایوب ندوی، بھٹکل
- ۳۶- مولانا عبدالعزیز ایم قاضی، ممبئی
- ۳۷- مولوی عبدالعلیم محمود القاسمی، ممبئی
- ۳۸- مولانا محمد عزیز القاسمی، راوڑکیلا، اڑیسہ
- ۳۹- مولانا محمد ارشد قاسمی، میرٹھ
- ۴۰- مولانا غلیل الرحمن سجاد ندوی، لکھنؤ
- ۴۱- مولانا محمد القدوس خنیب رومی، سہارنپور، یوپی
- ۴۲- مولانا محمد شعیب
- ۴۳- مولانا مجد القدوس خنیب رومی، سہارنپور، یوپی
- ۴۴- مولانا مسرور احمد، دہلی
- ۴۵- مولانا محمد صدیق، ہریانہ

- ۳۶- مولانا شبیر احمد قاسمی، بنارس  
 ۳۸- مولانا سید تاج الدین، میسور  
 ۵۰- مولانا وکیل احمد قاسمی، کانپور  
 ۵۲- مولانا نظام الدین رضوی، مبارکپور  
 ۵۴- مولانا رفیق المنان قاسمی، منو  
 ۵۶- مولانا محمد صدرا حسن ندوی، اورنگ آباد  
 ۵۸- مولانا شفاق احمد اعظمی، اعظم گڑھ  
 ۶۰- ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی، میسور  
 ۶۲- مولانا محمود ولی اللہ رشادی، تہل ناڈو  
 ۶۴- مولانا محمد جعفر علی، اکل کوا، مہاراشٹر  
 ۶۶- مولانا شفیق احمد مظاہری، آسنسول  
 ۶۸- مولانا خلیل الرحمن اعظمی، عمر آباد  
 ۷۰- مولانا کا کا سعید احمد عمری، عمر آباد  
 ۷۲- مولانا اختر حسین، منو، یوپی  
 ۷۴- محمد جمیل اختر قاسمی، سمدیگا، بہار  
 ۷۶- مولانا محمد رحمت اللہ ندوی، لکھنؤ  
 ۷۸- مولانا محمد افضل حسین، بستی  
 ۸۰- مفتی احمد خان پوری، گجرات  
 ۸۲- مولانا ابوالحسن علی، ماٹلی والا، گجرات  
 ۸۴- مولانا شبیر احمد قاسمی، مراد آباد  
 ۸۶- مولانا شفیق احمد بستی، لکھنؤ  
 ۸۸- جناب علی حفیظ صاحب، سالار، بنگلور  
 ۹۰- مولانا اسماعیل صاحب، کنتھاریہ، گجرات  
 ۹۲- مولوی غیاث الدین رشادی، گلبرگہ  
 ۹۴- مولانا سید بلال قاسمی، حیدرآباد  
 ۹۶- وی ایم موسیٰ مولوی، کیرالہ  
 ۹۸- خلیفہ بن ہلال ریحانی، حیدرآباد  
 ۴۷- مولانا مبارک حسین قاسمی، نیپال  
 ۴۹- مولانا رحمت اللہ قاسمی، برہانپور، ایم پی  
 ۵۱- مولانا محمد نسیم، میسور  
 ۵۳- مولانا نازبانی، بنگلور  
 ۵۵- مولانا مصلح کاشن گنج، بہار  
 ۵۷- مفتی محمد عبدالرحیم، بھوپال  
 ۵۹- مولانا شمس الدین رشادی، بنگلور  
 ۶۱- مولانا عثمان محی الدین، ویلور  
 ۶۳- مولانا ریاض الرحمن، بنگلور  
 ۶۵- مفتی عزیز الرحمن فقیہ پوری، ممبئی  
 ۶۷- مولانا خالد حسین صدیقی، پٹنہ  
 ۶۹- مولانا عبداللہ جوم، عمر آباد  
 ۷۱- مولانا نسیم اختر، منو، یوپی  
 ۷۳- مفتی انور علی اعظمی، منو، یوپی  
 ۷۵- مولانا ذاکر احمد رشادی، نیلور  
 ۷۷- مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مالیر کوٹلہ  
 ۷۹- قاضی عبدالجلیل قاسمی، امارت شرعیہ، پٹنہ  
 ۸۱- مولانا احمد بن یعقوب، ماٹلی والا، گجرات  
 ۸۳- مولانا محمد ابوالحفیظ، کنک، اڑیسہ  
 ۸۵- مولانا محمد عبداللہ طارق، نئی دہلی  
 ۸۷- مولانا محمد عبید اللہ اسعدی، باندہ، یوپی  
 ۸۹- جناب ابوالہدی محمد بشیر الدین  
 ۹۱- جناب عیسیٰ بن حاجی  
 ۹۳- مولوی سید فضل اللہ باقوی، گلبرگہ  
 ۹۵- مفتی عمار احمد، الہ آباد  
 ۹۷- مولانا بشیر احمد ندوی، میسور  
 ۹۹- مولانا نور الحق رحمانی، امارت شرعیہ، پٹنہ

- ۱۰۰- مولانا سہراب علی قاسمی، آندھرا پردیش  
 ۱۰۲- مولانا سید مصطفیٰ رفاعی ندوی، بنگلور  
 ۱۰۴- مولوی محمد حسین، غازی آباد  
 ۱۰۶- ایم، اے سعید، آندھرا پردیش  
 ۱۰۸- مولانا حنیف ملی، مالینگاؤں  
 ۱۱۰- مولانا عطاء الرحمن قاسمی، آسام  
 ۱۱۲- مولانا نعمان الدین ندوی، حیدرآباد  
 ۱۱۴- مفتی جمیل احمد ندیری، مبارکپور  
 ۱۱۶- جناب عبدالرحیم قریشی، حیدرآباد  
 ۱۱۸- ڈاکٹر پرویسر مقیم الدین، علی گڑھ  
 ۱۲۰- مولانا سعود عالم قاسمی، علی گڑھ  
 ۱۰۱- مولانا ہارون رشید قاسمی، وارنگل  
 ۱۰۳- حافظ عبدالغفار، آندھرا پردیش  
 ۱۰۵- مولانا محمد حسین علی مظاہری، عادل آباد  
 ۱۰۷- ایم، اے رشید  
 ۱۰۹- مولانا عبدالاحد ازہری، مالینگاؤں  
 ۱۱۱- مولانا عبدالواحد مظاہری، مغربی بنگال  
 ۱۱۳- مولانا سید اکبر الدین قاسمی  
 ۱۱۵- مولانا رضوان قاسمی، حیدرآباد  
 ۱۱۷- جناب عبدالجتان چاندنہ، دہلی  
 ۱۱۹- ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، علی گڑھ  
 ۱۲۱- ڈاکٹر ابن فرید، رامپور، یوپی